چناروں کے آنسو

طارق اسماعیل

عنوانات

پیش لفظ	9
ہیتھرو ایئرپورٹ	15
یادِ ماضی	33
موت کا شکنجہ	49
چانکیہ کے چیلے	61
نیلما	71
نئی مسافتیں	85
میدان کارزار	99
ایک ہی منزل کے راہی	117
پیلی کوٹھی	133
زخم خوردہ سانپ	151
بندہ بہادر فورس	163
اماں ملی تو کہاں ملی	185
شاہین اور کرگس	209
ایک اور جھٹکا	225
رومن اکھاڑہ	235
ایک ضرب کاری	251
حصار ٹوٹتا ہے	273
شب زنداں کے اسیر	285

پیش لفظ

میری بیشتر کتابوں کی طرح اس کتاب کا موضوع بھی بھارت کی مخصوص براہمنی ذہنیت ہے جس کی رعونت اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ وہ ۲۰ ویں صدی میں بھی دنیا میں بسنے والے اربوں انسانوں کو اپنے ہم پلہ اور ہم منصب سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔

۲۰ ویں صدی کا ترقی یافتہ براہمن ایک طرف تو آسمان پر کمند پھینک رہا ہے اور دوسری طرف اپنی ناک کے نیچے رینگنے والے کروڑوں انسانوں کے اس سیلاب کو خاطر ہی میں نہیں لاتا جو مساوات اور برابری کے حقوق مانگ رہے ہیں۔

اس کے نزدیک یہ لوگ جنہیں گاندھی نے مخصوص ہندوانہ سیاست کے تحت "ہریجن" کہہ دیا تھا' آج بھی ترقی یافتہ شودر اور ملیچھ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

برصغیر کی آزادی کے ۴۲ سال بعد بھی بھارت کے کروڑوں باشندے جن میں چھوٹی ذاتوں کے ہندو' عیسائی اور ۲۰ کروڑ مسلمان شامل ہیں۔ آئینی لحاظ سے تو ممکن ہے انسانوں کے زمرے میں شامل رہے ہوں لیکن معاشرتی لحاظ سے دوسرے درجے کے شہری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مقام حیرت ہے کہ یورپی مہذب اقوام اور بزعم خویش انسانی حقوق کے علمبردار دانشوروں کو سمندروں میں پھینکے جانے والے کوڑا کرکٹ سے مرنے والی مچھلیوں کی فکر تو کھائے جاتی ہے اور سمندری اور زمینی جانوروں کی بقائے نسل کے لئے وہ جان پر کھیل جاتے ہیں۔

لیکن۔۔۔۔!

جنوب مغربی ایشیا کے وہ مگرمچھ انہیں دکھائی نہیں دیتے جنہوں نے ہر مچھلی پر عرصہ حیات تنگ کرنا اور پھر اسے ہڑپ کر جانا ہی اپنا مشن بنا لیا ہے۔

بھارتی سرحدوں سے لگنے والا کون سا ایسا چھوٹا ملک ہے جس نے اس کی جارحیت کا مزہ نہیں چکھا؟ نیپال' سری لنکا' بنگلہ دیش' بھوٹان' سکم' مالدیپ' پاکستان سب نے ہی "وشال بھارت" اور "اشوکا" کی مملکت قائم کرنے کے خواب دیکھنے والے ان انسان نما بھیڑیوں کا اصلی روپ دیکھا ہے۔

چین اپنی طاقت کے بل بوتے پر ابھی تک بھارت کے شر سے محفوظ ہے کیونکہ:

۱۹۶۲ء میں بھارت نے چین سے ایک جنگ لڑ کر دیکھ لی ہے اور جان لیا ہے کہ وہاں سے اینٹ کا جواب پتھر سے موصول ہوتا ہے۔

یہ بات بھی مدنظر رہے کہ چین نے سکم میں بھارتی جارحیت اور اپنے علاقے پر اس کے غاصبانہ قبضے کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔

یہ طرز عمل بھارت کا صرف غیروں کے لئے ہی نہیں' اپنوں کے لئے بھی ہے۔ بھارت کی کون سی ایسی اقلیت ہے جس میں ہندو دھرم کے پیروکار چھوٹی ذات کے ہندو بھی شامل ہیں کہ جو "براہمن واد" کا شکار نہ رہی ہو۔

۱۹۹۰ء میں دنیا کی اس سب سے بڑی نام نہاد سیکولر جمہوری حکومت میں روزانہ درجنوں واقعات ایسے ہوتے ہیں جہاں بڑی ذات کا ہندو چھوٹی ذات کے ہندو سے بہیمانہ سلوک کرتا ہے۔

غریب ہریجنوں کو اپنے مندروں میں گھسنے کی اجازت نہیں دیتے۔ انہیں شادی کی رسوم ادا کرنے کی آزادی نہیں۔

بھارتی حکومت نے جب بھی "شیڈول کاسٹ" کے لئے نوکریوں میں مخصوص کوٹہ رکھنے کی حماقت کی' اسے براہمنوں کی طرف سے ہر سطح پر زبردست مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

پنڈت نہرو کہا کرتا تھا میں چیخ چیخ کر دنیا کو بتاؤں گا کہ میں کمیونسٹ ہوں تو بھی کوئی میری بات نہیں مانے گا کیونکہ میرا جنم پنڈت گھرانے میں ہوا ہے۔

اس سچائی کا ادراک بہت سی کانگریسی لیڈروں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کیا ہے۔

ایسی درجنوں مثالیں موجود ہیں کہ جہاں انسان دوست ہندوؤں نے نسلی عصبیت

کے سامنے بالاخر شکست تسلیم کر لی اور وہ سیاست کو ہی خیرباد کہہ گئے۔

آج بھارت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آزادی کی تحریکیں شروع ہو چکی ہیں۔

ان میں جھاڑ کھنڈ' آسام' بہار' ناگالینڈ' میزورام' گورکھا لینڈ' خالصتان اور تحریک آزادی کشمیر شامل ہے۔

وہ پنڈت زادی جس نے بنگلہ دیش کے قیام پر بڑے زعم اور طمطراق سے دو قومی نظریئے کو بحیرہ ہند میں ڈبونے کی بڑ ہانکی تھی۔ اسی "دو قومی نظریئے" کا شکار ہوئی۔

بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں بعد از خرابی بسیار کوئی من گھڑت ثبوت بھی تیار نہیں کر سکیں جس سے ثابت کیا جا سکتا کہ اندرا گاندھی کو کسی بین الاقوامی سازش کے تحت مروایا گیا ہے یا اس کی موت میں پاکستان' امریکہ یا دنیا کے کسی اور ملک یا اس ملک کی انٹیلی جنس کا ہاتھ ہے----!

بھارتی وزیراعظم کو سکھ دھرم کے دو معمولی سے پیروکاروں نے جو اپنے دھرم میں کچھ پختہ نہیں تھے۔ محض اس لئے مار ڈالا کہ اس کے حکم پر سکھوں کے مقدس ترین مقام ہرمندر صاحب کی توہین کی گئی اور یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔

۶ جون ۸۴ء کو جب بھارتی فوج نے آپریشن بلیوسٹار کی آڑ میں دربار صاحب پر دھاوا بولا اور ان کے مذہب کی دھجیاں بکھیریں تو سکھوں کو احساس ہوا کہ وہ الگ قوم ہیں۔ ان کا اپنا قومی تشخص ہے اور آج تک وہ دھوکے میں رہ کر ذلیل و خوار ہوتے رہے۔ انہیں کانگریسی لیڈرشپ نے وقتاً فوقتاً اپنے گھناؤنے مقاصد کی بھینٹ چڑھایا۔

جب ۷ جون ۸۴ء کو سکھ قیادت نے اعلان کیا کہ وہ نومبر ۸۴ء سے پہلے پہلے اندرا گاندھی کو مار ڈالیں گے تو بھارتی وزیراعظم نے غیر ملکی پریس کے سامنے اسے "دیوانے کی بڑ" بتایا اور اپنے دونوں باڈی گارڈ ستونت سنگھ اور بے انت سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ بھی سکھ ہیں۔ بھلا یہ مجھے مار سکتے ہیں!"

اس دعویٰ کی دھجیاں جب بکھریں اور مسز اندرا گاندھی کو انہی دو سکھوں نے مار ڈالا تو بھی ان کے سپوت کو عقل نہیں آئی اور وہ سکھوں کو ہندو دھرم کا حصہ ہی بناتے

اور بتاتے رہے۔ انجام سب کے سامنے ہے۔

۴۷ء میں سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کا حساب اندرا گاندھی کے قتل کے بعد صرف دو دنوں میں ہندوؤں نے وصول کر لیا---- اسے کہتے ہیں مکافات عمل----!

جس بے رحمی' سنگدلی اور بہیمانہ طریقے سے ہندوؤں نے سکھوں کے خون سے ہولی کھیلی' آج کی مہذب دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

نتیجہ ظاہر ہے۔ آج مذہب (دو قومی نظریئے) کی بنیاد پر ہی سکھوں نے بھارتی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے ہیں اور بلاشبہ وہ زندگی اور موت کا دلیرانہ معرکہ لڑ رہے ہیں۔

دوسری طرف مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے۔ و. شیخ عبداللہ جس نے کشمیریوں کی غیرت کا سودا ہندو سے کیا تھا' آج اس کی قبر بھی محفوظ نہیں رہی۔ جعلی شیر کشمیر کی اولاد پر لرزہ طاری ہے کہ کسی بھی لمحے کسی بھی سمت سے حریت پسند موت کے فرشتے بن کر ان کی جان لے لیں گے۔

۴۰ سال تک کشمیری مسلمان سیکولرازم اور جمہوریت کے نام پر بیوقوف بنتے رہے اور بالآخر انہوں نے بھی بزور شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کی ٹھانی اور تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر میدان عمل میں اترے ہیں۔

کشمیر کا ذرہ ذرہ آج شہیدوں کے خون سے لالہ زار ہے۔ آج سری نگر کی فضائیں شہید بچوں کی ماؤں کے گیتوں سے معمور ہیں۔ ہر طرف ایک ہی پکار ہے۔ ایک ہی للکار ہے۔

ہم سب مانگیں آزادی' آزادی' آزادی----!!!

کشمیری حریت پسندوں نے سروں پر کفن باندھ کر آزادی یا موت کا نعرہ لگاتے ہوئے جنوب مغربی ایشیاء کے سامراج کو للکارا ہے۔

ان کی جرأتوں کو سلام!

ساری دنیا میں اپنی آزادی اور قومی تشخص کی جنگ لڑنے والے حریت پسندوں کی جرأتوں کو سلام کہ انسانیت کی معراج یہی ہے کہ شیر ایک دن کی زندگی جی کر ساری

زندگی زندہ رہتا ہے----!

میں جانتا ہوں منافقت کی کوکھ سے جنم لینے والا ادب مصلحت کوش ہوتا ہے اور اپنے ملک اور نظریئے کے حوالے سے سوچنے اور لکھنے والوں کو منافق معاشروں میں پذیرائی نہیں ملتی۔

لیکن----!

میرا ایمان ہے کہ اس فانی زندگی کی مدت بہت مختصر ہے اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کوئی انسان خواہ وہ دھریہ ہی کیوں نہ رہا ہو' موت سے فرار نہیں پا سکا۔ موت سے بڑا سچ کوئی نہیں اور منافقت سے بڑی لعنت کوئی نہیں۔

میں نے "چناروں کے آنسو" میں اپنی بقاء کی جنگ لڑنے والے حریت پسندوں کو اپنی حد تک نذر عقیدت گزاری ہے۔ میرا ایمان ہے دیر سے ہی سہی' وہ وقت ضرور آئے گا جب برصغیر کی تاریخ بدلے گی اور براہمن کے مکروہ عزائم کا جنازہ ایسا اٹھے گا کہ پھر کبھی کتابوں میں ہی اس کا ذکر پڑھنے کو ملا کرے گا----!

اور----! یہ کہ' میرا ایمان ہی میرا مشن بھی ہے----!!

طارق اسمٰعیل ساگر

۳ ستمبر ۹۰ء

ہیتھرو ایئرپورٹ

"معزز خواتین و حضرات! میں کیپٹن شیر گل آپ سے مخاطب ہوں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ہمیں ہیتھرو ایئرپورٹ سے کلیئر سگنل نہیں مل رہا۔ اس لئے آپ کو کچھ دیر اور انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔"

ایمسٹرڈم ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے ایئرانڈیا کی فلائیٹ نمبر ۳۰۲ کے مسافروں نے اس اعلان کو سنا اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہاں موجود شاید ہی کوئی مسافر ہو گا جس نے اس اعلان پر ناراضی کا اظہار نہ کیا' سوائے امریندر سنگھ کے جو لاؤنج کے ایک کونے میں بڑے بڑے شیشوں کے پار رن وے پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دے رہا تھا۔

ان کی پرواز کو اب سے ایک گھنٹہ پہلے ہیتھرو پر لینڈ کر لینا چاہیے تھا لیکن وہ دو گھنٹوں سے ایمسٹرڈم میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہیتھرو کے اے ٹی سی پر ہڑتال نے دنیا بھر کی پروازوں کا نظام گڑبڑ کر کے رکھ دیا تھا۔

دو گھنٹے گزرنے کے بعد امریندر سنگھ کو بھی تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ: "کہیں پرواز کے زیادہ لیٹ ہو جانے سے اس کے آگے کا پروگرام نہ متاثر ہو جائے!" پھر خود ہی یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا کہ لندن میں موجود لوگوں کی نظر یقیناً اس بات پر رہی ہو گی کہ بھارت سے آنے والی پروازوں کا شیڈول اکثر متاثر ہوتا رہتا ہے۔

مسافروں نے اب ایئرانڈیا کے مقامی سٹاف کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور ان سے الٹے سیدھے سوالات دریافت کر رہے تھے۔ بیشتر مسافروں کا اصرار تھا کہ ان کے ساتھ جھوٹ بولا جا رہا ہے اور جہاز کے انجن کی خرابی کی وجہ سے پرواز لیٹ ہے۔ مقامی سٹاف کے لئے چونکہ ایسے الزامات "معمول کی کارروائی" بن چکے تھے' اس لئے کسی کے ماتھے پر شکن نہیں آئی تھی اور انہیں یوں بھی اپنی تربیت کے مطابق اپنے ہونٹوں پر جبراً" مسکراہٹ چپکانا ہوتی تھی۔

لاؤنج کیا تھا؟ شیشے کا ایک کیبن! جسے چاروں اطراف سے بند رکھا گیا تھا۔ اب تو وہ لوگ کسی مسافر کو جہاز کے اندر جانے یا واپس جانے کی اجازت بھی نہیں دے رہے تھے۔ ایئرپورٹ کی ایک ٹک شاپ اس کیبن نما لاؤنج کے نزدیک موجود تھی لیکن مسافر اس کی طرف صرف حسرت سے دیکھ سکتے تھے---- سیکورٹی انتظامات کے تحت ان کے اور کیبن کے درمیان شیشے کی مضبوط دیوار حائل تھی۔ کئی مسافر شیشے کی دیوار کے ساتھ منسلک ایلومینیم کے چوکور اور لمبے سے ڈبے پر بیٹھ گئے تھے جس سے اندر کا ماحول گرم رکھنے کے لئے حرارت خارج ہو رہی تھی۔

مسافروں کا اصرار اب بڑھنے لگا تھا کہ انہیں جس طرح بھی ممکن ہو کنٹین تک جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ بچوں نے بھوک پیاس اور بڑوں نے گھٹن کے ہاتھوں خاصی بے چینی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ ایئرانڈیا کا مقامی سٹیشن منیجر بار بار ایئرپورٹ اتھارٹی سے درخواست کر رہا تھا کہ اس کے مسافروں کو شیشے کے اس مقبرے سے نجات دلائی جائے لیکن دوسری طرف سے ہر دفعہ "سیکورٹی" کا بہانہ کر کے اسے مہذب طریقے سے ٹرخا دیا جاتا۔ بعد از خرابی بسیار وہ بالآخر اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ ایئرپورٹ اتھارٹی کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ آخر تین گھنٹے تک یہ لوگ کیسے یہاں جم کر بیٹھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہیتھرو کی طرف سے لائن کلیئر ملنے کے امکانات معدوم تھے کیونکہ ایئر ٹریفک کے بے پناہ رش کو "ہنگامی عملے" کے ذریعے کنٹرول کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

توجہ فرمایئے خواتین و حضرات!

"مقامی اتھارٹی کی طرف سے ہمیں لاؤنج میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں فلائیٹ نمبر ۳۰۲ کے مسافروں سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لاؤنج سے باہر نہ گزاریں۔ ہمیں امید ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم پرواز کے قابل ہو جائیں گے۔ شکریہ!"

اس اعلان نے مسافروں کے چہروں پر موجودہ گھٹن کو خاصا کم کر دیا تھا اور وہ قدرے آرام محسوس کرنے لگے تھے۔ شیشے کے بند دروازے کھل گئے اور ایئر انڈیا کی فلائیٹ نمبر ۳۰۲ کے مسافر پنجرے سے اچانک رہا ہونے والے قیدیوں کی طرح دھکم پیل کرتے ان دو دروازوں کے گرد جمع ہو رہے تھے جہاں سے گزر کر انہیں لاؤنج کے باقی حصے میں جانا تھا۔

دروازوں کے ساتھ نصب ایکسرے مشینوں پر سیکورٹی کا عملہ ان سے بار بار قطار میں

کھڑے ہونے کی درخواست کر رہا تھا لیکن کسی کے کان پر جوں رینگتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

امریندر سنگھ شاید لاؤنج کے اس حصے سے نکلنے والا آخری مسافر تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے چلتا اس واحد میز کی طرف جا رہا تھا جس کے نزدیک دو خالی کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں ورنہ کنٹین کے اردگرد موجود تمام نشستوں پر تو مسافر قبضہ جما چکے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے چند ثانیے کچھ سوچا پھر ذہن میں ایک فیصلہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر سے اس نے صرف کوک کا ایک ٹن خریدا' جسے ہاتھ میں پکڑے وہ اپنی نشست کی طرف آ رہا تھا۔

"ہیلو----!" سامنے کی نشست سے ابھرنے والی نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"ہیلو----!" اس نے جواب دیتے ہوئے آواز کی طرف گردن گھمائی اور سناٹے میں آ گیا۔

"یہ تو پشپا تھی----!"

اس کے کالج کی ساتھی' شاید ایف-ایس-سی میں اس کے ساتھ دہلی میں پڑھتی تھی۔ امریندر کا دل ایک مرتبہ تو دھک سے رہ گیا کیونکہ وہ اپنے اصلی نام یا پاسپورٹ کے ساتھ سفر نہیں کر رہا تھا--- اس کی اصلیت کا پول کھلنے پر اس کے لئے یہاں ایسا طوفان کھڑا ہو جاتا جس کا تصور ہی بڑا بھیانک تھا۔

ہیلو کہہ کر وہ خاموشی سے اپنے ٹن کی سیل کھولنے لگا۔ خاتون اس کے اجنبی رویے پر شش و پنج میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیئر کے ٹن کی سیل کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ امریندر کی کوشش یہی تھی کہ اس کی نظروں کا سامنا نہ ہی کرنا پڑے۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں---- میں پشپا ہوں۔ پشپا کھونسلے۔" بالآخر خاتون نے کہہ ہی دیا۔

"معافی چاہتا ہوں----!" امریندر نے صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

"آپ امریک سنگھ جی نہیں ہیں کیا؟" نوجوان خاتون کی آنکھوں میں حیرت اور بے چینی کے ملے جلے تاثرات جگمگا رہے تھے۔

اس کی خوبصورت آنکھیں سارے چہرے پر پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں اور ان میں موجود جگمگاہٹ اور بے باکی کسی بھی نوجوان کے لئے خوبصورت دعوت کا حسین پیغام اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ اگر امریندر کی جگہ کوئی اور نوجوان ہوتا تو ناواقف ہونے کے باوجود اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ جبکہ یہاں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ امریندر کی

خواہش تھی کہ جلد از جلد اسے اس ساحرہ سے چھٹکارہ مل جائے۔

"میرا نام امریندر سنگھ ہے۔۔۔۔" اس نے پہلی مرتبہ پشپا کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے کہا۔

"اوہ! معافی چاہوں گی۔ دراصل آپ کی شکل میرے ایک کلاس فیلو مسٹر امریک سنگھ سے بہت ملتی ہے۔" پشپا کی مسکراہٹ سے اس کے کھسیانے پن کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"سکھوں کی شکلیں قریباً" ایک جیسی ہوتی ہیں۔" امریندر نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ بے اختیار ہنس دی۔

اس کی ہنسی نے امریندر کے اندر موجود تناؤ کو بہت کم کر دیا تھا۔

"واقعی اب تو مجھے آپ کی بات پر یقین ہونے لگا ہے۔ امریک شاید آرمی میں چلا گیا تھا۔ میری اور اس کی آخری ملاقات آج سے تین چار سال پہلے دہلی ایئرپورٹ پر ہوئی تھی۔"

"میں تو آرمی کے نام سے بدکتا ہوں۔ میرے پتا جی صوبیدار تھے آرمی میں اور یہی حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے کہ میرے جسم پر فوجی وردی دیکھ سکیں۔" امریندر نے کوک کا گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"بہرحال آپ دلچسپ آدمی ہیں! بائی دی وے آپ کیا لندن میں رہتے ہیں؟"

"میں بزنس کرتا ہوں' ہوزری گارمنٹس! رہنے کی بات بڑی عجیب ہے۔ گھر تو میرا پنجاب میں ہے لیکن میں عموماً" گھر پر نہیں رہتا۔ بزنس ہی ایسا ہے۔" امریندر نے اب خاصا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔

"میرا نام پشپا کھونسلے ہے۔ میں لندن کی انڈین ایمبیسی میں سٹاف آفیسر ہوں۔۔۔۔" پشپا نے اپنا ہاتھ باقاعدہ آگے بڑھا دیا۔

"اوہ! تب تو آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔" امریندر نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام کر جواب دیا۔

دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے پھر امریندر اپنے کسی مقامی دوست کو فون کرنے کا بہانہ کر کے معذرت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے شک تھا کہ شاید ابھی تک پشپا نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔

دوسری طرف فلائیٹ کے تین چار گھنٹے لیٹ ہونے کے بعد اسے آگے کے معاملات کے متعلق تشویش سی ہونے لگی تھی۔

یہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا ٹیلی فون بوتھ کی طرف ہی آیا تھا۔ جہاں پر چسپاں مقامی اور انگریزی زبان میں درج ہدایات پڑھنے کے بعد اس نے آپریٹر کا نمبر ملایا اور اس سے دریافت کیا کہ یہاں سے لندن وہ "کو لیکٹ کال" کر سکتا ہے یا نہیں؟ دوسری طرف سے "نہیں" میں جواب ملنے پر اس نے اگلا سوال یہی کیا تھا کہ کم از کم کتنے پیسے سے وہ لندن کال کر سکتا ہے؟

آپریٹر نے اسے لندن کال کا کم از کم ریٹ بتا کر یہ بھی سمجھا دیا کہ انٹرنیشنل ڈائیلنگ کے لئے اسے دوسرے بوتھ پر جانا ہو گا کیونکہ اس بوتھ سے اسے بین الاقوامی لائن نہیں ملے گی۔

"شکریہ!" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔۔۔۔ لاؤنج کے آخری کونے پر اسے بالآخر انٹرنیشنل ڈائیلنگ کا بوتھ نظر آ گیا۔ اس دوران پشپا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔

مقامی کرنسی کے حصول کے لئے اس نے اپنے پاس موجود دس ڈالر کا واحد نوٹ ایک چاکلیٹ خریدنے کے عوض تڑوایا تھا اور بقیہ مقامی کرنسی میں وصول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس تین سو پاؤنڈ تھے یا پھر کچھ بھارتی کرنسی جو فی الحال اس کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔

لاؤنج ہی کے ایک کونے میں موجود کاؤنٹر سے اس نے انٹرنیشنل ڈائیلنگ کے لئے ٹیلی فون کارڈ خریدا۔ چند منٹ بعد ہی وہ لندن میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے پر اس نے صرف "امریندر" کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اگلی بات کرتا دوسری طرف سے اس سے بوتھ پر موجود ٹیلی فون نمبر دریافت کیا گیا۔ امریندر نے ٹیلی فون کے ایک کونے پر موجود نمبر بتا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے چند منٹ وہیں ٹھہر کر انتظار کرنے کا کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

اسے اب واقعی پریشانی لاحق ہو رہی تھی کہ اس کی مکمل بات کیوں نہیں سنی گئی جب کہ لندن سے فون اٹھانے والے نے فون "بگ" ہونے کے خطرے کے پیش نظر احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔

ایمسٹرڈم ایئرپورٹ کے اس انٹرنیشنل فون بوتھ کے اندر کھڑے امریندر کے لئے انتظار کے تین منٹ تین صدیوں جتنے طویل ہو گئے۔ تین منٹ بعد جب فون کی گھنٹی بجی تو نجانے کیوں اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس نے کپکپاتے ہاتھ سے فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو امریندر----" دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔

"امریندر بول رہا ہوں' فلائیٹ بہت لیٹ ہو گئی ہے۔" اس نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"حالات پر ہماری نظر ہے بچے' امن قائم رکھو۔ واہگورو بھلی کرے گا۔ کالی پگڑی سرخ پٹی کے ساتھ یاد رکھنا' گھبرانا نہیں۔ ہم سائے کی طرح تیرے ساتھ ہیں۔" دوسری طرف سے آنے والی مانوس آواز نے اس کا حوصلہ دوچند کر دیا تھا۔

سلسلہ منقطع ہونے پر جب وہ اپنی میز پر پہنچا تو پشپا وہاں موجود تھی۔ اس دوران وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ ابھی وہ اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی لیکن کوئی بات اس کے ذہن میں اٹک کر ضرور رہ گئی تھی۔

اس کی تربیت نے گو کہ ہر آدمی پر پہلی نظر میں شک کرنا ہی سکھایا تھا لیکن وہ ابھی اتنی زیادہ پروفیشنل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہر ملنے والے کو خالص پیشہ ورانہ انداز میں پرکھنا شروع کر دے۔

ooo

"توجہ فرمایئے خواتین و حضرات!

ایئرانڈیا فلائیٹ نمبر ۳۰۲ کے مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز پر تشریف لے جائیں' جہاز روانگی کے لئے تیار ہے۔"

مسافروں میں پھر بھگدڑ سی مچ گئی۔ امریندر اس مرتبہ بھی بڑے اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ پشپا اس سے الگ ہو جائے لیکن وہ تو مسلسل اس کے ساتھ چپک کر رہ گئی تھی اور امریندر کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ گفتگو میں حصہ لینا پڑا۔

"معاف کیجئے گا میں ذرا باتھ روم تک....." بالآخر اسے جان بچانے کا یہی مناسب بہانہ دکھائی دیا۔

اس سے پہلے کہ پشپا کچھ کہے' وہ خواہ مخواہ نزدیکی باتھ روم کی طرف چل دیا۔ باتھ روم کے نزدیکی پلر کے پیچھے کھڑے ہو کر وہ چوری چھپے پشپا کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ شیشے کی دیوار عبور کر گئی تو امریندر بھی مسافروں کی قطار کے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ جہاز میں داخل ہوتے ہوئے وہ "نوسموکنگ" ایریا سے گزر رہا تھا کہ راستے میں پشپا بھی اسے ایک سیٹ پر

بیٹھی نظر آ گئی۔

ایک خود ساختہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے وہ اپنی سیٹ کی طرف چل دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ پشپا اور اس کے درمیان پندرہ بیس سیٹوں کا فاصلہ موجود تھا۔

ooo

جہاز فضا میں بلند ہوا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکا کر وہ پیش آئندہ حالات کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اس نے زندگی کا جوا کھیلا تھا جس میں ہار کی صورت میں بھی وہ زندہ نہ بچتا۔

بہرحال وہ بھارتی فوج کا سابقہ کیپٹن تھا اور اس نے عملاً" بغاوت میں حصہ لیا تھا جس کی واحد سزا موت تھی۔

امریندر مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ خوف کبھی اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ اس نے اپنی فوجی زندگی میں ایسے ایسے محیرالعقول کارنامے انجام دیئے تھے کہ اس کے ساتھی دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ جاتے۔

لیکن----!

وہ اس طرح بے بسی اور کم مائیگی کی موت مرنے سے ڈرتا تھا۔ مرنا تو مقدر تھا ہی لیکن اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے کچھ کر گزرے۔

کچھ بھی----!

اس کے اندر ایک لاوا دہک رہا تھا۔ اسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کسی روز یہ آتش فشاں پھٹا تو خود اس کو بھسم کر کے رکھ دے گا۔ اس نے چھ ماہ مفرور رہ کر گزارے تھے۔ اس دوران بھی اس کی آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھنے کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بزدل دشمن اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں' بہن' باپ' بھائی اور خاندان کے باقی لوگوں کو بڑی بے باکی سے رسوا کرتا رہا۔

اس کا باپ اپنے علاقے کا مانا ہوا رئیس تھا۔ جس گاؤں کا وہ سرپنچ تھا' پولیس کبھی اس گاؤں کی حدود میں قدم نہیں رکھنے پائی تھی---- گزشتہ بیس سال میں پہلی مرتبہ پولیس کی گاڑیاں اس گاؤں میں اس کے والد کو گرفتار کرنے کے لئے ہی آئی تھیں۔

اس نے رب کا شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت گاؤں میں موجود نہیں تھا ورنہ جو درگت اس کے گھر والوں کی سی۔ آر۔ پی کے ہاتھوں بنی تھی' اس کے بعد اس کا خاموش رہنا ناممکن تھا۔

سی-آر-پی کے ہندو سپاہیوں نے اس کے باپ کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا تھا' اس کے بھائی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا' اس کی بہن اور ماں کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ وہ تو گاؤں کے لوگوں کی مدد آڑے آگئی جن کے لئے سرپنچ وسن سنگھ کے گھرانے سے ایسا سلوک ناقابل برداشت تھا اور اردگرد کے دیہاتوں کے لوگوں نے پولیس کی گاڑیوں کو گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا: کہ ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی پولیس سرپنچ یا اس کے گھرانے کے کسی فرد کو تھانے لے جا سکے گی۔

گاؤں کی عورتوں نے بین ڈال کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ آج تک جس گھر سے انہیں تحفظ ملتا آیا تھا' وہی گھر عدم تحفظ کا شاکی تھا۔

بات مقامی پولیس تک رہتی تو شاید ان کی عزت محفوظ رہتی لیکن حکومت نے سی-آر-پی منگوا کر مقامی پولیس کو بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ سینٹرل ریزرو پولیس فورس نے پنجاب کو مفتوحہ علاقہ جان کر مقامی سکھ آبادی سے وہ سلوک کرنا شروع کر دیا تھا جو ان کے آباؤ اجداد مفتوحین یا مغلوب لوگوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

امرندر کو ان باتوں کا علم دیر بعد ہوا۔ جب ایک روز اچانک اس کی ملاقات اپنے سفر کے دوران ایک ریلوے اسٹیشن پر اپنے ایک رشتہ دار سے ہو گئی تھی' جس نے امرندر کو ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگوں کو آئے دن اس سلوک کا سامنا رہتا ہے۔

جب کبھی یہ مناظر امرندر سنگھ کے چشم تصور میں آتے' اس کا خون کھولنے لگتا----!

لیکن----!

ابھی تو وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا ورنہ کبھی کا بہت کچھ کر گزرتا۔'

خیالات کا الجھا ہوا تانا بانا اس کے ذہن کو مکڑی کی طرح جکڑ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ اگر امیگریشن پر اس کی اصلیت کا پردہ چاک ہو گیا تو وہ کہاں جائے گا۔

اس سے پہلے کے واقعات اس کے علم میں تھے جب لوگوں کو واپس بھارت بھیج دیا گیا تھا اور بھارتی پولیس نے ان میں سے کسی کو زندہ کسی عقوبت خانے سے باہر نہیں آنے دیا تھا۔ پہلے ان پر انتہا درجے کا غیر انسانی تشدد کیا جاتا' اس کے بعد سسکا سسکا کر مار دیا جاتا۔

ان بھیانک خیالات کا سلسلہ آخر ایئر ہوسٹس کی آواز نے توڑا:

"معزز خواتین و حضرات! ہم جلد ہی لندن کے بین الاقوامی ہیتھرو ہوائی اڈے پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ براہ کرم اپنی سیٹ بیلٹ

باندھ لیجئے۔ کرسیوں کی پشت سیدھی کر لیجئے' امید ہے آپ کا سفر ہمارے ساتھ خوشگوار گزرا ہو گا اور آپ آئندہ بھی ایئر انڈیا کو خدمت کا موقع دیں گے۔"

ایک لمحے کے لئے اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

دل کی دھڑکن پھر تیز ہونے لگی تھی اور وہ خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کر رہا تھا۔ ذہنی تناؤ کا یہ عرصہ طویل اور جان لیوا تھا۔ جہاز نے قریباً" آدھ گھنٹہ تک ہیتھرو پر چکر لگائے تھے' جس کے بعد اسے لینڈ کرنے کے لئے خالی رن وے ملا تھا۔

امرندر سنگھ نے اپنی پگڑی کو اندازے سے دوبارہ کس کر باندھ لیا تھا۔ جہاز کی "لیوٹری" جا کر اس نے ایک مرتبہ غور سے شیشے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا اور اپنی حالت پر خود ہی مسکرایا۔

کھڑکی سے ملحقہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جہاز کے پہیوں کو کھلتے اور رن وے کے ساتھ ٹکراتے بھی دیکھ لیا تھا۔ پہیے زمین سے چھوتے ہی جہاز کے انجنوں کی دھاڑ بڑھ گئی تھی۔ امرندر سنگھ کو یہ شور اپنی رگوں میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

جلد ہی جہاز کے انجن نارمل ہوئے اور پھر وہ اپنے مخصوص پلیٹ فارم سے ملحق ہو گیا۔ جہاز سے اترنے میں بھی اس نے خاصے صبر کا مظاہرہ کیا تھا اور آخر میں باہر آنے والے مسافروں کے ساتھ ہی باہر نکلا تھا----

ریوالونگ راستے پر اپنا چھوٹا سا بیگ رکھ کر اس نے اپنے آگے اور پیچھے موجود مسافروں کا جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر اس کی دھڑکن تیز ہو گئی: اس سے بمشکل دس مسافروں کے آگے پشپا اپنا منہ اس کی طرف کئے کھڑی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں پشپا سے ٹکرائیں' ایک مسکراہٹ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر جاگ اٹھی۔ امرندر نے بڑے جبر سے جوابی مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس مرحلے پر بھارتی سفارت خانے میں کام کرنے والی پشپا کھونسلے کا اس سے ٹکراؤ اس کے لئے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ قطار میں کم از کم وہ اس کے نزدیک کھڑی نہ ہو۔ ریوالونگ کے خاتمے پر جیسے ہی اس نے اپنا قدم آگے بڑھایا' پشپا کو اپنا منتظر پایا۔

"ہیلو----!"

"ہیلو----!"

"آپ مجھ سے کہاں بھاگیں گے----؟" پشپا کے ذو معنی سے فقرے کو سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا----

"اجی کون بدقسمت بھاگنا چاہے گا آپ سے----!" اس نے خود کو نارمل رکھنے کے لئے اپنے آپ سے جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔

"کہاں جائیں گے آپ؟"

"کچھ معلوم نہیں' میں تو ہوٹل کو ہی ترجیح دیتا ہوں لیکن یہ تو میزبانوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ مجھے کہاں رکھیں گے؟" اس نے گول مول سا جواب دیا۔

"کیا میں امید رکھوں کہ ہم لندن میں دوبارہ ملیں گے!" پشپا اس کی جوانی اور دولت سے متاثر ہو رہی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی جس کا فیصلہ وہ نہ کر سکا۔

"ضرور----!"

"آپ کا کوئی رابطہ؟"

"میں نے کہا نا فی الحال کچھ علم نہیں' آپ اپنا نمبر دے دیں تو میں ضرور آپ کو کال کر لوں گا۔" اس کا ذہن مکمل بیدار تھا۔

"ضرور----!" کہتے ہوئے پشپا نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور ایک وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ" کہتے ہوئے اس نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی جس پر بھارتی سفارت خانے کا مخصوص نشان آویزاں تھا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

ooo

امیگریشن کاؤنٹر کے سامنے لگی طویل قطاروں میں سے ایک میں وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہاں پہلے سے ہی کچھ فلائٹس کے مسافر موجود تھے۔ اس مرتبہ اس نے خاص طور سے پشپا کو اپنے ساتھ کھڑے ہونے کا موقعہ نہیں دیا تھا اور اس کے ساتھ والی قطار میں اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ بظاہر دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے لیکن ان کی قطاریں الگ الگ تھیں!

یہ بات اس کے ذہن میں نہ آ سکی کہ پشپا نے جان بوجھ کر اسے یہ موقع دیا تھا۔ اس کی بدحواسیاں گو کہ ایسی نمایاں نہیں تھیں لیکن پشپا کی پیشہ ورانہ اہلیت نے اس کی چھٹی حس کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اس دوران ان کے درمیان کچھ فقروں کا تبادلہ بھی ہو چکا تھا۔ ایک بات کا اندازہ تو پشپا نے لگا ہی لیا تھا کہ امریندر نے جھوٹ بولا ہے اور اس سے پہلے اسے کوئی بین الاقوامی ایئرپورٹ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس کے رویے سے احساس نہیں ہو رہا

تھا جیسے وہ اس ماحول سے گزرا ہو۔

"کیا یہ کیپٹن امریک سنگھ ہے؟"

بھارتی فوج کا بھگوڑا---- بھارت سرکار کا باغی۔

اس نے جھوٹ بولا ہے؟

عین ممکن ہے یہ شخص کوئی اور ہی ہو اور اس نے رعب گانٹھنے کے لئے خود کو کچھ امیر آدمی ظاہر کیا ہو؟

پشپا کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ کر جلد از جلد کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ یہ بات تو وہ بھی جانتی تھی کہ ایک مرتبہ اگر یہ شخص امیگریشن کی حدود پار کر گیا تو اس پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

"کچھ بھی ہو اس کا نوٹس تو لینا ہو گا!" پشپا کھونسلے ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئی۔ اب اسے اپنی باری کا انتظار تھا۔

اسے صرف ایک ٹیلی فون اپنے سفارت خانے میں کرنا تھا اور امریندر سنگھ نامی ایئر انڈیا کے ایک مسافر کے مشتبہ ہونے کی اطلاع دینی تھی۔ اس کے بعد امریندر کا یہاں سے بچ نکلنا' اگر وہ واقعی کیپٹن امریک سنگھ تھا' ناممکن ہو جاتا۔

سکاٹ لینڈ یارڈ سے بھارتی سفارت خانے کے تعلقات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ ہر ممکن حد تک بھارتی انٹیلی جنس سے تعاون کرتے تھے۔ برطانوی ہیلی کاپٹر انڈسٹری کو دیوالیہ سے بچانے کا سہرا بھارت ہی کے سر تھا اور بھارت جیسا غریب ملک اربوں روپے کے یہ ناکارہ ہیلی کاپٹر محض اس لئے خرید رہا تھا کہ اس کے متبادل ایک سیاسی سودے بازی کا معاہدہ موجود تھا اور اب تک درجنوں سکھوں کو برطانوی حکومت برطانیہ میں داخلے سے روک کر واپس بھارت بھیج چکی تھی۔ گو کہ برطانوی قانون اس بہیمیت کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن ایک باہمی معاہدے کے تحت ایسا ہو رہا تھا۔

جو لوگ کسی طرح برطانیہ میں داخل ہو جاتے تھے' وہ البتہ مکمل قانونی تحفظ کے ساتھ موجود رہتے تھے۔

امریندر سنگھ نے اپنے سامنے لگے امیگریشن کاؤنٹر کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر نمبر۵ پر اسے ایک لمبا تڑنگا سکھ بطور ترجمان موجود دکھائی دیا' جس نے کالے رنگ کی پگڑی پہن رکھی تھی اور اس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی پٹی اس امر کی نشاندہی کے لئے کافی تھی کہ یہی "مطلوبہ شخص" تھا۔

اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ امریندر سنگھ کی باری کاؤنٹر نمبر۵ پر ہی آئے گی؟

ذہن سے اٹھنے والے اس اچانک سوال نے اسے پھر گڑبڑا کر رکھ دیا۔ جیسے جیسے وہ کاؤنٹر کے نزدیک ہو رہا تھا' اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ پھر اچانک بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں لپکا اور دوسرے ہی لمحے مس نے اپنے بیگ کا لاک اس طرح کھول دیا کہ جب وہ اچانک اسے اٹھانا چاہتا تو اس میں موجود چیزیں باہر خودبخود گر پڑیں۔

اس کے آگے موجود قطار اب ختم ہو چکی تھی اور اب اس کا نمبر پکارا جانے والا تھا۔ جیسے ہی کسی کاؤنٹر پر انٹرویو ختم ہوتا' اسی کاؤنٹر پر اس کی باری آ سکتی تھی۔

اس دوران اس نے پشپا کو امیگریشن کاؤنٹر عبور کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا ڈپلومیٹ پاسپورٹ رکھنے کی وجہ سے پشپا کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ بغیر انٹرویو کے باہر نکل جائے۔

"کاؤنٹر نمبر ایٹ پلیز!"

قطار کے سرے پر موجود مقامی عملے کی خاتون کی آواز پہلے کی طرح اس کے کانوں میں پگھل کر رہ گئی۔

اس کی باری کاؤنٹر نمبر۸ پر لگی تھی اور طے شدہ پلان کے مطابق اس نے جیسے ہی زمین سے اپنا بیگ اٹھایا' بیگ الٹ گیا۔

"اوہ! معاف کیجئے گا----" کہہ کر وہ بظاہر اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

"آپ جائیں پلیز----!" اپنے پیچھے کھڑے مسافر کو اس نے آگے بڑھا دیا۔

چیزیں سمیٹتے ہوئے اس نے کاؤنٹر نمبر۵ پر کھڑے سکھ ترجمان کو بے چینی کی حالت میں مختلف جسمانی حرکات کا مظاہرہ کرتے دیکھ لیا تھا۔ غالباً" اس نے امریندر سنگھ کو پہچان لیا تھا اور صورت حال کی سنگینی کو محسوس کر رہا تھا۔

نگران خاتون سامان اکٹھا کرنے میں اس کی مدد کر رہی تھی اور امریندر سنگھ تب تک سامان اکٹھا کرتا رہا اور اپنے بیگ میں ڈالتا رہا جب تک کاؤنٹر نمبر۵ خالی نہیں ہو گیا۔

"تھینک یو ویری مچ----!" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے نگران خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کا جواب سنے بغیر کاؤنٹر نمبر۵ کی طرف چل دیا۔

ooo

کاؤنٹر نمبر۵ پر موجود خاتون امیگریشن آفیسر نے اس کے پاسپورٹ کا گہری نظروں سے

جائزہ لے کر اس کے سراپے پر ایک نگاہ ڈالی اور اس سے پہلا سوال کیا۔

"تم برطانیہ کیا کرنے آئے ہو؟"

امریندر سنگھ نے منصوبے کے مطابق اسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ دیا کہ وہ انگریزی اچھی طرح نہیں بول سکتا---- اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ کالی پگڑی والا سکھ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دونوں کی ترجمانی کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیئے اور بمشکل دو منٹ بعد ہی اس کے پاسپورٹ پر برطانیہ میں داخلے کی اجازت کی مہر ثبت ہو چکی تھی۔

"آپ کا سامان نمبر۳ پر ملے گا----" اس سکھ نے پنجابی زبان میں امریندر سے کہا اور "شکریہ" کہہ کر آگے نکل گیا۔

ooo

امیگریشن کاؤنٹر کراس کرتے ہی پشپا بجلی کی سی سرعت سے اپنے بیگج کے حصول کو لپکی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ راستے میں ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے کاؤنٹر پر اسے روک لیا گیا جہاں ایک فارم بھرتے ہوئے اس کے تین منٹ مزید ضائع ہو گئے۔ اس صورت حال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

بھاگم بھاگ وہ ریوالونگ بیلٹ پر پہنچی' اس کا اٹیچی کیس تقریباً" دس منٹ بعد موصول ہوا تھا۔ اٹیچی کیس ٹرالی پر پھینک کر وہ قریباً" بھاگتی ہوئی باہر جانے والے راستے کی طرف لپکی تھی لیکن "گرین چینل" پر جانے کے باوجود اسے روک لیا گیا۔

یہاں پھر اسے اپنا ڈپلومیٹ کارڈ دکھانا پڑا۔ کسٹم آفیسر نے پاسپورٹ کھول کر جب تک اچھی طرح نہیں دیکھ لیا' تب تک اسے جانے کی اجازت نہیں دی۔

اس دوران پشپا نے اپنے اٹیچی کیس کے لاک کھول دیئے تھے لیکن کسٹم آفیسر نے شکریہ ادا کر کے اس کا پاسپورٹ لوٹا دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے دوبارہ لاک بند کئے تھے کیونکہ ایک تو گھبراہٹ اور دوسرے اٹیچی کیس بھی کچھ ایسا ہی بنا ہوا تھا---- اول تو تالا کھلتا ہی نہیں تھا اور جو کھل جائے تو بڑی مشکل سے پھر بند ہونے کا نام لیتا تھا۔ باہر اس کے سفارت خانے کا ایک ملازم اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اپنے سامان کی ٹرالی اسے تھما کر وہ قریباً" بھاگتی ہوئی ٹیلی فون بوتھ تک پہنچی تھی۔

ایک قطار میں چار ٹیلی فون لگے تھے جن میں سے دو پر کارڈ سروس تھی جو ایک طرح سے اس کے لئے ناکارہ تھے کیونکہ اس کے پاس ٹیلی فون کارڈ نہیں تھا۔ باقی دو ٹیلی فون دو بنی نما انگریزوں کے قبضے میں تھے جو اپنی محبوباؤں سے مصروف گفتگو تھے اور مستقل قریب

میں ان کی گفتگو کے خاتمے کے امکانات بھی خاصے معدوم تھے۔

اس صورت حال نے پشپا کو خاصا نروس کر دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر دونوں پر غصہ آ رہا تھا' باقی بوتھ بھی اسی طرح مصروف تھے کیونکہ پانچ چھ فلائٹوں کے مسافر اسی راستے سے باہر آ رہے تھے۔

دو تین منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے فون پر مصروف ایک نوجوان کو گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درخواست کے لہجے میں التجا کی کہ فون فارغ کر دے۔ اس نے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا جیسے مکھی اڑا رہا ہو۔ دوسرے نوجوان نے البتہ اس کی درخواست قبول کر لی تھی۔

فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس تو ٹوٹے ہوئے پیسے بھی موجود نہیں۔ اس دوران اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا---- آپریٹر نمبر کال کرنے کے بعد اس نے "کو لیکٹ کال" کی درخواست کی۔ پھر خدا خدا کر کے اس کا رابطہ سفارت خانے سے بحال ہوا---- سفارت خانے کے ٹیلی فون آپریٹر کے اس جواب نے کہ مسٹر کوہلی کی لائن مصروف ہے' اس کا پارہ آسمان پر چڑھا دیا۔

"بہت ارجنٹ میسج ہے' لائن کاٹ دو۔" اس نے قریباً" چیختے ہوئے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں مس' قونصلیٹ لائن پر ہے۔" آپریٹر نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"اوہ بھگوان!" بے بسی سے وہ ہاتھ ملتی رہ گئی۔

"قریباً" پانچ منٹ تک آپریٹر کو بار بار درخواست کرنے پر اس کا سلسلہ مسٹر کوہلی سے ملا تھا۔ اس دوران وہاں موجود اس کی فلائٹ سے آنے والے مسافر اس کے متعلق مختلف ریمارکس دے چکے تھے۔

کوہلی بھارتی سفارت خانے میں یوں تو انڈر سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا لیکن سفارت خانے کے لوگ اس کی "خصوصی حیثیت" سے آگاہ تھے۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس "را" کا اعلیٰ آفیسر تھا جسے خصوصی اختیارات و احکامات کے ساتھ یہاں بھیجا گیا تھا۔ اس نے بھارت مخالف تنظیموں کے خلاف خاصے کامیاب آپریشن کئے تھے جن میں سے کشمیر محاذ آزادی کے ایک سرکردہ لیڈر کی "ایکسیڈنٹ سے موت" اس کا شاندار کارنامہ تصور کیا جاتا تھا۔

کوہلی یہاں "را" کے مقامی ڈیسک انچارج کی حیثیت رکھتا تھا۔ "را" نے اپنے ایجنٹ مختلف بھروپ میں یہاں "لانچ" کئے ہوئے تھے۔ کوئی صحافی کے روپ میں' کوئی اخبار کے مالک کے' کوئی پروہت اور کوئی گرنتھی کے روپ میں۔ بھارتی باشندوں کی سماجی سرگرمیوں

پر کڑی نظر رکھنے کے لئے سماجی حلقوں میں "را" کے لوگ مختلف سوانگ رچا کر فرائض انجام دے رہے تھے' ان میں ایسے بھی شامل تھے جنہیں بھارت سے یہاں لایا گیا تھا اور وہ بھی جنہیں لندن ہی سے بھرتی کر لیا گیا تھا۔

----یہ لوگ اپنے فن میں طاق اور خاصے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ بھارت مخالف لوگوں اور تنظیموں کی پل پل کی کارروائی پر ان کی کڑی نظریں رہتی تھیں۔

پشپا کو غیر ممالک میں جاسوسی کی تربیت کا خصوصی کورس پاس کروانے کے بعد ہی کوہلی کی اسسٹنٹ کے روپ میں یہاں بھیجا گیا تھا۔ وہ بھارتی باشندوں کی طرف سے ہونے والی تقاریب میں عموماً" اپنے سفارت خانے کی نمائندگی کرتی تھی اور اس طرح مقامی باشندوں میں اپنے "سوشل پن" کی وجہ سے خاصی "پسندیدہ شخصیت" شمار ہوتی تھی۔

اس نے کوہلی کو فون پر مختصراً" کیپٹن امریک کے کوائف سے آگاہ کیا جو امریندر سنگھ کے نام سے ایئر انڈیا کے جہاز پر سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور اب امیگریشن کاؤنٹر پر برطانیہ داخلے کا منتظر تھا----!

کوہلی نے اپنے سامنے رکھی ایک نوٹ بک پر امریندر سنگھ کے مختصر کوائف لکھے اور سلسلہ منقطع ہونے سے پہلے پشپا کو سفارت خانے پہنچنے کی تلقین بھی کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پشپا "دہشت گردوں" کی لسٹ پر آ جائے۔

دوسرے ہی لمحے وہ فون پر سکاٹ لینڈ یارڈ کی مقامی برانچ سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔

OOO

امریندر سنگھ کا وستی سامان صرف ایک ہی بیگ پر مشتمل تھا۔

اس نے پہلے سے حاصل شدہ ہدایات کے مطابق گرین کے بجائے "ریڈ چینل" اختیار کیا تھا اور خود کو رضاکارانہ طور پر تلاشی کے لئے پیش کر دیا تھا۔

کاؤنٹر پر موجود کسٹم آفیسر نے اس کے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر "شکریہ" کہہ کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

باہر نکل کر اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سامنے بنے ٹائیلٹ کا رخ کیا تھا۔ اپنے بیگ سمیت وہ ایک خالی ٹائیلٹ میں جا گھسا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

اس کے جسم پر موجود جیکٹ بیگ میں منتقل ہو چکی تھی۔ بیگ میں موجود گرم پل اوور اس نے قمیص پر چڑھا لیا تھا جس پر ایک چیک وار تہہ شدہ کوٹ بیگ سے نکال کر پہن لیا

تھا۔ سر پر بندھی پگڑی اس نے بیگ میں رکھ لی تھی اور ایک گرم کشمیری ٹوپی بیگ سے نکال کر پہن لی تھی۔ آنکھوں پر بڑے بڑے گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک ڈال کر جب وہ باہر نکلا تو اس کی پہچان ممکن نہیں رہی تھی۔

ٹیلی فون بوتھ سے اس نے ایک نمبر پر فون کر کے اپنا نام بتایا اور اپنے موجودہ حلئے کی نشاندہی بھی کروا دی۔

"تمہارے بالکل نزدیک "میٹنگ پوائنٹ" موجود ہے' وہاں پہنچ جاؤ۔ پانچ سے دس منٹ کے اندر میزبان وہاں موجود ہو گا۔" دوسری طرف سے مختصر پیغام دے کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

دیوار پر لگے نیون سائن پڑھتا ہوا وہ "میٹنگ پوائنٹ" پر پہنچ گیا اور بیگ اپنے قدموں میں رکھ کر وہ اپنے میزبان کی آمد کا منتظر ہو رہا۔

سات آٹھ منٹ کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد بالآخر ایک کلین شیو جیکٹ میں ملبوس نوجوان اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے بالکل ویسی ہی ٹوپی پہن رکھی تھی جیسی اسے بھارت سے روانگی پر اس نصیحت کے ساتھ فراہم کی گئی تھی کہ امیگریشن سے کلیئر ہونے کے بعد وہ پگڑی کی جگہ یہ ٹوپی پہن لے----! چونکہ وہ مونا سکھ تھا اس لئے کسی دشواری کا سامنا اسے نہیں کرنا پڑا۔

نووارد نے "میٹنگ پوائنٹ" پر بیٹھے لوگوں پر نظر دوڑائی' پھر سر ہلاتا ہوا سیدھا اس کی طرف آیا۔

"امریندر جی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"خورشید صاحب!" امریندر نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اس کا بیگ خورشید نے اٹھا لیا تھا اور دونوں نزدیکی لفٹ کی طرف جا رہے تھے جہاں اس نے تیسری منزل پر اپنی کار پارک کر رکھی تھی۔

"سفر کیسا رہا؟" اس نے چلتے چلتے پوچھا۔

"بس گزر گیا جیسا تیسا!" امریندر بولا۔

"انشاء اللہ اب کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔" خورشید نے اس کا بازو تھپکتے ہوئے کہا۔ "ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں' تمہاری خدمت باہر جا کر کروں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ فی الوقت مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں جلدی کسی ٹھکانے

پر پہنچنا چاہیے۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک لمبے عرصے سے میں نے آرام نہیں کیا۔"

اس کے لہجے میں چھپی یاسیت نے خورشید کو متاثر کیا تھا۔

"مجھے احساس ہے دوست' میں بھی اسی منزل کا مسافر ہوں اور انہیں راستوں سے گزرا ہوں جن پر چل کر تم یہاں تک آئے ہو۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔

پارکنگ ایریا میں قدم رکھتے ہی سرد ہوا کا زبردست تھپیڑا امریندر سنگھ کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اسے سردی کے بجائے فرحت کا احساس ہو رہا تھا حالانکہ لندن کی نومبر کی سردی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہوتی تھی۔

خورشید نے کپکپاتے ہاتھوں سے کار کا دروازہ کھول کر اسے اپنے ساتھ آگے بٹھایا۔ بیگ انہوں نے ڈکی میں رکھ دیا تھا۔ فی الوقت وہ اس بیگ کو پچھلی سیٹ پر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے ہیٹر چلا کر اندر کی فضا کو گرم کیا' پھر ایکسیلٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

ooo

کوہلی کا فون چیف کانسٹیبل سمتھ نے وصول کیا تھا۔

اپنے سامنے رکھے کاغذ پر اس نے تیزی سے مشتبہ شخص کے کوائف منتقل کئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایمرجنسی کال بیل کا پش بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آفس سے باہر تھا جہاں ایک مستعد انسپکٹر تیز رفتار کار سمیت موجود تھا۔

"ہیتھرو----" اس نے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

بمشکل پندرہ منٹ کی تیز رفتار ڈرائیو نے انہیں ہیتھرو ایئرپورٹ کے لاؤنج نمبر ۳ کے پارکنگ میں پہنچا دیا۔ اس دوران کار میں موجود ٹیلی فون کے ذریعے چیف کانسٹیبل نے ہیتھرو پر مختلف لوگوں کو مختلف احکامات جاری کر دیے تھے۔

جب ان کی گاڑی پارکنگ ایریا میں داخل ہو رہی تھی تو خورشید دوسرے راستے سے باہر نکل رہا تھا۔

کانسٹیبل سمتھ اور اس کے ساتھی نے امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچنے میں بہت تیزی دکھائی تھی۔ مسافروں کی اب بھی لمبی لمبی قطاریں موجود تھیں---- ریوالونگ بیلٹ پر فلائیٹ نمبر ۳۰۲ کا سامان بھی گھوم رہا تھا اور اس کے گرد مسافروں کا ہجوم بھی لگا تھا لیکن ان کا "شکار"

نکل چکا تھا۔

کاؤنٹر نمبر۵ کے ریکارڈ سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ امرندر سنگھ کو اس کاؤنٹر سے کلیئر کیا گیا ہے۔ امیگریشن میں گزشتہ دس سال سے ترجمانی کے فرائض پر ملازم دھیان سنگھ کی طرف ان کا "دھیان" گیا ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ کئے گئے دو چار سوالات کے جوابات سے ہی ان کی تسلی ہو گئی تھی۔

امیگریشن آفیسر کی ڈائری سے امرندر سنگھ کی قیام گاہ کا ایڈریس لے کر وہ بے نیل و مرام لوٹ آئے۔

"سوری مسٹر کوہلی!" کانسٹیبل سمتھ نے کار سے فون پر ہی کوہلی سے اظہار افسوس کیا: "ہم نے دیر کر دی۔"

امرندر سنگھ سکاٹ لینڈ یارڈ کی لسٹ پر تو آ چکا تھا لیکن براہ راست ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

اس روز رات گئے کانسٹیبل سمتھ کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ جس ایڈریس پر امرندر سنگھ نے اپنے قیام کی اطلاع دی تھی' وہ وہاں موجود نہیں ہے نہ ہی اس ایڈریس پر کوئی شخص اس کے نام سے واقف ہے۔ سمتھ گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ یہ شخص بظاہر تو مشتبہ ہی لگتا تھا لیکن برطانوی قوانین کے مطابق وہ لوگ محض شک کی بنا پر کسی کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح کے تو ہزاروں سکھ یہاں برطانیہ میں پھیلے ہوئے تھے جن کے متعلق کینیڈا' امریکہ' جرمنی' ناروے اور بھارت کی سیکورٹی ایجنسیوں نے انہیں خبردار کیا ہوا تھا لیکن وہ کوئی ثبوت حاصل کئے بغیر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

مشتبہ سکھوں کے اس گروہ میں ایک اور سکھ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

یادِ ماضی

ہیتھرو سے ساؤتھ ہال تک وہ لوگ قریباً" ایک گھنٹہ میں پہنچے تھے۔ ساؤتھ ہال کے گوردوارہ "سنگھ سبھا" کے باہر خورشید نے کار کھڑی کر دی' وہ کار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کار کی بیک لائٹس اس نے جان بوجھ کر جلتی رہنے دی تھیں۔

کار کا انجن بھی ابھی اس نے بند نہیں کیا تھا۔ قریباً" دو منٹ وہ کھڑے رہے۔ گو کہ یہ پارکنگ کی جگہ نہیں تھی لیکن دونوں کے کار میں موجود رہنے سے قانون کا احترام قائم رہا تھا۔

اس دوران کار کے سائیڈ والے شیشے میں خورشید نے ایک نوجوان سکھ کو اپنی طرف آتا دیکھ لیا تھا۔ اس کے نزدیک آنے پر خورشید نے اپنی سائیڈ والا شیشہ نیچے گرا دیا۔ آنے والے نے جھکتے ہوئے ایک نظر دونوں پر ڈالی۔ امرندر سنگھ کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر "فتح" بلائی تھی۔

"نمبر۶ میں لے چلو----" اس نے خورشید سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

خورشید نے کار کا شیشہ گرا دیا اور اب وہ ۶ نمبر کی طرف جا رہا تھا جو یہاں سے صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر واقع تھا۔ ۶ نمبر مکان کے سامنے اس نے گاڑی روکی۔ کسی نے مکان کی اوپری منزل کی کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر کھڑی کار کا جائزہ لیا' پھر ایک خاتون مکان کا دروازہ کھول کر باہر چلی آئی۔ خورشید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک مانوس سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"کیسے ہو ویر جی؟"

"شکر ہے اللہ کا۔ اپنا مہمان سنبھالو۔ کل ملاقات ہو گی۔" اس نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آؤ ویر جی!" خاتون نے امرندر کو اشارہ کیا جس نے ہاتھ جوڑ کر اسے "فتح" بلائی تھی۔

ڈکی سے بیگ اٹھا کر امرندر خاتون کی معیت میں اندر داخل ہو گیا۔ خورشید کار آگے

بڑھا لے گیا۔ اندھیرا خاصا گہرا ہونے لگا تھا' جب خاتون نے مکان کے باہر دروازے کو لاکر کر کے اس کی راہنمائی اندر کمرے کی طرف کی۔

----جیسے ہی امریندر اندر داخل ہوا' سامنے موجود شخص کو دیکھ کر حیرت اور خوشی سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ستنام تم.....!"

"امریک میرے یار۔ میرے ویر----" ستنام نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔

ستنام کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جیسے اسے بھولی ہوئی کہانی پھر سے یاد آ گئی۔

دونوں نے فوج میں اکٹھے ہی کمیشن لیا تھا۔ اکٹھے ہی سپیشل کورس کئے تھے اور مشرقی پاکستان کی جنگ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بہادری کے کارنامے انجام دیئے تھے۔ دونوں کو جنگ کے خاتمے پر خصوصی میڈلز سے نوازا گیا تھا' تب دونوں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ پھر ستنام کی یونٹ بدل گئی۔ اس کا تباولہ لائٹ انفنٹری بریگیڈ میں ہو گیا جب کہ امریک سنگھ لانسرز میں چلا گیا۔

کچھ بھی تھا' دونوں بہرحال ایک دوسرے کے حال سے باخبر رہتے تھے۔ انہیں اپنی ٹریننگ کا زمانہ کبھی نہ بھولا تھا۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔ ان کے ہم کورس ساتھیوں میں تو یہ بات یہاں تک کہی جاتی تھی کہ دونوں عاشق بھی ایک ہی لڑکی پر ہوں گے----

اور----

ایسا ہوا بھی!

بریگیڈیئر رتھ کی بیٹی مندا کنی پر دونوں ایک ساتھ ہی لٹو ہوئے تھے اور وہ ان دونوں کے ساتھ ہی اکثر نظر آیا کرتی تھی۔

کبھی کسی کلب میں----

کبھی کسی پکنک پوائنٹ پر----

اور کبھی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں تیراکی کرتے ہوئے۔

لیکن---- دونوں ہی اسے نہ پا سکے۔ درمیان میں ایک روز نجانے لیفٹیننٹ رامیشور کہاں سے ٹپک پڑا اور اسے اڑا لے گیا۔

رامیشور لیفٹیننٹ جنرل کا بیٹا تھا جب کہ ان دونوں کے باپوؤں نے صوبیداری بھی نہیں دیکھی تھی۔ دونوں کسانوں کے بیٹے تھے۔ امریک سنگھ کا باپ البتہ رئیس آدمی تھا۔ وہ لوگ

نسل در نسل اپنے گاؤں کے سرپنچ بنتے آ رہے تھے۔ اس کا دادا زیلدار تھا۔ جب انگریز برصغیر سے رخصت ہوئے تو نئی حکومت نے اس کے دادا کی زیلداری بھی ختم کر دی' پھر بھی یہ گھرانہ زیلداروں کا گھرانہ ہی کہلاتا تھا۔

ستنام بھی کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن مندا کنی کو رامیشور کے سامنے دونوں گدھے نظر آتے تھے۔ یہاں اسے مذہبی آزادی بھی میسر تھی کیونکہ یہ دونوں سکھ تھے اور رامیشور ہندو۔

ایک روز جب وہ ان سے ملی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کل تک انہیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ ان میں سے مندا کنی کا پتی کون بنے گا؟

"اتنی جلدی کیا ہے ہنی؟" ستنام نے کہا تھا۔

"ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دو----" امریک بولا۔

"تم دونوں جاؤ بھاڑ میں' آئندہ کبھی میرا نام بھی زبان پر مت لانا۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر وہاں سے رخصت ہوئی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو اس حادثے کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی "مندا کنی" کے ساتھ سیریس نہیں ہے۔

مندا کنی نے انہیں جلانے کے لئے خاص طور سے اپنی شادی میں بلایا تھا اور دونوں کو ایک ہی کارڈ بھیجا تھا لیکن مندا کنی حیران ہی تو رہ گئی جب نہ صرف دونوں دعوت میں شامل تھے بلکہ انہوں نے تحفہ بھی مشترکہ ہی دیا تھا۔

جس روز دربار صاحب پر بھارتی فوج نے حملہ کیا' اس سے بہت پہلے ہی کیپٹن ستنام سنگھ ذہنی طور پر فوج سے باغی ہو چکا تھا۔ وہ ایک روز ہرمندر صاحب میں ماتھا ٹیکنے گیا' بس وہیں کا ہو رہا۔

سنت جرنیل سنگھ کا نام اس نے متعدد مرتبہ سنا تھا لیکن انہیں ایک ان پڑھ اور جنونی قسم کے سکھ سے زیادہ کوئی اہمیت کبھی نہیں دی تھی۔

لیکن----!

اس روز جب اس نے سنت جی کی باتیں سنیں تو پھر انہی کا ہو رہا۔ اس کے دوست حیران ہی تو رہ گئے' جب انہیں علم ہوا کہ کیپٹن ستنام سنگھ "امرت دھاری سکھ" بن گیا ہے۔ اس نے سنت جرنیل سنگھ کے ہاتھوں "امرت" چکھ لیا تھا اور سکھی سدھانتوں پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔

آخری مرتبہ جب ۱۹۸۴ء کے آغاز میں اس کی ملاقات کیپٹن امریک سنگھ سے ہوئی تو امریک کے لئے اسے پہچاننا مسئلہ بن گیا۔ اس کے سامنے نٹ کھٹ کیپٹن ستنام کے بجائے سردار ستنام سنگھ بنی والا کھڑا تھا۔ اپنی پانچوں "ککار" کے ساتھ۔ اس نے اپنے بڑے بڑے کیس بڑے سلیقے سے پگڑی میں باندھ رکھے تھے۔ ہاتھ میں منجی صاحب کا کڑا پہنا ہوا تھا اور شرٹ کے نیچے چھوٹی سی کرپان کو سینے سے لگا رکھا تھا۔

دونوں بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے تھے لیکن نجانے کیوں امریک سنگھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے دوست کی بجائے کسی اور شخص سے ملاقات کر رہا ہے۔

رات دونوں نے ایک ہوٹل کے کمرے میں اکٹھے ہی بسر کی تھی۔ یہ ان کا معمول تھا کہ مہینے میں ایک آدھ رات وہ اکٹھی ضرور گزارتے تھے۔ اس مرتبہ اتفاق سے وہ تین ماہ بعد اکٹھے ہوئے تھے۔

بدلے ہوئے ستنام سنگھ کی گفتگو بھی چونکا دینے والی تھی۔

امریک سنگھ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر بغاوت کی چنگاری سلگنے لگی ہے جو کبھی بھی شعلہ بن کر اس کے کیریئر کو بھسم کر ڈالے گی۔ وہ رات دیر گئے تک امریک کو بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ دونوں اپنی زندگی کے حقیقی مقصد سے بہت دور چلے گئے ہیں اور براہمن نے ایک سازش کے تحت انہیں عملاً ہندو بنا ڈالا ہے۔ ان کا تشخص ختم ہو کر رہ گیا ہے اور یہی حالت رہی تو دس سال کے بعد من حیث القوم وہ لوگ مر جائیں گے----

ان کا دھرم مٹ جائے گا اور ان کی ہستی باقی نہ رہے گی۔

امریک سنگھ اس کی بجائے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ ان کا درد سر نہیں ہے۔ اکالی دل کا مسئلہ ہے۔ شرومنی اکالی دل کا مسئلہ ہے اور ممکن ہے یہ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کا ذاتی مسئلہ بھی رہا ہو۔

انہیں تو اپنا کیریئر سوچنا تھا۔ آگے نکلنا تھا۔ ڈیرہ دون سکول پاس کر کے میجر بننا تھا پھر کرنل' بریگیڈیئر اور بہت کچھ۔

وہ ستنام کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس چکر میں نہ پڑے۔ بس چپ چاپ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرتا رہے۔ کوئی انہیں فوج میں مذہب بدلنے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ کسی نے ان کے نام نہیں بدلے۔ کسی نے انہیں گوردوارے جانے سے نہیں روکا۔

لیکن----!

اگر وہ ایسی باتیں کرے گا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ اس کی زندگی برباد ہو کر

رہ جائے گی۔ اس سے پہلے وہ دو سکھ آفیسرز کا حشر دیکھ چکے تھے۔ ان کے سامنے جنرل شوبیگ سنگھ کی مثال موجود تھی۔

----وہی جنرل شوبیگ سنگھ جس نے مشرقی پاکستان میں "مکتی باہنی" قائم کی۔ جس نے ہندو کے دیرینہ خواب کو حقیقت کا روپ دیا---- لیکن ہوا کیا؟

جنرل شوبیگ سنگھ کو ذلیل کر کے فوج سے نکال دیا گیا۔

کیا گناہ تھا اس کا؟

یہی کہ اس نے خود کو "سکھ" سمجھنا شروع کر دیا تھا اور یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ ستنام سنگھ کی' بھارتی فوج کے ایک معمولی کیپٹن کی تو بات ہی اور تھی۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو پایا کہ اس نام کا کوئی شخص یہاں تھا بھی یا نہیں؟

اس سب کے باوجود امریک سنگھ سمجھتا تھا کہ ستنام کی باتوں میں وزن ہے۔ جب کہ وہ بے وزن باتیں کر رہا تھا۔ جو نشہ ستنام کو چڑھا تھا وہ مر کر بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ اس نے جس دن سے "امرت دھاری" بننے کی ٹھانی تھی' شراب چھوڑ دی تھی۔ وہ امریک سنگھ کو ایک ہی بات کہتا رہا: کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ ایک مرتبہ سنت جی کی محفل میں بیٹھ آئے۔ ان کی باتیں ان کی زبانی سن لے۔ بھارتی پریس کی زبان سے نہ سنے کیونکہ بھارتی پریس کی اپنی زبان کوئی نہیں۔ ہندو کی زبان ہے جس کا اعتبار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

صبح جب دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے تو یہ نہیں جانتے تھے کہ اب دوبارہ کب ملیں گے؟

جون ۸۴ء کا وہ منحوس دن اس کی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا تھا۔ اس روز علی الصباح خبر مل گئی کہ بھارتی فوج نے برار کی کمان میں دربار صاحب پر حملہ کر دیا ہے۔

یونٹ پر موت جیسا سکتہ طاری تھا۔

جیسے سب کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔

شام کو اس کے روم میٹ کیپٹن سپرا نے اسے بتایا کہ جن فوجیوں نے بغاوت کر دی ہے ان میں کیپٹن ستنام سنگھ بھی شامل ہے۔

ستنام سنگھ نے جنونی حالت میں اپنے کرنل اور اس کے ایڈجوٹینٹ کو ہلاک کر دیا تھا اور جیپ لے کر پنجاب کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ آخری اطلاعات جو اس تک پہنچیں ان کے مطابق وہ چھاؤنی سے پچاس میل دور ایک مقابلے میں مارا گیا جب کہ ایک اور "ذریعے" نے

بتایا کہ وہ فرار ہو چکا ہے اور فوج کے قابو نہیں آیا۔ بہت سے سکھ فوجی بھاگ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

امریک سنگھ نے بھی دوسری خبر کو ہی سچ جانا تھا۔ اس کا دل یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا دوست ستنام سنگھ اتنی جلدی مارا جائے گا۔۔۔۔؟ کوئی طاقت اسے رہ رہ کر اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ ستنام سنگھ زندہ ہے اور وہ اسے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ملے گا۔

یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ایک روز اسے ستنام جیسے حالات سے گزرنا ہو گا اور اس کا دوست اسے ملے گا بھی تو یوں اچانک اور اس روپ میں۔

ooo

ساؤتھ ہال لندن کی کرینسٹ سٹریٹ پر بنے ستنام کے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں موجود اور محفوظ کیپٹن امریک سنگھ اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔۔۔۔

ستنام کی بیوی نے ان کے سامنے مختلف خوان سجا دیئے تھے لیکن دونوں دوست یہاں سے ہزاروں میل دور بھارت کی منجمد فضاؤں میں ماضی کے گڑے مردے اکھاڑ رہے تھے۔

امریک سنگھ کو جس روز ہرمندر صاحب پر بھارتی حملے کی خبر ملی تھی' اس روز وہ پہلی مرتبہ ٹوٹا تھا۔ اسے رہ رہ کر ستنام کی اور اپنی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ اس کی کہی ایک ایک بات اتنی سچی اور ایسی زندہ ہو جائے گی؟

یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

تین روز تک وہ اپنے گھر کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین رہا لیکن پنجاب میں ٹیلی فون کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ چوتھے روز اسے بالآخر کال مل ہی گئی۔ اس کی ماں نے سسکیاں لے لے کر گھر کی کہانی سنائی تھی۔ اسے علم ہوا کہ اس کا ایک بھائی اور چچیرے بھائی سنت جی کے ساتھ ہی مارے گئے تھے۔ جن کے بعد سے سی۔آر۔پی نے ان کے گاؤں پر بھی ہلہ بول دیا تھا۔

"بیٹا لعنت ہے ہمارے سکھ ہونے پر اگر آج بھی تم بھارتی فوج کی وردی سجائے پھرتے ہو۔ ہمارا اگر کوئی بہت زبردستی کا قائم کردہ رشتہ باقی تھا تو اب ٹوٹ گیا۔ ۶ جون کے بعد ہمارا ہندو سے کوئی تعلق نہیں۔ اب ہم جئیں اور مریں گے تو صرف اور صرف "پنتھ کی چڑھدی کلا" کے لئے۔ بیٹا ایک بات یاد رکھنا' ہم نے ماضی میں ایک غلطی کر کے اس کی بہت بڑی سزا بھگت لی ہے۔ تم نے اگر ایسی غلطی کر لی تو شاید اس کا انجام دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ

سکو۔۔۔۔ گورو کے لال بنو' گورو گوبند سنگھ کے بچے بنو! یہی ہمارا سب سے مضبوط اور اٹوٹ رشتہ ہے۔" اس کی ماں سسکیاں لے لے کر اسے کہہ رہی تھی۔ اتنا کرب اٹھانے کے بعد اپنا ایک سجیلا بانکا لال پنتھ کے نام پر شہید کروانے کے بعد وہ اس لئے رو رہی تھی کہ ابھی تک دوسرے بیٹے نے بھارتی فوج کی وردی کیوں نہیں اتاری تھی۔

ماں کا ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہا تھا۔ اسے اپنے خون کا خمیر بدلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی غیرت اب تک سوئی کیوں رہی؟

وہ کیوں اپنے جگری یار ستنام کے راستے کا مسافر نہیں بنا؟

"تم دل پر ملال نہ کرنا ماں! میں تمہیں وچن دیتا ہوں کہ تمہارے وودھ کی لاج نبھا دوں گا۔ میں اپنے ویر امرجیت سنگھ کی شہادت کو' اپنے ہزاروں بھائی بہنوں' مائی باپ کی شہادت کو بھولوں گا نہیں' ایک ایک کا بدلہ لوں گا۔"

اس کی ماں نے فون پر ہی "جے کارے" بلانے شروع کر دیئے تھے' اس کے ساتھ ہی سلسلہ کٹ گیا۔

اگلے روز اس کی اپنے والدین کے ساتھ گفتگو کا ٹیپ بریگیڈیئر کی میز پر رکھا تھا۔

اس کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ اس کی گفتگو ٹیپ بھی کی جا سکتی ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ بھارتی آرمی کے ساتھ سکھ آفیسرز کو "انڈر آبزرویشن" رکھا گیا ہے۔ خصوصاً" پنجاب آرمی کی طرف سے ہونے والے تمام فون "ٹیگ" کئے جا رہے ہیں۔

آرمی کی انٹیلی جنس یونٹ کا کرنل مہتہ بریگیڈیئر جوشی کے سامنے بیٹھا اس کے اگلے احکامات کا منتظر تھا۔

"ابھی صرف چیک کرو۔۔۔۔" بریگیڈیئر ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔

"یس سر!" کرنل نے کھڑے ہو کر ایڑیاں بجائیں۔

اسی روز شام کو آرمی ٹیلی فون ایکسچینج کے حوالدار رام سنگھ نے علیحدگی میں ملاقات کر کے کیپٹن امریک سنگھ کو سمجھا دیا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے خبردار کیا کہ آئندہ احتیاط کرے۔

امریک سنگھ کا ماتھا ٹھنکا۔

واقعی جوش میں اس کے ہاتھوں سے ہوش کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ اب اس پر انٹیلی جنس والوں کی نظر تھی اور اس کا فرار یہاں سے خاصا دشوار ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی وہ جانتا تھا کہ ایک مرتبہ سیکورٹی کی نظروں میں آ جانے کے بعد اس کا بچ رہنا اب ناممکن سی بات

ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ انتظار کرے اور کسی نئی مصیبت کو دعوت دے' اس نے اگلے روز ہی نکل جانے کا منصوبہ بنا لیا۔

شام کو اپنے معمول کے مطابق وہ مقامی کلب کی طرف چل دیا۔

میس کے عین گیٹ پر جیسے ہی اس کی گاڑی پہنچی' دروازہ بند کر دیا گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے گارڈ سے سختی سے پوچھا۔

"سر آرڈر نہیں ہے۔" گارڈ نے تعظیم دیئے بغیر جواب دیا۔

"میری بات چیف سے کراؤ۔"

"او کے سر!"

گارڈ نے سیکورٹی میجر سے سلسلہ ملا کر فون اسے تھما دیا۔

"کیپٹن سنگھ آپ کو میس سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔" میجر نے اس کی ہیلو کے جواب میں مختصر حکم دے کر فون بند کر دیا۔

اب اسے جو بھی کرنا تھا' وماغ ٹھنڈا رکھ کے کرنا تھا۔ اس نے اطمینان سے گاڑی واپس موڑ لی اور اپنے کمرے کے سامنے روک کر اردلی کو میس سے کافی لانے کا حکم دے کر کمرے میں چلا گیا۔ اپنے پاس موجود تمام کرنسی اور کام کی اشیاء اس نے اپنی جیکٹ اور پتلون کی جیبوں میں ٹھونس لیں اور چوکنا ہو کر بیٹھ رہا۔

اردلی کافی لے آیا تھا۔ اس نے اردلی کو "آف" کر دیا اور جب وہ اپنی بیرک کی طرف چلا گیا تو کیپٹن امریک سنگھ بھی معمول کی مٹرگشت کے بہانے باہر آ گیا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں کھیل والی گراؤنڈ تک پہنچ چکا تھا۔ اس بات پر اس کی مکمل نظر تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا؟ جلد ہی اسے اطمینان ہو گیا کہ فی الوقت اس پر کسی کی نظر نہیں تھی۔

شاید ان لوگوں نے یہ سوچا ہی نہیں ہو گا کہ وہ آج ہی فرار ہو جائے گا۔ کیپٹن امریک سنگھ پگڑی نہیں باندھتا تھا کہ اس کی کوئی خاص پہچان بن جاتی۔ اس کا رخ بیرونی دیوار کی طرف تھا۔ یہ راستہ میس کی پشت سے باہر جوانوں کی بیرکوں کی طرف جاتا تھا۔

○○○

بیرکوں تک وہ اطمینان سے پہنچ گیا۔

یہاں سے متبادل راستہ اختیار کر کے وہ سڑک تک آ گیا۔ سیکورٹی والوں کو اگلے روز صبح تک علم ہی نہ ہو سکا کہ کیپٹن امریک سنگھ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ریلوے اسٹیشن پر تیار گاڑی میں اسے سیٹ مل گئی۔ اس نے

جان بوجھ کر تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدا تھا اور اگلے روز علی الصباح دہلی پہنچ گیا۔

دہلی پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ اب وہ ایک کلین شیو نوجوان تھا۔ فی الحال آرمی انٹیلی جنس کی نظروں سے بچے رہنے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ جانتا تھا اگلے روز اس کی تصاویر ملک کے تمام اہم مقامات پر پہنچ جائیں گی۔

○○○

دہلی میں اپنے ایک دوست کے گھر رات قیام کر کے اس نے پنجاب کی راہ اپنائی۔ کلین شیو ہونے کے سبب کسی نے اس پر توجہ نہ دی اور وہ اطمینان سے لدھیانہ پہنچ گیا۔ اس کا گھر لدھیانہ کے نزدیک ہی ایک گاؤں میں تھا۔ امریک سنگھ نے گھر براہ راست جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کالج کے زمانے کے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔

اس کی بدلی ہوئی صورت دیکھ کر پہلے تو کسی کو اس کے امریک سنگھ ہونے کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ جسدیو کی زبانی اسے علم ہوا کہ اس کے فرار کے اگلے ہی روز سی۔ آر۔ پی نے اس کے گھر چھاپہ مارا تھا اور گاؤں کے لوگوں سے پولیس کی ٹھن گئی تھی۔ پولیس اس کی بہنوں کو تھانے لے جانا چاہتی تھی تاکہ انہیں یرغمال رکھ کر اسے گرفتار کر سکے لیکن سارا گاؤں مرنے مارنے پر تیار ہو گیا تھا۔

"ڈی ایس پی بہت ذلیل آدمی ہے' مٹھو رام نام ہے اس کا۔" جسدیو نے بتایا---- "کوئی بات نہیں "کھاڑکو" (وہ لوگ جو پولیس کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہے ہیں) حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ سالے کو چھوڑیں گے نہیں۔ اس نے بڑا قہر اٹھا رکھا ہے۔ سالا' کتے کا بچہ' شہیدوں کا بھوگ بھی نہیں رکھنے دیتا۔ امریک سیہاں' اس نے امرجیت کا بھوگ گاؤں کے گوردوارے میں نہیں رکھنے دیا۔ آج تک گارد بٹھا رکھی ہے۔" جسدیو پھٹ پڑا۔ نفرت سے اس کی زبان بے اختیار مغلظات بک رہی تھی۔

"جسے! میں اس پر اگلا سورج نہیں چڑھنے دوں گا۔ اس کی ارتھی اٹھانے کوئی نہیں آئے گا۔ نہ اس کا وجود باقی رہے گا نہ اس کی ارتھی اٹھے گی۔" اس لمحے امریک سنگھ کو خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا واحد ہتھیار اس کا "سروس ریوالور" اور چند گولیاں تھیں لیکن وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اس سے بہت کچھ کرنے کا فن جانتا تھا۔

"جسے تو میرا ایک کام کر دے۔ مجھے کسی طرح مٹھو رام کے شام کے معمولات کی خبر لا دے۔"

"امریک سیہاں! بے فکر رہ۔ ہم تیرے ساتھ ہیں۔"

جسدیو اسے گھر آرام کرنے کا مشورہ دے کر نکل گیا۔ اس کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی تھی۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ایک اور شخص کو لایا تھا۔

"اس کا نام ہری سنگھ بابا ہے۔" جسدیو نے اس کا تعارف کروایا اور اس کی جھتے بندی کا نام بتا دیا۔

"مٹھو رام کی اکال چلنا کا بندوبست ہم نے بھی آج ہی کیا ہے کیپٹن صاحب' لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اس پر زیادہ حق آپ کا ہے۔" آنے والے نے کہا: "ہم آپ کے ساتھ ہوں گے' آخری دم تک۔ ہمارا ساتھ آخری دم کا ہوتا ہے۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کسی کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔ یوں بھی یہ کام میں اکیلا اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کپتان صاحب! ہمیں آپ کے جذبات کا احساس ہے لیکن ہمارے نزدیک زیادہ ضرورت آپ کی جان کی ہے۔ آپ اپنے جیسے کئی اور نوجوان تیار کر سکتے ہیں۔ ہم نے مرنا ہی ہے' آج نہیں تو کل۔ ہم تو گھر والوں سے "ارداس" کر کے چلے ہیں۔" بابا ہری سنگھ نے کہا۔

پروگرام طے پا گیا۔

پلاننگ کیپٹن امریک سنگھ نے کی تھی۔ جس میں ناکامی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے دل و دماغ میں جو الاؤ دہک رہا تھا' اس سے وہ مٹھو رام ڈی ایس پی کو تھانے سمیت جلا کر راکھ کر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس مطلوبہ ہتھیار نہیں تھے۔ جو تھے ان کا بہترین استعمال اس نے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ooo

مٹھو رام نے علی الاعلان کہا تھا: جو اپنی مائی کا جنا ہے وہ کسی شہید کا بھوگ ڈال کر دکھ دے۔ سارے گاؤں والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ نور محل تھانے کے حلقے میں آنے والے دیہاتوں میں لوگ خوف کے مارے کسی شہید سے رشتہ قائم نہیں کرتے تھے۔ اس روز جب پوسٹ مارٹم کے بعد نوجود سنگھ کی لاش تھانے پہنچی تو پولیس کی اطلاع کے باوجود اس کا باپ لاش لینے تھانے نہیں گیا----!!

ادھر کلونت نے للکار کر کہہ دیا تھا کہ شام تک گاؤں والے تیار نہ ہوئے تو وہ خود بھائی کا لاشہ وصول کرنے جائے گی۔ اس نے وہ بین ڈالے تھے کہ آسمان کا کلیجہ شق ہو رہا تھا۔

آخر کو شمشیر سنگھ کی غیرت جاگی اور اس نے گاؤں کو "ونگارتے" ہوئے کہا: "بزدلو

گیدڑ کی موت مرنے سے بہتر نہیں کہ نوجود سنگھ کی طرح شیر کی موت مارے جاؤ۔ مرنا تو ہے ہی۔ کون کہتا ہے کہ وہ بچ جائے گا! کوئی نہیں بچ سکتا۔ ترک آ گئے! ترک آ گئے! اب گورو کے لاڈلے "ات ہی رن میں جھو جھہ مروں" کا سبق یاد کریں۔"

گوردوارے کے سپیکر کھول کر اس نے گاؤں والوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا کہ "آج نزدیک دور کے سورماؤں کا "بھوگ" پڑے گا۔ جو گورو کا سنگھ ہے وہی شمولیت کرے' بزدلوں پر لاکھ بار لعنت۔"

مٹھو رام تھانے میں موجود یہ ساری "واہی تباہی" سن رہا تھا۔ اس نے تھانیدار للت کمار کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ میرے استقبال کی تیاریاں کی ہیں تم لوگوں نے؟"

للت کمار کی دونوں ایڑیاں ایک ساتھ بجیں: "مہاراج آج تک کسی نے ایسی جرأت نہیں کی۔ میں اس گیانی شمشیر سنگھ کے بچے کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

"اب تک کیا تم لوگ جھک مار رہے تھے؟" ایس پی مٹھو رام نے گلہ پھاڑ کر کہا۔

"سر! کسی نے آج تک ایسی جرأت نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے "ات وادی" گاؤں میں بھی گھس آئے ہیں۔" اے ایس آئی مکھن سنگھ نے موقعے کی نزاکت کو جانتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔

اس سے پہلے کہ تینوں کوئی اور بات کریں۔ گوردوارے کے سپیکروں سے گگن دمہ بجنے لگا۔

"سورا سو ہی جو لڑے دین کے ہیٹھ!

سورا سو ہی---- سورا سو ہی!

سارا گاؤں شمشیر سنگھ کا ہم آواز تھا۔

پرزہ پرزہ کٹ مرے!

کبھو نہ چھاڈے کھیت!

سورا سو ہی---- سورا سو ہی!

پرجوش آوازیں مٹھو رام کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔

نفرت سے اب تک وہ تھانے کے صحن میں رکھی نوجود کی لاش پر متعدد مرتبہ تھوک چکا تھا۔ یہی اس کے بس میں تھا اور کرتا بھی کیا۔

"ارداس" کے خاتمے پر گیانی شمشیر سنگھ اور گاؤں کا سرپنچ باقی لوگوں کے ساتھ لاؤ
وصول کرنے تھانے کی طرف چل دیئے۔

مٹھو رام کو جب جلوس اس طرف آنے کی اطلاع ملی تو اس نے للت کمار کو گالیاں بکتے
ہوئے تھانے سے باہر نکل کر جلوس کو روکنے کا حکم دیا اور خود اپنی جیپ کے وائرلیس پر اس
نے نزدیکی "سی آر پی" کے کمانڈنٹ سے رابطہ کر کے "کمک" طلب کر لی۔

جب گاؤں والے نوجود کی لاش لینے تھانہ نور محل کے باہر پہنچے تو سی آر پی کے مستعد
جوانوں نے ایک طرح سے سارے گاؤں کو ہی گھیرے میں لے لیا تھا۔

"خبردار کوئی تھانے کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔" سی آر پی کے کمانڈنٹ نے
اپنی جیپ پر نصب لاؤڈ اسپیکر پر ہجوم کو وارننگ دی۔

لیکن۔۔۔۔!

اس کی وارننگ ہجوم کے پر شور "جے کاروں" کی آواز میں گھٹ کر رہ گئی۔ گیانی شمشیر
سنگھ اور کلونت کور ایک طرح سے جلوس کی راہنمائی کر رہے تھے۔ مٹھو رام تھانے کی
چھت پر بیٹھا یہ سارا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ دوربین اس کے ہاتھوں اور آنکھوں سے چپک کر رہ
گئی تھی۔

اس نے اپنے قریب کھڑے اردلی کو جیپ سٹارٹ کرنے کا حکم دیا اور پستول ہاتھ میں
پکڑے قریباً" بھاگتا ہوا اردلی کے تعاقب میں جیپ تک پہنچا۔۔۔۔!

تھوڑی ہی دیر بعد وہ تھانے کے پچھلے دروازے سے جیپ سمیت برآمد ہو رہا تھا۔ جیپ
کا رخ پولیس لائن کی طرف تھا اور اردلی جیپ کو اڑائے چلا جا رہا تھا۔ یہاں سے رخصت ان کا بس چلتا تو ایسا کچھ کرنے والوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن وہ ایسا سوچ ہی نہیں سکتے
ہونے سے پہلے ایس پی مٹھو رام نے اپنا فرض نہیں بھلایا تھا اور اپنی جیپ میں نصب
وائرلیس کے ذریعے اس نے سی آر پی کے کمانڈنٹ کو مشورہ دیا تھا کہ اس ہجوم میں چونکہ
"مسلح انتہا پسند" بھی موجود ہیں اس لئے ان سے نمٹنے میں کسی سستی کا مظاہرہ نہ کیا
جائے۔"

کمانڈنٹ سی آر پی کو جب جلوس میں موجود "مسلح انتہا پسندوں" کی خبر ہوئی تو اس نے
اپنے جوانوں کو چوکس کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سی آر پی کی طرف سے ہوائی فائرنگ شروع
ہو گئی اور لوگوں کو وارننگ دی گئی کہ اب اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اسے گولی
مار دی جائے گی۔

اس وارننگ کی پہلی خلاف ورزی گیانی شمشیر سنگھ نے کی اور جیسے ہی اس نے کمانڈنٹ

کی جیپ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی' جیپ کی حفاظت پر مامور سی آر پی کے چار جوانوں
کی رائفلوں نے ایک ساتھ شعلے اگلے اور گیانی کا نیلا چولا اس کے خون سے رنگین ہونے
لگا۔ یوں دکھائی دیتا تھا اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل آیا ہو۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر
رکھے گیانی شمشیر سنگھ دوسرے ہی لمحے پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا۔ مرتے مرتے بھی وہ مٹھو
رام کے منہ پر طمانچہ رسید کر گیا تھا اور پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔

گیانی شمشیر سنگھ کے مرنے کا ہی شاید بہت سے دوسروں کو انتظار تھا کہ ایک کے بعد
ایک اس کے تعاقب میں لپکا۔ سی آر پی نے بھی کسی غفلت یا سستی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پندرہ لاشیں بچھ گئیں۔ باقی قریباً" سب ہی زخمی تھے۔ اس سے
پہلے کہ سی آر پی والوں پر گاؤں کے لوگوں کا قہر ٹوٹے' وہ اپنی جیپوں پر بھاگ گئے۔ ان کی
ڈیوٹی اب ختم ہو چکی تھی۔

اب امریک سنگھ کے باپ کی ڈیوٹی شروع ہوئی تھی جو خود ٹریکٹر چلا کر وہاں تک لایا۔
جیسے تیسے اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے زخمیوں کو ٹریکٹر کے پیچھے بندھی ٹرالی میں ڈالا
اور سول ہسپتال کی طرف چل دیا۔

سول ہسپتال جالندھر میں زخمی لاشیں کیا پہنچیں کہ چار سو کہرام مچ گیا۔
لوگ تھے کہ اڈے چلے آ رہے تھے۔

ان کی آنکھیں ان مناظر پر خون روتی تھیں اور بدن غیظ و غضب میں سلگ رہے تھے۔

ایس پی مٹھو رام نے پل پل پر نظر رکھی تھی۔

اس کے ٹاؤٹ ہجوم میں موجود اسے لمحے لمحے کی رپورٹ دے رہے تھے۔ جب اس
نے سنا کہ غیظ و غضب میں بھرے سکھوں کا ایک ہجوم تھانہ نور محل پر حملہ کرنے کے لئے
سی طرف آ رہا ہے تو ایک مکارانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

تھانہ نور محل ایس پی مٹھو رام کے حکم سے خالی کر دیا گیا تھا۔

شام ڈھلنے پر جب دور و نزدیک کے دیہاتوں سے جمع ہونے والے ہجوم نے غضب ناک
ہو کر تھانے پر حملہ کیا تو تھانے کی عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہجوم میں موجود مٹھو
رام کے ٹاؤٹوں نے ہدایات کے مطابق سب سے پہلے تھانے کی عمارت پر تیل کے کنستر
پھینکے' پھر اسے آگ لگا دی۔

تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر یہ غضب ناک گروہ منتشر ہو گیا۔

ooo

اگلے روز علی الصباح ہی دلی سے عالمی پریس کے نمائندے نور محل گاؤں میں جمع ہو
شروع ہو گئے تھے۔ ایس پی مٹھو رام ایک ایک اخبار نویس کو بازو سے پکڑ کر تھانے
عمارت کے قریب لے جاتا اور انہیں تفصیلات بتانے لگتا کہ کس طرح انتہا پسندوں
تھانے میں مقید چار کانسٹیبلوں سمیت ایک تھانیدار کو تھانے کی عمارت کے اندر ہی اندر
جلا دیا تھا۔ پھر خود ہی اخبار نویسوں سے سوال بھی کرنے لگتا تھا کہ ان کے خیال میں کیا
کسی سیدھے سادے آدمی کی کارروائی ہے؟

"ہرگز نہیں۔" جواب ملتا۔

یہی جواب دراصل اسے درکار ہوتا۔ اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں پہلے سے تیار شد
ٹیپ چلا دیتا اور انہیں بتانے لگتا کہ کس طرح "پار" سے دہشت گرد تربیت حاصل کر
بھارت میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں کے بھولے بھالے' سیدھے سادے کسانوں کو تخری
کاری کا درس دینے لگتے ہیں۔ اس نے اخبار نویسوں کو یہ باور کروا دیا تھا کہ یہ سار
کارروائی پاکستان میں موجود کیمپوں سے تربیت یافتہ دہشت گردوں نے کی ہے اور ا
منصوبے کے مطابق انہوں نے پہلے عوام میں بے چینی پیدا کی۔ اس کے بعد عوام کی آڑ
حملہ کر کے تھانے کی عمارت کو عملے سمیت جلا کر خاک کر دیا۔

"آپ لوگوں نے جوابی کارروائی کیوں نہیں کی؟" ایک غیر ملکی اخبار نویس نے سگر
کا لمبا کش لگا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے کرتے؟ کیا ہم اپنے بے گناہ عوام کو مار ڈالتے؟ ہرگز نہیں۔ وہ لوگ عوام کی
میں اپنا کام کر کے نکل جاتے اور سیدھے سادے' بھولے بھالے دیہاتی مارے جاتے جیسے
اگلے روز سی آر پی کے ساتھ ہوا۔ تخریب کاروں اور سی آر پی کے درمیان جم کر دو
فائرنگ ہوتی رہی اور فرار ہونے سے پہلے انہوں نے ہجوم پر اندھا دھند گولیاں برسائیں
تمام مقتولین کی ذمہ داری سی آر پی پر ڈال دی جائے اور آپ نے دیکھا وہ اپنے مقصد
کامیاب رہے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی آر پی فائرنگ کی زد میں بھی کوئی بے گناہ
ہو گا لیکن آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ان حالات میں اور کیا ہو سکتا تھا۔ کیا عوام کے ساتھ
اب پولیس کو بھی ان تخریب کاروں کے آگے پھینک دیا جائے؟ پھر ہمارا تو مشن ہی جد
سیوا ہے۔ اگر اس میں جان بھی چلی جائے تو کچھ پروا نہیں۔ میں اپنے کسی جوان کی مو

بوجھ اپنے دل پر لے کر اس دنیا سے نہیں جا سکتا اور آپ یاد رکھئے! ہم تخریب کاروں کو
چھوڑیں گے نہیں۔ آج ہی سے ہم ایک بڑے آپریشن کا آغاز کرنے والے ہیں۔ ہم نزدیکی
دیہات کے چپے چپے کی تلاشی لے کر انہیں خفیہ کمین گاہوں سے باہر نکالیں گے اور عدالت
کے سامنے پیش کریں گے۔ تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور امن قائم ہو سکے۔"

ایس پی مٹھو رام کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ اخبار نویسوں کی ڈائریوں اور دستی ٹیپ
ریکارڈرز میں منتقل ہو رہا تھا۔

ان لوگوں کو بھارتی محکمہ اطلاعات نے ایک خصوصی چارٹر طیارے کے ذریعے جالندھر
ایئرپورٹ پر پہنچایا تھا جہاں سے پھر انہیں کاروں کے ذریعے یہاں تک لایا گیا اور اس سے
پہلے کہ وہ تنقیدی سوالات کا آغاز کریں' پریس کانفرنس میں موجود انٹیلی جنس کے کارندوں
نے جو ان کے ساتھ "میزبانوں" کے روپ میں موجود تھے' "ڈرنک' ڈرنک----" الاپنا
شروع کر دیا۔

پولیس ہیڈکوارٹرز کی عمارت کے ایک خاص کمرے میں اخبار نویسوں کے لئے "ڈر نکر"
انہیں "سرو" کرنے والے پولیس آفیسر اپنی مسکراہٹوں کے ساتھ موجود تھے۔ "ڈر نکر" کے
خاتمے پر ان لوگوں کو پرلطف لنچ کے لئے ہوٹل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ایس پی مٹھو رام
ایک ایک اخبار نویس سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے انہیں رخصت کر رہا تھا۔ ہر اخبار
نویس سے وہ "خدمت" میں کوئی کمی رہ جانے پر "معافی" بھی اس کے ساتھ ہی مانگ لیتا۔

ہوٹل سے ایئرپورٹ کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے تمام "اخبار نویس" ذہنی طور پر
"کلیئر" ہو چکے تھے۔ اسی روز شام کو انہوں نے اپنے اپنے ملک کو "تخریب کاروں کے
ہاتھوں پولیس اسٹیشن کی تباہی اور پانچ پولیس ملازمین کو زندہ جلا دینے" کی خبریں جاری کر دی
تھیں۔ قریباً" ہر اخبار نویس نے مٹھو رام کی طرف سے اس عندیے کا بھی شدت سے اظہار
کر دیا تھا کہ تمام تر کارروائی ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کی گئی ہے اور اس میں ہمسایہ
ملک سے تربیت حاصل کرنے والے تخریب کار ملوث تھے۔

نور محل میں "سی آر پی" کے ہاتھوں مارے گئے بے گناہ لوگوں کی موت کی ذمہ داری
بھی "تخریب کاری" کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔

ooo

اسی روز شام گئے پولیس نے اپنے "آپریشن" کا آغاز بھی کر دیا۔ مٹھو رام کی زیر قیادت
پولیس کے بھیڑیوں نے اردگرد کے دیہات میں تباہی مچا دی۔ شاید ہی کوئی ایسا نوجوان لڑکا ہو

جس کو انہوں نے وحشیانہ انداز میں گاؤں والے کے سامنے تشدد کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ تخریب کاروں کی تلاش کے بہانے پولیس والے دندناتے ہوئے گھروں میں گھس جاتے اور اپنی مرضی کی اشیاء اٹھا کر جیبوں میں ڈال لیتے' عورتوں کی عصمت دری ان کے مردوں کے سامنے کی گئی اور درجنوں نوجوانوں کو رات گئے تک پولیس کے جوان "مشتبہ تخریب کار" ہونے کے شک میں جالندھر کی پولیس لائن میں جمع کر چکے تھے۔

وہ رات نور محل اور اس کے گرد و نواح میں واقع دیہات پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ زخم خوردہ لوگ سسکتے رہے' بلکتے رہے۔ جن بہنوں کے بھائی' سہاگنوں کے سہاگ' ماؤں کے لال پولیس اغوا کر کے لے گئی تھی' ان کے نالہ و شیون سے آسمان کا کلیجہ شق ہو گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ جانے والوں میں سے کوئی قسمت والا ہی اب کبھی اپنے گھر کو واپس آئے گا۔

موت کا شکنجہ

"منڈ" میں چھپے کیپٹن امریک سنگھ کو ایک ایک لمحے کی رپورٹ مل رہی تھی۔ جب دوپہر کے بعد نوجوو سنگھ کا بھائی اس کے لئے کھانا لے کر پہنچا تو امریک سنگھ نے ایک لقمہ بھی منہ کو نہ لگایا۔

"چھندے! جب تک میں مٹھو رام کو اس کے انجام تک نہ پہنچا دوں' مجھ پر کھانا حرام ہے۔" اس نے ایک عزم کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔

"لیکن ویر جی! اس وقت تو ادھر مت جانا' موت کو خواہ مخواہ دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ علاقے کے چپے چپے پر پولیس کتوں کی طرح آپ کی بو سونگھتی پھر رہی ہے۔"

"کچھ بھی ہو' آج فیصلے کا دن ہے۔ آج ہم دونوں میں سے ایک رہے گا۔ چھندے! کل کا سورج ہم دونوں پر طلوع نہیں ہو گا' یا اس کا منہ مٹھو رام دیکھے گا یا پھر میں۔" وہ اپنے فیصلے میں اٹل تھا۔

"دیکھو ویر جی! ضد نہ کر۔ تو حالات کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے سینوں میں بھی الاؤ دہک رہے ہیں لیکن ہم نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی ہے' بس کوئی پل جاتا ہے کہ ہم مٹھو رام کی اکال چلنا کروا دیں گے۔ ابھی وہ گھڑی نہیں آئی امریک سیہاں!"

"وہ گھڑی آ گئی ہے چھندے۔ رب راکھا۔"

چھندا اسے روکتا ہی رہ گیا۔

امریک سنگھ نے اپنی پگڑی سر سے اتار کر ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے تھیلے میں ڈال لی تھی' اس کا واحد اثاثہ ایک پستول کی صورت اس کے کرتے کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ جب چھندا بھاگم بھاگ اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ کر اپنے ساتھیوں کو یہ خبر سنا رہا تھا تو امریک سنگھ اپنی منزل کے بہت نزدیک پہنچ چکا تھا۔

اس نے جان بوجھ کر لمبا لیکن محفوظ راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ اسی علاقے میں پل کر جوان ہوا تھا اور یہاں کے موسموں اور راستوں سے اس کی آشنائی بہت پرانی اور گہری تھی۔ وہ

جانتا تھا کہ اس وقت مٹھو رام کہاں ہو سکتا ہے؟

شہر کے ایک ماڈرن علاقے میں موجود اپنی کوٹھی میں بیٹھا ایس پی مٹھو رام ٹیلی فو
اعلیٰ افسران کو اپنی "بین الاقوامی کارکردگی" سے آگاہ کر کے ان سے مبارکبادیں وصول کر
تھا۔ واقعی جس چالاکی سے اس نے بین الاقوامی پریس کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی
اسی کا حصہ تھا۔ مٹھو رام کے سامنے ایک خوبصورت اخروٹ کی لکڑی سے بنی میز پر
دھرا تھا۔ ٹیلی فون پر دوران گفتگو وہ ایک ایک گھونٹ کو دو آتشہ بنا کر حلق میں انڈیلتا ج
تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔

مٹھو رام اپنی خواب گاہ میں آرام دہ مسہری پر لیٹا ہی تھا' جب سرہانے رکھے فون
گھنٹی ٹرانے لگی۔ مٹھو رام نے بڑے اعتماد سے اور انتہائی نیک تمناؤں کے ساتھ فون اٹ
تھا لیکن دوسری طرف سے ملنے والے پیغام نے اسے قدرے پریشان کر دیا۔۔۔۔ اس
ایک ایس ایچ او نے بیک وقت شہر کے تین پٹرول پمپوں میں آگ لگنے کی اطلاع دی تھی

"بے وقوف یہ میرا گھر ہے فائر بریگیڈ کا آفس نہیں۔" اس نے اپنے تھانیدار کو ڈانٹا

"سر! اعلیٰ افسران موقع پر پہنچ چکے ہیں' تخریب کاری کا شبہ ہے۔" دوسری طرف سے
ملنے والی اطلاع نے اس کے موڈ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ولایتی شراب کا ہلکا ہلکا سرور جس
اس کو قدرے مسرور کر رکھا تھا' ایک ہی جھٹکے سے اتر گیا۔۔۔۔!

"میں آ رہا ہوں۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مٹھو رام نے وردی پہننے میں خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنے افسران کے سامنے
خود کو ہمیشہ "آن ڈیوٹی" ظاہر کیا کرتا تھا۔ گھر کے برآمدے سے نکل کر وہ پائیں باغ کی روش
پر چلتا گیراج کی طرف جا رہا تھا' جب اندھیرے میں اچانک ایک ہیولا اس کے سامنے تن کر
کھڑا ہو گیا۔

وہ بمشکل چند فٹ کے فاصلے پر لگی پھولدار بیل میں سے برآمد ہوا تھا۔ کھڑے ہونے
انداز بتا رہا تھا کہ یہ کوئی عام قسم کا "تخریب کار" نہیں ہے۔ پستول کی نال مٹھو رام کی طرف
اٹھی ہوئی تھی اور نووارد نے منہ پر نقاب باندھ رکھا تھا۔

"کون ہو تم۔۔۔۔؟" اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"تمہاری موت۔۔۔۔!" جواب دینے والے کا سرد لہجہ مٹھو رام کو اپنی ہڈیوں میں
سرایت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک جھرجھری لے کر وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمہاری موت!" پھر وہی جواب ملا۔

"بے وقوف نہ بنو! تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔" اس نے اپنی دانست میں
آنے والے کو خوفزدہ کرنا چاہا۔

"بے وقوفی تم کر رہے ہو مٹھو رام! فضول دھمکیاں دے کر۔ تم جانتے ہو میں تخریب
کار ہوں لیکن ادھر کا نہیں "ادھر" کا تربیت یافتہ ہوں۔ ہاں مٹھو رام مرنے سے پہلے میرا نام
سن لو۔ میرا نام کیپٹن امریک سنگھ ہے۔ میں نور محل کے سرداروں کا بیٹا ہوں مٹھو رام۔ تم
مجھے اچھی طرح جانتے ہو' مجھے "تخریب کاری" کی تربیت بھارتی فوج نے دی ہے۔ میں نے
بنگلہ دیش میں بہت تخریب کاری کی ہے۔ سوچا آج تم پر بھی اپنا تجربہ آزما لوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ کرنل بخشی میرا دوست ہے' میں تمہیں معافی دلوا دوں گا۔ اپنا
کیریئر تباہ نہ کرو۔" اس نے امریک سنگھ کے سامنے چارہ پھینکا۔

"میں تمہیں پستول کی گولی سے نہیں ماروں گا مٹھو رام۔ مجھے آدمی کی ہلاکت کے بہت
ڈھنگ آتے ہیں۔ تمہاری گردن کو جھٹکا لگے گا اور تمہاری چھٹی۔" امریک سنگھ اس سے بڑا
ماہر نفسیات تھا۔

"دیکھو تم پاگل ہو گئے ہو' تمہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔" مٹھو رام بولا۔

"ہاں! بلاشبہ میں ہی نہیں' تمہارے کالے کرتوت نے میری ساری قوم کو پاگل کر دیا ہے
اور اسی پاگل پن نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں۔ ہاں مٹھو
رام! تمہارے گناہ اتنے سنگین ہیں کہ میں تمہیں پستول کی گولی سے مار کر تمہیں ہیرو نہیں
بننے دوں گا۔ میں تمہیں سسکا سسکا کر بیچارگی اور لاچاری کی موت دوں گا۔ میں تمہیں نشان
عبرت بنا کر چھوڑوں گا مٹھو رام۔ مرتے وقت تمہارے دل میں حسرت ہی رہ جائے گی کہ
تمہیں اتنی گھٹیا موت کیوں ملی تھی۔"

کسی غیر شعوری عمل کے تحت مٹھو رام نے اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھایا ہی تھا لیکن
اچانک ایک برق سی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور دوسرے ہی لمحے ہوا میں اڑتا ہوا
امریک سنگھ اس پر آ رہا۔ مٹھو رام نے اپنی پولیس تربیت کو آزماتے ہوئے اسے خود سے
الگ کرنا چاہا لیکن اسے ایک فیصد کامیابی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے چاہا کہ چلا کر کسی کو خبردار
کرے لیکن اس کی اجازت دینے کے لئے امریک سنگھ تیار نہیں تھا۔ اگر وہ گولی ہی چلا دیتا تو

کوٹھی کے باہر موجود گارڈز اس کی مدد کو پہنچ جاتے۔ اسی لئے تو اس نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ مٹھو رام کی توند پر بیٹھے امریک سنگھ نے اپنے آہنی شکنجے کو اس کی گردن کے گرد کس دیا تھا۔ اس کی انگلیوں کا حلقہ مٹھو رام کے حلقوم پر تنگ ہو رہا تھا اور مٹھو رام کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ جانے کمبخت نے کون سی رگ دبا دی تھی کہ مٹھو رام کو اپنا سارا بدن پہلے ہی سے بے حس اور بے جان محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی مدافعت بمشکل دو منٹ میں دم توڑ گئی۔

امریک سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے چہرے کو اس نے دوبارہ پہلے کی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ کسی مستعد لنگور کی طرح وہ دوسرے ہی لمحے جس طرح کوٹھی کی دیوار پھلانگ کر ایک درخت کے ذریعے اندر کودا تھا' اسی درخت کے ذریعے وہ دیوار پر پہنچ گیا اور پھر دیوار پھلانگ کر دوسری طرف اتر گیا۔

ooo

صبح اخبارات کی سرخیاں چیخ چیخ کر ایس پی مٹھو رام کی موت کا نوحہ الاپ رہی تھیں۔ شہر میں پٹرول پمپوں کو آگ لگنے کے واقعات کا سلسلہ کسی تربیت یافتہ تخریب کار سے جوڑا جا رہا تھا۔ پولیس حلقوں نے ایس پی مٹھو رام کی موت کو حادثاتی قرار دیا تھا لیکن کوئی بھی اس مضحکہ خیز توجیح کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ اس موت کے پس پردہ محرکات کیا ہیں؟ اخبارات کے نمائندے بہت دور کی کوڑی لائے تھے اور جب دو تین روز بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا افشاء کسی طرح ہوا تو گویا ایک کھلبلی سی چار سو مچ گئی۔ لوگوں نے واقعتاً" جان لیا کہ "تخریب کار" خاصے منظم اور تربیت یافتہ ہیں۔ فوجی ماہرین نے بتایا تھا کہ یہ موت کسی تجربہ کار کمانڈو کے ہاتھوں واقع ہوئی ہے اور فوج کی انٹیلی جنس کو یقین ہو گیا تھا کہ کیپٹن امریک سنگھ اسی علاقے میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس کی تلاش کے لئے ملٹری انٹیلی جنس کا جال چاروں طرف پھیلا دیا گیا۔

امریک سنگھ نے رات نور محل کے قرب و جوار میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ فیصلہ منسوخ کر دیا اور اب وہ جالندھر سے دور ہی دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ کچھ عرصے کے لئے بالکل ہی روپوش ہو گیا۔ بس ایک دیوندر سنگھ تھا جس کے ذریعے اس کا رابطہ حریت پسندوں سے بحال تھا۔ اس کے ہاتھوں کبھی کبھی امریک کو اپنے گھر والوں کی خیر خیریت معلوم ہو جاتی۔

اس کی گرفتاری کے لئے پولیس نے اس کے گھر والوں پر ہر غیر انسانی حربہ آزما لیا تھا۔

انٹیلی جنس والوں نے وہ وہ گھناؤنے طریقے اختیار کئے تھے کہ دور نزدیک دیہاتوں کے لوگ پناہ مانگتے تھے لیکن امریک کا باپ بھی کسی جاٹ کا جنا تھا۔ کیا مجال جو کبھی اس کے پائے ثبات میں لرزش آئی ہو۔ اس نے ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹائے اور خود کو کسی حد تک محفوظ کر لیا تھا۔ مقامی سیاسی حلقوں میں اس کی عزت کی جاتی تھی اور عوامی ہمدردی کے حصول کے لئے ہی کبھی کبھی اکالی دل کے مقامی اور صوبائی راہنما بھی اس کے گھر کا چکر لگا کر ایک آدھ بیان اس کے حق میں اور پولیس کی مذمت میں جاری کر دیا کرتے تھے۔ فی الوقت وہ اس اخلاقی سہارے کو ہی خدا کی خصوصی عنایت سمجھ رہا تھا۔

دیوندر کے ذریعے ہی ایک روز امریک کو پیغام ملا کہ اس کے والد نے امریک کو بھارت سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں وہ ایک گروہ سے رابطہ بھی قائم کر چکا ہے جو بھگوڑے فوجی افسران کی جان بچانے کے لئے سرگرم عمل ہے۔

ooo

اس روز جب دلی کے ایک گوردوارے میں اس کی ملاقات اپنے باپو سے ہوئی تو امریک سنگھ لاکھ ضبط کے باوجود بھی سسک پڑا۔ یہ روگ اس کی جان کو آ گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی "ارتھی" کو کندھا بھی نہیں دے سکا۔

"چپ کر جا امریک سیہاں' چپ کر جا! اگر تو بھی دل ہار گیا تو میں زندہ کیسے رہوں گا؟"

"باپو وہ میری خاطر مارا گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔" امریک سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں بچہ! تو نے مٹھو رام کو "گاڑی چڑھایا" ہے۔ تو نے اپنے ایک بھائی کا نہیں ہزاروں بھائیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر رہے گا کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ بس ایک بات یاد رکھنا' ہم اب تیری زندگی سے ہی زندہ ہیں۔ اب ہمارا واحد سہارا اور امید تو ہی ہے۔ بچہ دل نہ ہارنا! ہم سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ نور محل تھانے کا کون سا ایسا گاؤں ہے جس نے پنتھ کو کوئی "شہید" نہ دیا ہو۔ تو جانتا ہے نوجود سنگھ کی عمر کیا تھی؟ اٹھارہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ امریک سیہاں! یہ تو جوانیاں ماننے کی عمر ہے' مرے کی نہیں۔ وہ بھی چلا گیا۔ تیرے بچپن کے ساتھی ایک ایک کر کے "سکھی صدق" نبھا گئے۔ اب جو باقی ہیں وہ میدان جنگ میں لڑ رہے ہیں۔ بچہ! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تو یہاں رہ کر ان کی کمانڈ کرے لیکن سب کا فیصلہ ہے کہ تو ابھی کنارہ کر جا۔ تیری یہاں سے زیادہ وہاں ضرورت ہے جہاں تو جا رہا ہے۔"

باپ بیٹا جانے کب تک باتیں کرتے رہے' جب کیرتن شروع ہو گیا۔

جو تدھ بھاوے سو ہی کراوے
موہے سیانپ کچھو نہ آوے

ترجمہ: (اے خدا! جو تجھے بہتر لگتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ میری عقل تیرے کام سمجھنے سے قاصر ہے)

ooo

رخصت ہونے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے کو پاسپورٹ اور غیر ملکی کرنسی دے کر باقی معاملات سمجھا دیئے تھے۔ جو نوجوان اس کے ساتھ یہاں آیا تھا' اس نے الگ ہونے سے پہلے امریک کے باپو کو اپنا اگلا ٹھکانہ بتانے سے احتراز برتا تھا۔ اب اسے چند روز بعد اپنی ماں سے ملنا تھا اور پھر اس دیس سے رخصت ہو جانا تھا۔

امریک کے باپو کو اسی کے ہمراہی نوجوان نے ہدایت کی تھی کہ وہ امریک کی ماں کو اگلے روز ان لوگوں کے فراہم کردہ ایک ایڈریس پر روانہ کر دے جہاں سے اسے سیکورٹی کی نظروں سے بچا کر یہاں تک لایا جائے گا۔ اس کا باپو نوجوانوں کے انتظامات کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ جو اسے تین مختلف ٹھکانوں پر لے جا کر یہاں تک لائے تھے۔ انہوں نے امریک سے اس کی ملاقات تب کروائی تھی جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب انٹیلی جنس والے اس کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔ امریک کے باپو کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

ماں سے ملاقات اس کی زندگی کا سب سے تلخ اور جان لیوا تجربہ تھا۔ ایک مدت کے بعد دونوں ماں بیٹا ملے تھے اور وہ بھی ان غیر معمولی حالات میں۔ اس کی ماں نے اپنے خاوند کی ہدایت کے مطابق انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا' وہ بالآخر ماں تھی۔

پھٹ پڑی----!

اس نے امریک سنگھ کو اتنی بار چوما تھا کہ اسے اپنے بدن کے رونگٹے روئیں روئیں میں بوڑھی ماں کی ممتا سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی رگوں میں نومولود بچوں کی طرح ماں کا دودھ سرسرانے لگا تھا۔

دم رخصت دیوانہ وار ایک ٹک اپنے لاڈلے کو دیکھتی رہی۔ اپنی آنکھوں میں آتی نمی کو بار بار وہ اپنے موٹے سوتی دوپٹے کے پلو سے پونچھ لیتی تاکہ آخر وقت تک اپنے بیٹے کی شبیہہ اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لے۔ خود امریک سنگھ کی آنکھوں کی پتلیاں جیسے ساکت ہو

کر رہ گئیں۔ وہ اس خوف سے آنکھیں نہیں جھپک رہا تھا کہیں ایک لمحے کے لئے ماں کی صورت دیکھنے سے محروم نہ رہ جائے۔

یہ رخصت کی گھڑی تھی۔

ملاپ کا آخری منظر تھا۔

اس جان لیوا وصال نے اس کے دونوں ہمراہیوں کو بھی رلا دیا تھا۔ بڑے جبر اور حوصلے سے انہوں نے آخری "ارداس" کی۔ گیانی کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چلی تھی لیکن یہ دیکھ کر وہ سب حیران ہی تو رہ گئے کہ "ارداس" کے آخر میں بلند ہونے والے "جے کارے" میں سب سے نمایاں آواز امریک سنگھ کی ماں کی تھی۔

جب آخری مرتبہ اس نے جھک کر ماں کے قدموں کو چھوتے ہوئے اس کا "آشیرواد" لیا تو اس کی ماں نے بڑے حوصلے سے اسے سینے سے چمٹا کر "رب راکھا" کہا اور منہ دوسری طرف پھیر کر اس نوجوان کے ساتھ چل دی جس نے اسے واپس گھر تک پہنچانا تھا۔

"امریک یہاں جیوندیاں وے میلے!" اس کی ماں کے ہمراہ جانے والے نوجوانوں نے ان سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔ "اب اگلی ملاقات "اکال پرکھ" (اللہ تعالیٰ) کے دربار میں ہو گی۔"

ooo

تیسرے روز اس کی فلائیٹ تھی۔

ہوائی اڈے پر اسے الوداع کہنے کوئی اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ انتہائی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ امریک سنگھ کو جو پاسپورٹ مہیا کیا گیا تھا' اس پر چونکہ پہلے ہی سے تین ویزے لگے ہوئے تھے اس لئے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ یہ اندازہ لگانے میں اسے دیر نہیں لگی تھی کہ یہاں سیکورٹی کا کتنا کڑا نظام ہے اور بھارتی ہوائی اڈے سے جانے والا کوئی بھی شخص ان لوگوں کی کڑی نظروں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس نے قیاطاً" ایک لفظ بھی پنجابی زبان میں ادا نہیں کیا اور کسٹم سے امیگریشن تک ہر جگہ انگریزی ہی میں بات کی تھی۔

جب تک جہاز بھارت کی فضا سے باہر نہیں نکل گیا' وہ غیر مطمئن رہا۔ یہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ممکن تھا۔ جیسے جیسے جہاز لندن کے قریب ہو رہا تھا' وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ جانے کتنے عرصے بعد آج ایئر انڈیا کے جہاز کی اکانومی کلاس میں اپنی سیٹ پر بیٹھے امریک سنگھ نے ایک شاندار نیند کا مزہ لیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر جہاز چھوڑنے سے پہلے کسی بھی

پیش آمدہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

○○○

کھانا ان کے سامنے رکھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ جب ستنام سنگھ کی بیوی کافی دیر بعد اس طر
آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دونوں نے بمشکل چند لقمے ہی اپنے حلق میں اتارے تھے۔

"فی الوقت تو مصیبت ٹل گئی ہے دوست' لیکن ہم محفوظ نہیں ہیں۔ یہاں بھی ہم ز
محفوظ ہیں۔ ایک ایک قدم احتیاط سے پھونک پھونک کر اٹھانا ہو گا۔ یہاں قدم قدم پر آستی
کے سانپ اپنے پھن پھیلائے بیٹھے ہیں' کچھ پر ہماری نظر ہے اور بہت سے نظروں سے
اوجھل ہیں----!

ایک لمحے کے لئے اس نے رک کر اپنی گھر والی کی طرف دیکھا جو ان سے مزید ہدایا
کی طالب وہاں کھڑی تھی۔

"کافی بنا لاؤ' یہ بہت شوق سے پیتا ہے۔" اس نے امریک کی طرف اشارہ کیا اور ستن
کی بیوی رسوئی کی طرف چلی گئی۔

"دوست سامراج نے اپنا چہرہ ضرور بدل لیا ہے لیکن اس کا کردار وہی ہے جو آج سے
سو سال پہلے تھا۔ اپنے معمولی اور گھٹیا مفادات کے لئے یہ لوگ انسانیت کش اقدامات پر اُ
جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو محض چند ہیلی کاپٹر بھارت کے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے انگر
نے اپنے سارے اصول اور آدرش بالائے طاق رکھ دیئے ہیں۔ یہ لوگ کہاں تک گر گ
ہیں میں تمہیں کچھ بتا نہیں سکتا۔ انسانی جان کی قیمت ان کے نزدیک کیا ہے شاید کیڑ
مکوڑے جتنی بھی نہیں۔ اگر دنیا کے سمندروں میں کسی جگہ موسمی تغیر و تبدل سے مچھلیاں
مرنے لگیں تو یہاں جانوروں کی فلاح و بہبود کی دعوے دار تنظیمیں احتجاجی مظاہرے شروع
کر دیتی ہیں۔ یہ لوگ برف میں پھنسے کسی کتے کو بچانے کے لئے ہوائی جہازوں کے ذریع
کمک بھیج دیتے ہیں لیکن وہاں بھارت میں ہندو سامراجیت کے ہاتھوں روزانہ درجنوں لوگ
مر رہے ہیں' اس پر یہ کبھی احتجاج نہیں کرتے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹوں پر ان کے
اخبارات بہت سا تبصرہ تو کر دیتے ہیں لیکن حکومت کی پالیسی نہیں بدل سکتے۔ یہ لوگ بھ
ہیں کہ حقائق کو ان کی عینک سے دیکھا جائے۔"

"مجھے احساس ہے ستنام سنگھ۔ میں جانتا ہوں تم حالات پر کتنی گہری نظر رکھتے ہو۔
نے وہاں جو کچھ کہا وہ دن کی روشنی کی طرح سچ ہو گیا لیکن ستنام یہاں میں یہاں چھپنے
جان بچانے کے لئے نہیں آیا۔ مجھے صرف یہ کہا گیا تھا کہ میری وہاں سے زیادہ ضرورت

یہاں ہے اور میں یہاں چلا آیا۔ لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھوں گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے جو وحشتناک منظر دیکھے ہیں' اس کے بعد زندگی ہر سانس میرے لئے نیا عذاب لے کر آتی ہے۔"

اس کے چہرے کی رنگت نے ستنام سنگھ کو احساس دلا دیا تھا کہ امریک سنگھ بدلا ہوا انسان ہے اور اس کی توقع سے بڑھ کر حقائق کا ادراک بھی رکھتا ہے۔

"فی الحال تم آرام کرو۔ آج رات تمہارا قیام یہیں رہے گا۔ علی الصباح تمہارا ٹھکانہ بدلنا پڑے گا۔ شکاری کتے تمہارے تعاقب میں ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق تمہارے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد سکاٹ لینڈ یارڈ کے لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ تم بہت خوش قسمت ہو امریک سنگھ!"

"اس کا مطلب ہے پشپا واقعی.....!" وہ ادھوری بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کون پشپا؟ وہی دہلی والی؟" ستنام کو جانے وہ کیسے یاد رہ گئی تھی۔

"ہاں وہی۔ اس نے شاید مجھے پہچان لیا ہے۔ ایمسٹرڈم پر وہ اچانک ہی مجھ سے ٹکرائی تھی۔ وہ یہاں بھارتی سفارت خانے میں ملازم ہے۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا تھا----" امریک سنگھ نے اسے سارے واقعات سے آگاہ کر دیا۔

"اوہو تو یہ وہی پشپا رانی ہے جسے "را" نے نئی رابطہ افسر بنا کر بھیجا ہے۔" ستنام کو کچھ یاد آ رہا تھا۔

"ہاں شاید اس کا یہی مشن تھا۔ اس کے علاوہ میں کسی اور پر شک نہیں کر سکتا۔ میرے متعلق یہاں بھارتی سفارت خانے کو صرف وہی خبردار کر سکتی ہے اور تو میرا کسی سے تعارف ہی نہیں ہوا۔"

"ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہو گا۔" ستنام سنگھ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ٹیلی فون پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف فون اٹھانے پر ان کا آپس میں صرف چند فقروں کا تبادلہ ہی ہوا تھا۔ پھر اس نے فون رکھ دیا۔ امریک سنگھ اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہمیں ابھی ایک چھوٹے سفر کی تیاری کرنی ہے۔ تم ذرا کپڑے بدل لو۔"

اس نے امریک سنگھ کی دوسرے کمرے کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

اس مرتبہ امریک نے نہ صرف مقامی طرز کے کپڑے پہن لئے تھے بلکہ چہرے پر سفید شیشیوں کی عینک بھی لگا لی تھی۔ کالج کے زمانے میں سٹیج ڈراموں میں کچھ نہ کچھ کام تو ہی

رہی تھی۔ ستنام نے اپنی بیوی کو کچھ سمجھا دیا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اب گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ امریک خالی ہاتھ تھا جب کہ ستنام نے ایک بیگ میں اس کے لئے ضروریات کی کچھ چیزیں رکھ لی تھیں۔ یہ بیگ وہ نہیں تھا جو امریک اپنے ساتھ بھارت سے لے کر آیا تھا۔ اس کا بیگ ہی نہیں کپڑے بھی تبدیل شدہ تھے اور اگلے چند روز میں اس کی شناخت بھی تبدیل ہونے والی تھی۔ وہ لوگ امریک سنگھ کی زندگی کی ڈور "را" کو تھمانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔

دونوں پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ دونوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ قریباً" پندرہ بیس منٹ پیدل چلنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا تھا کہ کوئی ان کا تعاقب نہیں کر رہا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر ستنام نے بوتھ سے کہیں فون کیا اور امریک کے ساتھ نزدیکی "انڈر گراؤنڈ" سٹیشن میں پہنچ گیا۔

ooo

بمشکل پانچ منٹ بعد ہی وہ لندن کی انڈر گراؤنڈ ٹرین پر محو سفر تھے۔ اس سفر کا خاتمہ "یوسٹن" پر ہوا۔

دونوں مختلف سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انٹر سٹی ریلوے کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ پلیٹ فارم پر بنی ایک چھوٹی سی کیبن کے ایک کونے میں رکھی خالی میز کے نزدیک دھری ایک کرسی پر ستنام نے بیگ رکھ دیا اور خود "سیلف سروس" پر پہنچ کر کافی کے دو کپ تیار کر کے لے آیا۔ کافی پیتے ہوئے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے' پھر اچانک ہی دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

دونوں اب خود کو خاصے پرسکون محسوس کر رہے تھے۔ کافی کے خاتمے پر دونوں چونکے جب اچانک ہی نزدیکی بک اسٹال کے ایک کونے سے وہی شخص برآمد ہوا جو امریک کو ہیتھرو سے لایا تھا۔

"ہیلو----!" خورشید نے گرمجوشی سے امریک سے مصافحہ کیا تھا۔

"ہماری ٹرین اب سے پندرہ منٹ بعد رخصت ہونے والی ہے۔" خورشید نے ٹکٹ اسے دکھاتے ہوئے اعلان کیا۔

"چلیں پھر!" امریک نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ تو گھبرا ہی گیا تھا۔ صرف پندرہ منٹ باقی تھے اور وہ ابھی تک یہاں بیٹھے تھے۔

"ارے نہیں! بھائی صاحب یہ انڈیا نہیں ہے جہاں تین گھنٹے پہلے سے پلیٹ فارم پر ڈیرہ

لگا کر بیٹھنا ہوتا ہے۔ یہاں تو ٹرین کے دروازے ہی صرف تین منٹ پہلے کھلتے ہیں۔" خورشید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اوہو!" امریک نے لمبی سانس لی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ستنام سے رخصت ہو رہا تھا۔ خورشید نے ستنام کو یہیں سے واپس لوٹ جانے کو کہا تھا۔ ستنام نے اسے تسلی دے دی تھی کہ اس کے بحفاظت پہنچنے کی اطلاع اس کے والدین کو بھارت میں مل چکی ہے۔

خورشید کے ساتھ چلتا ہوا وہ نزدیکی پلیٹ فارم تک گیا جہاں ٹرین روانگی کے لئے تیار تھی۔ ان کی منزل اب برمنگھم تھی جہاں اسے اپنی نئی شناخت کے ساتھ قیام کرنا تھا۔ فی الوقت اسے خود کو مسلمان کی حیثیت سے متعارف کروانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ برمنگھم کے کشمیری آبادی والے علاقے "ایلم راک" کے ایک چھوٹے سے مکان میں خورشید اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی جب وہ ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے گھر پہنچا۔

اس نے گھر پہنچتے ہی امریک کی راہنمائی گیسٹ روم کی طرف کی۔ کمرے میں پہلے ہی سے روشن ہیٹر نے فضا کو خاصا گرما رکھا تھا۔ سردی جو امریک کو اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی' کا زور ٹوٹنے لگا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی وہ اپنے گھر پہنچ گیا جہاں اس کی بوڑھی ماں' باپو اور بہن اس کی خوشحال زندگی کے لئے ارداس کر رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ کروٹیں بدل کر خود کو موجودہ ماحول سے آشنا کرواتا رہا۔

رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب خورشید صبح کی نماز کے لئے اٹھا تو امریک گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے امریک کو جگانا مناسب نہ جانا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس نوجوان کی آمد بہار کا جھونکا ثابت ہو گی اور اگر قدرت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو ان کے ساتھ ساتھ مجبور اور مقہور مسلمان بھی مقبوضہ کشمیر کی غلام فضاؤں میں آزادی کے نغمے الاپ سکیں گے۔

اس روز برمنگھم کی مسلم آبادی کے ایک کونے میں بنے اپنے مکان کے ایک کمرے میں خدا کے حضور سجدہ ریز خورشید کاشمیری کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو مصلّے میں جذب ہو رہے تھے اور وہ رو رو کر اپنے خدا کے حضور اپنی غلام قوم کی قسمت بدلنے کی التجائیں کر رہا تھا۔

چانکیہ کے چیلے

برمنگھم میں سوہو روڈ پر ہینڈز ورتھ کے علاقے میں بنے ایک شاندار بنگلے میں اس روز جشن کا سا سماں تھا۔ محفل ناؤ نوش جاری تھی۔ محفل اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی اور شراب کے نشے میں دھت خواتین و حضرات بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ جب میزبان مسٹر بخشی نے مہمان خصوصی کی آمد کا مژدہ سنایا۔

بخشی کو مقامی ہندو آبادی میں "وی آئی پی" کی حیثیت حاصل تھی خصوصاً" ا۔میسی کے لوگوں سے اس کے تعلقات کی وجہ سے وہ لوگ بھی جو عام حالات میں اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے' اس سے ملنے پر مجبور تھے۔ وہ مقامی ایشین سوسائٹی کا صدر اور ایک مندر کی کمیٹی کا صدر ہونے کے علاوہ یہاں کا بڑا بزنس مین تھا۔ اس کا کاروبار بھارت سے برطانیہ کے بہت سے شہروں میں پھیلا ہوا تھا اور مڈز لینڈ کے سوشل حلقوں میں اس کی پارٹیاں خاص شہرت کی حامل سمجھی جاتی تھیں۔

آج اس نے مقامی ایشین سوسائٹی کے اعزاز میں اپنے گھر پر "کاک ٹیل" پارٹی دی تھی جس میں بھارتی قونصلیٹ کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔

بخشی کی بیٹی کماری نیلما اور بیوی نے فوراً" آگے بڑھ کر قونصلیٹ کو خوش آمدید کہا تھا۔ دونوں نے قونصلیٹ سے مصافحہ کرنے میں ایک دوسرے سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ قونصلیٹ نے حال ہی میں ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ اس نے مسز بخشی اور نیلما کے حسن کے چرچے تو بہت سنے تھے لیکن آج دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ گنگرنی پرانا ڈپلومیٹ تھا اور گزشتہ بیس سال سے دنیا کے مختلف ممالک میں سفارتی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس نے دفتر خارجہ جوائن کرنے کے فوراً" ہی بعد خود کو خارجی دنیا کی ذمہ داریوں میں الجھا لیا تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔

گنگرنی نے غیر ملکی تعلیمی اداروں سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ وہ کبھی مشرقی حسن کا قائل نہ رہا تھا لیکن آج دونوں ماں بیٹی کو دیکھ کر اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ تو آج

تک جھک ہی مارتا رہا ہے۔ واقعی مشرقی حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

گنگرنی نے سب سے پہلے محفل میں دیر سے پہنچنے کی معذرت اس وضاحت کے ساتھ کی کہ راستے میں ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا' اس لئے معزز مہمانوں کو زحمت اٹھانا پڑی۔

مسٹر بخشی نے خود اس کے لئے "جام صحت" تجویز کیا تھا جس کے ساتھ ہی پیمانے آپس میں ٹکرائے اور ایک طوفان بدتمیزی وہاں در آیا۔ قونصلیٹ تو مسز بخشی اور کماری نیلما کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا تھا' پھر بخشی کی طرف سے کھانے کا اعلان ہوا اور نشے میں ڈگمگاتا ہجوم کھانے کی میز پر ٹوٹ پڑا۔

ایک علیحدہ کمرے میں خصوصی میز قونصلیٹ اور اس کے ہمراہ آنے والے کرنل مہتہ کے لئے سجائی گئی تھی' جہاں بخشی کی بیوی اور بیٹی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھیں۔ جب بخشی ڈائننگ ہال میں مہمانوں کی خاطر مدارت میں مصروف تھا تو اس کی بیوی اور بیٹی کرنل مہتہ اور قونصلیٹ گنگرنی کو "انٹرٹین" کر رہی تھیں۔ ماں بیٹی دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر بے حیائی کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور اس میدان کی منجھی ہوئی کھلاڑی ہونے کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔

یہ ان کا کمال فن تھا۔

دونوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ماں بیٹی ہیں بلکہ وہ ایک دوسری کی چھوٹی بڑی بہنیں نظر آتی تھیں۔ کرنل مہتہ کو تو ان کے تعارف سے فیض یاب ہونے کے متعدد مواقع مل چکے تھے جب کہ گنگرنی کے لئے یہ پہلا تعارف تھا۔

پہلی ہی ملاقات اتنی بھرپور تھی کہ وہ بے اختیار دونوں کو قونصلیٹ آنے کی دعوت دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دونوں نے بے حد شکریہ کے ساتھ یہ دعوت قبول کر لی تھی۔ اب گنگرنی اکیلا یہاں رہ گیا تھا جب کہ مہتہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"یہ خورشید کاشمیری کون ہے؟" اس نے بخشی کو کمرے کے ایک کونے میں لے جا کر پوچھا۔

"ہے ایک جنونی..... سالا کشمیر آزاد کروانا چاہتا ہے۔" بخشی کا طنز بڑا زہر آلود تھا۔

"نظر رکھو اس پر' آدمی کچھ زیادہ ہی چالاک بنتا جا رہا ہے۔" مہتہ نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔

"بے فکر رہو کرنل۔ جب کہو گے اس کا بھی....."

دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

"ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ بس ذرا یہ پتا لگاؤ آج کل اس کے ساتھ نیا آدمی کون رہتا ہے۔" مہتہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" بخشی نے اپنی وفاداری جتلائی۔

"جب ضرورت ہوئی تو ضرور تمہیں ہی زحمت دیں گے بخشی۔ تم ہمارے پرانے یار ہو اور ہم اپنے دوستوں کو کبھی چھوڑتے نہیں۔"

دونوں پھر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگے۔

کماری نیلما مہمانوں میں آ گئی تھی۔ اندر کمرے میں صرف گنگرنی اور بخشی کی بیوی ہی رہ گئے تھے جس نے گنگرنی کی توقع سے بڑھ کر اس کی پذیرائی شروع کر دی تھی۔ گنگرنی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مسز بخشی اس کے دل کی زبان پڑھنے پر مکمل قدرت رکھتی ہو۔ یہ عورت اس کے دل و دماغ پر چھانے لگی تھی۔ جب وہ فارغ ہو کر ڈائننگ ہال میں مہمانوں کو رخصت کرنے گیا تو خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مسز بخشی کے ساتھ اس کی سفارت کاری کا زمانہ بہت شاندار گزرے گا۔

ooo

رات کے دوسرے پہر قونصلیٹ یہاں سے دل پر پتھر رکھ کر رخصت ہو رہا تھا لیکن اسے امید تھی کہ اگلے ایک دو روز میں "قونصلیٹ" میں ان کی ملاقات ضرور ہو گی اور یہ ملاقات کتنی بھرپور ہو سکتی ہے؟ اس بات کے تصور ہی سے وہ خود کو نشے میں ڈوبتا محسوس کرنے لگا۔

دوسرے روز صبح دیر گئے جب بخشی اپنے آفس میں پہنچا تو اس نے سب سے پہلے اپنے ایک خاص آدمی کو فون کر کے طلب کیا تھا۔

"سر----!" دوسرے ہی لمحے ایک تنومند نوجوان وہاں موجود تھا۔

"درشن!"

"جناب!"

"خورشید کاشمیری پر نظر رکھو اور ہاں ذرا دیکھنا اس کے ہاں کون ٹھہرا ہوا ہے؟"

اس نے درشن کے چہرے پر نظر ڈالی۔

"جو حکم مائی باپ۔" درشن نے پالتو کتے کی طرح گردن جھکا رکھی تھی۔

"آج کل تمہارے آدمی کچھ سُست پڑتے جا رہے ہیں۔" اچانک ہی بخشی کے منہ سے

نکلنے والے الفاظ نے درشن کو چوکنا کر دیا۔

"نہیں حضور ایسا کیسے ممکن ہے؟" اس نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔

"ہے۔ درشن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خورشید کے ہاں کسی مشتبہ مہمان کی آمد کی خبر مجھ سے پہلے مہتہ کو کس طرح ہوتی۔" بخشی نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"شاید یہ ایک دو روز کی بات ہو گی جناب۔" اس نے صفائی پیش کی۔

"مجھے صفائی نہیں' کام چاہیے کام۔ تمہیں اسی کا معاوضہ ملتا ہے درشن۔ اور ہاں اس بات کا بھی کھوج لگانا کہ کرنل مہتہ نے اس علاقے میں کس کتے کی خدمات حاصل کی ہوئی ہیں۔"

"او کے باس۔" درشن نے قریباً" جھکتے ہوئے کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔"

درشن کی روانگی کے بعد بخشی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے صرف ایک ہی بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کرنل مہتہ آخر اس سے زیادہ "سمارٹ" ثابت کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے ذرائع کیا ہیں؟ کون لوگ ہیں وہ جو اس کے لئے کام کر رہے ہیں؟

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس علاقے میں کوئی خود کو اس سے زیادہ "وفادار" ثابت کر سکے۔ اس کی شان و شوکت کا راز اسی میں پنہاں تھا کہ بھارتی سفارت خانہ اس کی مٹھی میں رہے----!

خورشید نے اگلے ہی روز امریک سنگھ کو بتا دیا تھا کہ انڈین قونصلیٹ کو برمنگھم میں دی جانے والی دعوت میں بھارتی انٹیلی جنس کے کرنل مہتہ نے بھی شرکت کی ہے اور اس کی شرکت کسی مصلحت سے خالی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ درشن سے بخوبی آشنا تھا اور آج اس نے جب درشن کی گاڑی کو اس علاقے میں گھومتے ہوئے دیکھا تو وہ چونکا۔

"میرے خیال میں تمہیں چند روز کے لئے سیر کرنے سکاٹ لینڈ جانا ہو گا۔" اس نے امریک سے کہا۔

امریک جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

○○○

وہ اس سیر کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اسے فی الوقت اس منظر سے ہٹایا جا رہا تھا۔ شاید اس کے دوست ابتدائی مرحلے میں کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایک

مرتبہ سکاٹ لینڈ یارڈ اور "را" کے ہوشیار ہو جانے کے بعد اسے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ یوں بھی ابھی تک وہ "را" کے پھیلائے مقامی گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں سکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی خورشید کی گاڑی میں دونوں برمنگھم ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

گھر سے باہر نکل کر جیسے ہی وہ "ایلم راک" والی سڑک پر گھوما' اس نے اپنے سامنے لگے شیشے میں بخشی کی گاڑی اپنے تعاقب میں آتے دیکھ لی تھی۔ گاڑی درشن خود چلا رہا تھا۔ خورشید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"گدھے کا بچہ----!" وہ بڑبڑایا۔

"کون----؟" امریک نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"جو ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے۔"

دونوں بے اختیار ہنس دیئے۔

گاڑی چھٹنے میں بمشکل پندرہ منٹ باقی تھے اور خورشید کو احساس تھا کہ وہ اتنے تھوڑے وقت میں درشن کو ڈاج نہیں کر سکتا۔ دونوں کاریں اب کاؤنٹری روڈ پر دوڑ رہی تھیں۔ "سمال ہیتھ" کے نزدیک اس نے اچانک ہی ایک دکان کے سامنے کار کو بریک لگا دیئے اور امریک کا ہاتھ پکڑ کر اس میں داخل ہو گیا۔

"ولی! مہمان کو فوراً" سٹیشن پہنچاؤ۔" اس نے اندر موجود ایک سلز مین کی طرف دیکھ کر مختصر سی بات کی۔

"ٹھیک ہے۔"

ولی کے لئے شاید یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے امریک کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"خدا حافظ! جلدی ملیں گے انشاء اللہ۔" خورشید نے اپنا ہاتھ امریک کی طرف مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا' پھر امریک اپنے نئے ساتھی ولی کے ساتھ مکان کے بغلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ دو گلیاں انہوں نے قریباً" بھاگتے ہوئے طے کی تھیں جہاں ولی نے اپنی گاڑی پارک کر رکھی تھی۔ گاڑی اس نے بڑی پھرتی سے سٹارٹ کی تھی اور اب ایک شارٹ کٹ سے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پارکنگ وہیں میسر آ گئی۔ ولی نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے میں بھی ایسی ہی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا جس کا مشاہدہ اس سے پہلے امریک نے بخوبی کر لیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں قریباً بھاگتے ہوئے زمین ووز پلیٹ فارم تک پہنچے تھے۔ ایڈنبرا جانے والی ٹرین روانگی کے لئے تیار تھی۔ ولی نے اسے نزدیکی ڈبے میں داخل ہونے کے بعد اپنی سیٹ کا نمبر تلاش کرنے کی ہدایت کی تھی۔

انٹرسٹی ٹرین بھی شاید امریک کی منتظر تھی۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی اس نے رینگنا شروع کر دیا۔ اس اثناء میں وہ اپنی سیٹ کھوج چکا تھا اور اب اطمینان سے سیٹ پر ڈھیر ہوا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ بیگ اس نے اپنے سر پر موجود سامان کے لئے مخصوص جگہ میں ٹکا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس ڈبے میں بمشکل آٹھ دس سواریاں ہی بیٹھی تھیں لیکن ڈبہ اگر سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بھی ہوتا تو بھی ماحول اتنا ہی سنسان اور گھمبیر ہی ملتا۔

ہر شخص اپنا اپنا اخبار یا رسالہ ہاتھ میں پکڑے غرق مطالعہ تھا اور کسی کو کسی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ برمنگھم سے ٹرین باہر نکل آئی تھی۔

آسمان نے ایک مرتبہ پھر اپنے دامن پر پھیلی سیاہی مڈز لینڈ کی سالخوردہ عمارتوں پر اتارنی شروع کر دی تھی۔ موسلادھار بارش نے ریلوے لائن کے دونوں اطراف پھیلے سبزے کے وسیع سلسلے کو عریاں کر دیا تھا۔ بارش میں بھیگی ہوئی عمارتیں اور درخت سر جھکائے گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دے رہے تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے پھسلتے بارش کے قطرے اس کو روحانی بالیدگی کا سامان بہم پہنچا رہے تھے۔ سبزے کی گیلی تراوٹ اسے اپنی نس نس میں اترتی محسوس ہو رہی تھی---- سردی سے زیادہ ٹھنڈک کے احساس نے اسے بار بار ٹانگیں سمیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے متعدد مرتبہ پہلو بدل بدل کر ماحول کی واقعیت کا احساس کیا تھا۔

کہیں کہیں ریلوے لائن کے نزدیک سڑکوں پر پھسلتی کاریں اور دور فاصلے پر بڑے بڑے ٹاورز پر روشن بلب گہری دھند میں سے سر نکالتے نظر آ رہے تھے۔ امریک ماحول کے گہرے طلسم کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے راستے کے ایک ایک منظر سے حظ اٹھایا تھا۔ وہاں موجود اور لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی ٹرین میں موجود ڈائننگ کار کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ڈبے میں لاؤڈ سپیکروں نے اسے ڈائننگ کار میں موجود اشیائے خورو نوش سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسے ابھی تک کسی سے کوئی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ہر نیا سٹیشن آنے سے پہلے اس کے نام کا اعلان اور وہاں سے نکلنے والی مختلف لائنوں کی تفصیل یہاں سے نشر کی جا رہی تھی۔ گاڑی رکنے پر دوبارہ متعلقہ سٹیشن کا نام دہرایا جاتا تھا۔

ڈائننگ کار سے کافی کا کپ اور سینڈوچ لے کر وہ اپنی سیٹ پر آ گیا۔ ٹرین اس مرتبہ جس سٹیشن پر رکی' وہاں سے ایک بوڑھا انگریز اپنی نوجوان دوست کے ساتھ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یہ لوگ شاید سکاٹش تھے اسی لئے ان کے ہونٹوں پر امریک کو دیکھتے ہی استقبالیہ مسکراہٹ رینگی تھی بصورت دیگر تو لوگ یہاں ہونٹ بھینچ کر ہی بیٹھے رہتے تھے۔ اس نے دونوں کی مسکراہٹ سے فائدہ اٹھا کر "ہیلو" کہہ دیا تھا۔ اب تک مسلسل خاموشی نے اسے ایک بے نام سی بوریت کا شکار بنا رکھا تھا۔

"ہیلو" جواب میں دونوں نے مسکراتے ہوئے باری باری اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

امریک دونوں سے باری باری ہاتھ ملاتے ہوئے ایک عجیب سی خوشی کے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ عورت نے گاڑی کے رینگتے ہی اپنے بیگ سے بیئر کے دو ٹن نکال کر سامنے رکھ لئے تھے۔ جس کے بعد سے امریک بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا ورنہ اسے اکیلے کافی پیتے ہوئے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ بیئر کے ٹن خالی ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے میں مصروف ہو گئے تھے۔ عورت بوڑھے انگریز کے ساتھ چپکی کسی گزرے "ویک اینڈ" کی دلچسپیاں یاد کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ باتیں کرتے کرتے جب ایک دوسرے سے ذرا جذباتی ہوتے تو امریک گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیتا۔ دونوں دل ہی دل میں اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

دو تین گھنٹے بعد انہیں فراغت نصیب ہوئی جب عورت اٹھ کر باتھ روم کی طرف گئی اور بوڑھے سکاٹ نے اس سے تعارفی کلمات کا آغاز کیا۔ اس نے اپنی ساتھی کا تعارف "نوبیاہتا بیوی" کی حیثیت سے کروایا تھا۔ اب اس کی بیوی بھی دونوں کے ساتھ گفتگو میں شامل ہو گئی تھی۔

ooo

شام ڈھلے ٹرین نے اسے ایڈنبرا پہنچا دیا۔ یہاں موسم قدرے نارمل تھا۔ چھوٹے سے سٹیشن کے بیرونی دروازے پر رک کر اس نے مخصوص انداز میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک نوجوان کو ٹکٹکی باندھے اپنی طرف متوجہ پایا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے نزدیک آ گیا۔

"امریک سنگھ جی!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر "فتح" بلائی۔

جواب میں امریک نے بھی وہی عمل دہرایا۔

"میرا نام گریوال ہے' کیسا سفر گزرا؟" نووارد نے تعارف کے لئے اپنے نام کا آخری

حصہ بتانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"بہت اچھا۔" امریک نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کا پروگرام تیار ہے۔ آج باہر نکلنا پسند کریں گے؟" گریوال نے کار میں بیٹھتے ہی اس کی طرف گردن گھما کر پوچھا۔

نہیں۔ میرے خیال سے آج مجھے آرام کرنا چاہیے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد کار ایک گوردوارے کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ دونوں اب گوردوارے کی طرف جا رہے تھے۔ بیگ امریک نے احتیاطاً" اٹھا لیا تھا۔

"بھوجن کر لیں۔" گریوال نے اس سے کہا۔

دونوں نے گوردوارے کے ویوان پر رک کر "ماتھا ٹیکا" اور اب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے۔ گوردوارے میں اس وقت صرف "سیوادار" موجود تھے۔ شاید یہاں ویک اینڈ پر ہی رونق ہوتی تھی۔ گوردوارے کے سیواداروں نے صرف "فتح" بلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کسی نے اس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی' شاید گریوال کے ساتھ اس کی آمد ہی ان کے لئے کوئی "خاص اشارہ" تھا۔

دونوں کے لئے سیواداروں نے پرشاد تیار کر دیا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر گریوال اسے ایک اور کمرے میں لے گیا تھا جہاں اس نے امریک کو پگڑی پیش کی تھی۔

"پگڑی باندھ لیں اور اب آپ کا نام چند دنوں کے لئے "نشان سنگھ" ہے۔" گریوال نے کہا۔

امریک جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"میں فی الوقت آپ کا تعارف اسی نام سے کرواؤں گا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ "اپنے لوگ" آپ سے متعارف ہیں۔ یہ صرف اجنبی لوگوں کے لئے ہو گا۔ وہ بھی اگر آپ پسند کریں۔" گریوال اس کی شخصیت سے کچھ دبا دبا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید امریک کا مکمل تعارف اس تک پہنچ چکا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ یہاں کے حالات تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔" امریک نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ایسی کوئی بات نہیں کیپٹن صاحب! بڑی چڑھدی کلا ہے یہاں۔ کسی مائی کے لال کی جرات نہیں جو آنکھ بھر کر آپ کی طرف دیکھ لے۔ ہمارا مقامی گوردوارے پر مکمل کنٹرول

ہے۔ یہاں کی آبادی میں اول تو کوئی اکالی ہے ہی نہیں' اگر ہے بھی تو اس کی جرات نہیں کہ زبان کھول سکے۔ رہی ہندوؤں کی بات وہ ہمارے سائے سے بھی کتراتے ہیں۔ یوں بھی یہاں حالات لندن اور مڈزلینڈ سے مختلف ہیں۔ ادھر بھارتی سفارت خانے کے لوگوں کا اتنا عمل دخل نہیں ہے۔ دو تین نے ذرا چالاکی دکھائی تھی۔ ایک کی ہم نے دونوں ٹانگیں توڑ دی تھیں' دوسرے کا بازو اور تیسرے کا جبڑا۔ تینوں اب اس شہر میں نہیں رہتے۔ لڑکے دو دو سال اندر رہ آئیں گے' کوئی بات نہیں۔ ہم انہیں سیدھے ہاتھوں لیتے ہیں۔ وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

"تمہارا شکریہ۔ واقعی تم لوگ میرے لئے بہت کچھ کر رہے ہو۔ میری توقع سے بڑھ کر۔"

امریک کی آواز میں احسان شناسی کی جھلک نمایاں تھی۔

گریوال کے ساتھ جب وہ اس کے گھر پہنچا تو ایک مکمل سکھ کے روپ میں تھا۔ گریوال نے اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف "نشان سنگھ" کے حوالے سے کروایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ جرمنی سے یہاں منتقل ہونا چاہتا ہے۔ امریک خاموشی سے اپنے متعلق نیا تعارف سنتا اور ذہن نشین کرتا رہا۔

ooo

ورشن نے کار کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی اور وہ سامنے دکان پر نظریں جمائے وہیں بیٹھا رہا۔ خورشید پندرہ بیس منٹ بعد باہر نکلا تو ورشن کو زبردست جھٹکا لگا کیونکہ وہ اکیلا تھا۔ وہ تلملا کر ہی تو رہ گیا۔

اس علاقے کی بیشتر دکانوں پر اس کا آنا جانا تھا لیکن یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھی کو دکان کے بغلی دروازے سے غائب کر دے گا۔ ورشن نے پہلے تو یہی چاہا کہ وہ دکان کے اندر جا کر صورت حال کا جائزہ لے۔ عین ممکن ہے وہ شخص اندر ہی موجود ہو لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اس نے دکان پر جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کا "شکار" اندر نہیں ہے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ابھی خورشید کو تعاقب کا علم نہ ہوا ہو اور اس نے پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق ہی "شکار" کو یہاں پہنچایا ہو!

اگلے ہی لمحے وہ اپنی گاڑی کو بخشی کے دفتر کی طرف بھگا رہا تھا جس نے دوپہر تک اسے مکمل رپورٹ دینے کا حکم دیا تھا۔ بخشی نے اس کی آمد کی اطلاع پاتے ہی اسے اندر طلب کر لیا تھا اور اب ورشن منہ لٹکائے اس کے سامنے کھڑا اپنی کارگزاری بیان کر رہا تھا۔ بخشی کا

پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ گدھے۔۔۔۔!" اس نے چلاتے ہوئے ورشن کو حکم دیا۔

"او کے سر!"

ورشن جانتا تھا اب اس کی خیریت یہاں سے چپ چاپ نکل جانے ہی میں ہے۔ اس نے بخشی کو قریباً" جھکتے ہوئے نمسکار کیا اور نیچے آ گیا۔ خورشید نے پہلی مرتبہ اسے ذلیل نہیں کروایا تھا۔ اس نے جب بھی خورشید کے معاملات میں ہاتھ ڈالا' زک ہی اٹھائی تھی۔

"میں اس مسئلے کو ہی ختم کر دوں گا۔" وہ اپنے آپ میں بڑبڑایا۔

کار اس نے بخشی کے بنگلے کے سامنے روکی تھی اور اب کال بیل کا بٹن دبا کر دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔ دروازہ بخشی کی بیٹی نے کھولا تھا۔

"کیا بات ہے' گھر پر کوئی نہیں۔" اس نے ورشن کی شکل پر نظر پڑتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ورشن نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے وال میں کچھ کالا ہونے کا اندازہ کر لیا تھا۔ آج تک کسی نے اسے اس گھر میں داخل ہونے پر اس طرح روکا نہیں تھا۔

"کچھ پیپر منگوائے ہیں بخشی صاحب نے!" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔ جیسے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا' ورشن کو یوں لگا جیسے غلطی سے اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ سامنے صوفے پر خورشید بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نیلما

نیلما سے خورشید کی ملاقات بس یوں ہی ہو گئی تھی۔

ایک ایشیائی تقریب میں دونوں چھ ماہ قبل ملے تھے۔ نیلما کو مرد کی اصلیت جاننے اور پہچاننے کا فن اپنی ماں سے وراثت میں ملا تھا۔ لمبے چوڑے قد کاٹھ اور مضبوط جسم کے مالک خورشید نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس کے نزدیک مرد سے متاثر ہونے کے لئے صرف اتنی وجہ کافی تھی۔ قابلیت یا دولت میں کوئی اس کا مقابل نہیں تھا نہ ہی وہ اس ضمن میں کسی احساس کمتری کا شکار رہی تھی۔

نیلما کے لئے چونکا دینے والی بات خورشید کا بے اعتنائی کا رویہ تھا۔

اس محفل میں موجود مقامی اور غیر مقامی خصوصاً" ایشیائی نوجوان شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے اردگرد بھنبھنا رہے تھے لیکن نیلما حیران تھی کہ دو تین مرتبہ خورشید کی طرف مسکراہٹ اچھالنے کے باوجود اس نے نیلما کے نزدیک آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بس ایک دو مرتبہ نظروں کے ٹکراؤ پر وہ اخلاقاً" مسکرایا ضرور تھا۔

اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ ان کا آمنا سامنا ہوا لیکن اجنبیوں کی طرح۔ نیلما نے اسے اب اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ خود سر اور ضدی لڑکی تھی۔ ایسا زندگی میں کبھی ہوا نہیں تھا کہ اس نے کسی چیز کی خواہش کی اور اسے حاصل کئے بغیر دم لیا ہو۔

اس نے خورشید کو بھی حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

وہ چاہتی تھی کہ دوسرے نوجوانوں کی طرح اسے بھی اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کر دے۔

جس روز خورشید نے پہلی مرتبہ اس جیسی گرمجوشی کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا' اس روز نیلما کے قدم خوشی سے زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

لیکن۔۔۔۔!

وہ نہیں جانتی تھی کہ خورشید کو چند روز پہلے ہی علم ہوا تھا کہ وہ بخشی کی بیٹی ہے اور

بخشی کے نزدیک پہنچ کر اس کے عزائم سے باخبر رہنے کا موقع خورشید کبھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ بخشی کے بھارتی سفارت کاروں سے کتنے گہرے روابط ہیں۔

ان روابط کے پس منظر سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھا۔ اس طرح کم از کم وہ کسی حد تک صحیح ان لوگوں کے عزائم سے خبردار تو رہ سکتے تھے۔ جب اسے نصیب نے بتایا کہ جس لڑکی کے ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا' وہ بخشی کی بیٹی ہے تو وہ چونکا۔

اسے افسوس ہوا کہ اس نے آج تک نیلما کو نظرانداز کیوں کئے رکھا؟

نیلما یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے بہرحال اس پتھر کو اپنی اداؤں سے موم کر لیا ہے۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی "شیراٹن" میں آئی تھی۔ اب اس کا رخ بار کی طرف تھا۔

"میں ڈرنکس میں صرف چائے' کافی اور سوفٹ ڈرنکس ہی پیتا ہوں۔" خورشید نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خبردار کر دیا۔

"کمال ہے۔" نیلما کی آنکھیں حیرت سے جگمگائیں۔ "اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد بھی؟"

"ہاں بعض لوگ بہت عرصہ بعد بھی اپنی اصلیت کو نہیں بھولتے۔ بس آپ یہ جانیے کہ میرا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔" خورشید نے قدرے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ونڈرفل!" نیلما نے واہ دینے کے انداز میں کہا۔ "واقعی آپ عجیب شخص ہیں۔"

"نہیں مس نیلما۔ میں عام سا آدمی ہوں۔ بالکل ویسا ہی جیسے اور لوگ ہیں' جو یہاں رزق کمانے آئے اور اب اسی رزق کا رزق بن کر رہ گئے ہیں۔"

"باتیں آپ بہت اچھی کرتے ہیں۔" نیلما مسکرا دی۔

دونوں نے کونے والی میز سنبھالی تھی۔ نیلما نے اس کی خواہش پر کافی کا آرڈر دیا تھا۔

نیلما کو فی الوقت اس میں کوئی ایسی چونکا دینے والی بات نظر نہیں آئی تھی لیکن اس نے خواہ مخواہ خورشید کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ خورشید نے اسے بتایا تھا کہ وہ سری نگر کا رہنے والا ہے۔ نیلما جب بھی بھارت جاتی' سری نگر ضرور جاتی تھی۔ کشمیر کے حسن نے اس کے دل میں عرصے سے گھر کر رکھا تھا۔ پہلی ملاقات میں دونوں دیر گئے تک کشمیر کی باتیں کرتے رہے۔ خورشید نے اسے پہلی ملاقات میں کشمیر کے اندر سرایت کر جانے والی کرناک بدصورتی سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ فی الوقت تو وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ نیلما اس کے مشن کے لئے کس حد تک کارآمد ہو سکتی ہے۔

ایسی ہی دو چار ملاقاتوں کے بعد نیلما اس کی کمی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس روز جب

وہ دونوں اپنے مخصوص ہوٹل سے کافی پی کر نکلے تو راہ چلتے ہوئے خورشید نے اسے ایک چونکا دینے والی بات کہہ دی تھی۔

"غلاموں کے لئے بہترین خواب آزادی ہوتا ہے۔"

"لیکن تم غلام نہیں ہو۔"

"ہم چالیس سال سے غلام ہیں۔"

"آج خاصے جذباتی ہو رہے ہو' خیریت تو ہے۔" نیلما کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نہیں نیلما' حقیقت یہی ہے افسوس اس کا ادراک بھی صرف مجھے ہی ہو گا کیونکہ یہ میرا معاملہ ہے۔"

خورشید خاصا سنجیدہ تھا اور دکھی بھی۔ نیلما کے لئے یہ افسوس ناک صورت حال تھی۔ وہ ابھی تک خورشید کے لئے اپنے دل و دماغ میں موجزن جذبات کو نہ تو کوئی واضح سمت دے سکی تھی نہ ہی کوئی نام۔ "محبت" جیسے فرسودہ لفظ سے اس کی کبھی آشنائی نہیں رہی تھی۔ اس کے والدین کی تربیت نے اسے جسم سے آگے سوچنے کا شعور ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا کوئی روحانی رابطہ خورشید سے ایسا ضرور ہو چکا تھا جو اسے اکثر تنہائی میں خورشید کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔

شاید یہی وہ رابطہ تھا جو لاشعوری طور پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کر چکا تھا کہ اسے آج واقعی خورشید کو اداس دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

"تم تو بہت چھوٹے تھے جب لندن آ گئے۔ تمہیں کشمیر سے کیا لینا؟" نیلما نے اپنی دانست میں بڑی مضبوط دلیل پیش کی تھی۔

"چھوڑو۔ تم اسے سمجھ نہیں پاؤ گی۔" خورشید نے کہا۔

"نہیں' نہیں بتاؤ مجھے۔ میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتی۔" نیلما نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"سن سکو گی؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں سنوں گی۔ تمہاری بات کیوں نہیں سنوں گی میں۔"

"دیکھو! جنہیں تم بہت عزیز رکھتی ہو' جو خود کو انسانی آزادی' مساوات اور سیکولر ازم کے علمبردار کہتے ہیں' ان کا اصلی چہرہ بہت بھیانک ہے۔ نیلما! تم نے انہیں اندر سے نہیں دیکھا' میں نے دیکھا ہے۔ میں دس سال کا تھا جب بھارتی فوج نے ہمارے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ ہم پر الزام تھا کہ ہم نے پاکستانی کمانڈوز کو ۶۵ء کی جنگ میں اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔ جانتی ہو تب مجھے قطعاً" کسی بات کا شعور نہیں تھا۔ بس سکول اور اپنا باغ ہی زندگی

تھی میری۔ میرے والد اس علاقے کے کھاتے پیتے آدمی تھے اور یہی ان کا گناہ تھا۔ بھارتی فوج کے درندے وحشیوں کی طرح انہیں پیٹنے لگے۔ وہ ان سے ایک ہی بات منوانا چاہتے تھے کہ ہم نے پاکستانی کمانڈوز کی مدد کی تھی۔ انہوں نے سارے گاؤں کے سامنے میرے باپ کو گولی مار دی۔ میری ماں اور بہن کو پکڑ کر لے گئے۔ آج تک ان کا نام و نشان نہیں ملا۔ میں جانتا ہوں ان وحشیوں نے انہیں مار ڈالا۔ میں تو شاید خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا جو میری جان بچ گئی اور میرے چچا نے کسی طرح مجھے اس دیس میں پہنچا دیا۔ میرا وہاں سب کچھ مٹ چکا ہے' سب تباہ ہو گیا' میں کیسے بھول جاؤں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"ویری سیڈ!" نیلما نے اس کے دکھ کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔

اس سے آگے نہ نیلما نے کچھ پوچھا' نہ خورشید نے کچھ بتایا۔ بس وہ ملتے تھے کبھی کبھی کہیں۔ نیلما نے اس سے ملاقاتوں کے بعد اپنے آپ میں ایک خاموش سی تبدیلی محسوس ضرور کیا لیکن اس نے ابھی تک اس تبدیلی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ایک رات جب اس نے اچانک خورشید سے کہا۔

"میں نے شراب پینا چھوڑ دی ہے۔"

خورشید کے لئے یہ چونکا دینے والی خبر تھی لیکن وہ خاموش رہا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی' خود ہی تو تم کہا کرتے تھے مشرقی عورت کو ایسا ہونا چاہیے۔" نیلما نے حیرانی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بہت خوشی ہوئی لیکن جب تم شراب پیتی تھیں تب بھی مجھے برا نہیں لگا کیونکہ میرے سامنے تم نے کبھی کوئی غلط قسم کی حرکت نہیں کی۔" خورشید کے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

جب پہلی مرتبہ اس نے خورشید کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تو اس نے مسکرا کر نیلما کا شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل اس دعوت کو دہراتی رہی لیکن اب جب کہ نیا قونصلیٹ یہاں آ چکا تھا اور کرنل مہتہ کا عمل دخل بھی اس شہر میں بڑھنے لگا تو خورشید کے لئے اس دعوت کو قبول کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔

آج وہ پہلی مرتبہ جب اچانک نیلما سے ملنے آیا تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی نیلما کے بدن کے سارے تار جھنجھنا اٹھے۔

"تم؟" اس نے حیرانگی سے دروازہ کھولا۔

"ہاں! میں لیکن اس میں اتنی حیرانگی کی کیا بات ہے۔" خورشید نے اندر داخل ہوتے

ہوئے کہا۔

"یقین نہیں آ رہا مجھے۔" نیلما نے بے اختیار کہہ دیا۔

"مجھے علم تھا کہ تم گھر پر ہی ہوتی ہو خصوصاً" اس وقت مل سکتی ہو۔ ادھر سے گزر رہا تھا سوچا اتنی غضب کی سردی میں تمہارے ہاتھوں کی بنی کافی نہ پینا کفران نعمت ہی ہو گا۔ سو آ گیا' کیسا لگا تمہیں؟"

"بہت اچھا۔" نیلما کھل کھل گئی۔

○○○

وہ اپنے ہاتھ سے خورشید کے لئے کافی بنانے لگی تھی' جب درشن اچانک اندر گھس آیا اور درشن دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں تھے لیکن دونوں کی براہ راست ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر دونوں کو نظر رکھنا پڑتی تھی۔

"ہیلو!"

"ہیلو!"

دونوں نے ایک دوسرے سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔ جب نیلما کافی کے دو مگ تھامے اندر داخل ہوئی۔

"تم؟" اس نے حیرانی سے درشن کی طرف دیکھا۔

"تم یہاں کیسے؟"

"مم! میں صاحب کے حکم پر آیا ہوں۔ ان کا دوسرا بریف کیس لے جانا تھا۔"

درشن واقعی بخشی کا بریف کیس لینے آیا تھا۔ وہ شاید اس گھر کا واحد ایسا ملازم تھا جسے گھر کے اندر بلا روک ٹوک آنے کی اجازت تھی لیکن نیلما نے اس کی آمد کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔

"میرے فادر کا سیکرٹری ہے درشن۔" اس نے خورشید کی طرف دیکھ کر صرف اتنا کہنا کافی جانا۔

خورشید نے بھی جواب میں اپنا تعارف کروانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔" نیلما نے تحکمانہ لہجے میں درشن سے کہا۔

"تھینک یو مم!" درشن نے قریباً" کورنش بجا لانے کے انداز میں کہا اور انہیں قدموں

پر لوٹ گیا۔

اس نے فی الوقت اس "ملاقات" کو خود تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ درشن گھاگ شکاری تھا۔ اس نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ شکار کو بھگا بھگا کر مارنے کا قائل تھا۔ اس جیسا ٹھنڈے دماغ کا بدمعاش پورے مڈز لینڈ میں کوئی نہیں تھا۔ یہی اس کی ترقی کا راز تھا۔ اگر وہ جذباتی ہوتا تو آج ساؤتھ ہال کی کسی گلی کے "پب" کے باہر بھیک مانگ رہا ہوتا۔ وہ لندن سے اس گھر تک اپنی ذہانت اور ٹھنڈے مزاج کے بل بوتے پر پہنچا تھا۔

درشن کے ہاتھ میں تقدیر نے اچانک "ترپ چال" دے دی تھی اور اب وہ بڑی مہارت سے موقعے پر ہی اپنا پتا پھینک کر یہ بازی پلٹ سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں دولت، عورت اور شراب کی تکون کے باہر کبھی نہیں جھانکا تھا۔ ان تینوں چیزوں کے لئے وہ کسی بھی ملک کے لئے کام کر سکتا تھا جو یہاں بخشی کے لئے کر رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ درشن نے سوچا کہ وہ کیوں نہ بخشی کا مقام حاصل کر لے۔

اگر وہ بھارتی قونصلیٹ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ بخشی ان کے ساتھ بھی ہمیں کسی سے پیچھے نہ پاؤ گے۔ گورو مہاراج انگ سنگ سہائی ہووے۔" "ڈبل گیم" کھیل رہا ہے اور در پردہ اس کے تعلقات "مجاہدین آزادی کشمیر" سے بھی ہیں تو ساری بازی مات ہو سکتی ہے۔ اسے وہ مقام مل سکتا تھا جو "را" نے یہاں بخشی کو دے رکھا تھا۔ فی الوقت اس نے "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ خوشی سے وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔

○○○

کیپٹن امریک سنگھ کو اب بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا یہاں آیا کر لئے ہے اور کر کیا رہا ہے؟ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اس میں اس کا یا اس کے ساتھیوں کا کوئی قصور نہیں۔ کیسے گھمبیر حالات سے گزرنا پڑا تھا اسے۔

آج پہلی مرتبہ جب ستنام نے اس سے ٹیلی فون پر بات کی تو امریک قدرے مطمئن ہو گیا۔

"ویر جی! میں یہاں سیر کرنے نہیں آیا۔" بالآخر اس نے کہہ دیا۔

"میں جانتا ہوں امریک سیہاں! فی الوقت سیر کرنا ہی تمہاری اور ہماری دونوں کی صحت کے لئے بہتر ہے۔ تم جانتے ہی ہو میں بھی فارغ بیٹھنے کا قائل نہیں رہا کبھی۔" ستنام نے اس کی تسلی کرواتے ہوئے کہا۔

اس فون کے تیسرے روز جب وہ گوردوارے سے واپس آ رہا تھا تو خورشید کو اچانک یہاں دیکھ کر چونک اٹھا۔

"تم!"

"ہاں میں۔ میں نے سوچا بہت سیر ہو گئی اب کچھ کام بھی ہو جائے۔" خورشید نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں! کیوں نہیں! یار تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔" امریک خوشی سے کھل اٹھا۔

"تیاری کر لو۔ ہمیں ایک گھنٹے بعد ٹرین پکڑنی ہے۔" خورشید نے اسے مطلع کیا۔

"اپنی کیا تیاری برادر۔ ایک بیگ ہی اٹھانا ہے۔" امریک مسکرا دیا۔

میزبانوں نے رخصت ہونے سے پہلے ایک لفافہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔

"ہماری "سیوا" ہے ویر جی! ابھی حکم ہی "مایا" کا ملا ہے۔ جب جان وینے کی باری آئی

ا رہ گیا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ہندو سامراج سے نجات پانے کے لئے یہ لوگ جان سے

ا گزر سکتے ہیں۔

ٹرین کے سفر میں دونوں کا بھرپور تعارف ہوا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے ماضی سے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ اپنے مستقبل کے

ہائم کا ذکر کیا تھا اور براہمن سامراج کے خلاف اپنے دل میں سلگتی آگ کی تپش سے ایک

رے کو خوب خوب جلایا تھا۔ دونوں جلد از جلد کچھ کر گزرنے کا عزم رکھتے تھے لیکن

وں مجبور تھے۔

ین الاقوامی سیاست کے گورکھ دھندے میں پھنسی تیسری دنیا کے مقہور عوام اپنی مرضی

اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتے۔

نہیں کر سکتے۔۔۔۔!

نہیں کر پاتے۔۔۔۔!

اس بات کا خورشید سے زیادہ احساس اور کسے ہو گا۔ وہ جانتا تھا کہ کشمیر کی آزادی کے

لئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے والے آزاد ممالک کی حکومتوں نے آج تک کشمیری حریت
کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ مستقبل میں بھی وہ کچھ نہیں کر
سوائے زبانی جمع خرچ کے۔ وہ جانتا تھا انہیں جو کچھ بھی کرنا ہے اپنی قوت بازو اور
تائید کے بل بوتے پر کرنا ہے۔

"اگر بھارت کی مظلوم اقلیتوں میں محض یہ سوچ ہی جڑ پکڑ جائے کہ ہمیں
"براہمن واد" کا جنازہ نکالنا ہے تو میرے خیال سے ہم آدھی جنگ جیت جائیں"
امریک سنگھ نے اپنی رائے پیش کی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ سوچ عوام سے آگے نہیں بڑھ پائے گی۔ تم جا
ہمیں بھی تمہارے جیسے بزدل اور موقع پرست منافق لیڈروں سے واسطہ رہا ہے۔ وہی
آج بھی ہم پر مسلط ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں حکومت ہمیشہ کانگریس کی بنتی ہے خواہ اس
کسی بھی پارٹی کا چپکا دیا جائے لیکن اب پرانی نسل دم توڑ رہی ہے۔ نئی نسل میں
شعور جنم لے رہا ہے۔ اس لئے میں پرامید ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم اپنی
نسل کو آزاد فضاؤں میں زندہ رہنے کا حق دے سکیں گے۔۔۔۔" خورشید نے ٹرین کے
گہری دھند میں ٹمٹماتے بجلی کے قمقموں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہی ایک امید ہے جو زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے ورنہ اب کیا باقی بچا"
امریک سنگھ کے لہجے میں سمٹی یاسیت خورشید کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی
ہوئی تھی۔

دونوں ایک ہی کرب کا شکار تھے۔

غلامی کے کرب کا!

انٹر سٹی ٹرین سے اتر کر وہ انڈر گراؤنڈ کے ذریعے "آرسن گرود" جا رہے تھے۔
آدھ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ "انڈر گراؤنڈ" کے اس سمت میں آخری سٹیشن
نزدیک پہنچے تھے۔ یہاں سے فر بنکلن روڈ تک کا سفر انہوں نے ٹیکسی میں طے کیا۔
روڈ کی جنوبی سمت بنی خوبصورت آبادی کے مکان پر کچھ لوگ بے چینی سے ان کے
تھے۔

ٹیکسی خورشید نے مکان کی دوسری گلی میں فارغ کر دی تھی اور اب دونوں پیدل
کی طرف جا رہے تھے۔ امریک اس کی "سیکورٹی سینس" کو دل ہی دل میں کئی دفعہ
چکا تھا۔

ooo

دوسری گلی میں واقع مکان کا دروازہ ان کے دستک دینے سے پہلے ہی کھل گیا تھا کیونکہ
بھاری پردوں کے پیچھے مستعد آنکھوں نے انہیں دور ہی سے اس سمت آتے دیکھ لیا تھا۔
دروازہ کریم خان نے کھولا تھا۔ سرخ و سپید رنگت اور چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی والے
کریم خان کی عمر تو ساٹھ سے کچھ زیادہ ہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں جاگتی چمک اس کے
جواں ارادوں کی غماز تھی۔ دونوں سے باری باری بغلگیر ہونے کے بعد وہ انہیں "لیونگ
روم" میں لے آیا تھا جہاں برقی آتش دانوں میں دہکتی آگ کے گرد چار آدمی ان کے منتظر
تھے۔ ستنام کے علاوہ امریک اور کسی کو نہیں جانتا تھا۔

جوتے انہوں نے باہر ہی اتار دیئے تھے۔ بیگ اور لمبے لمبے کوٹوں سے نجات حاصل
کرنے کے بعد دونوں خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔ لندن کی ہڈیوں میں
اترتی سرد ہوا سے نجات پانے کے بعد امریک کے اوسان بھی خاصے بحال ہو گئے تھے۔

خشک میوہ اور کشمیری چائے ان کے سامنے پہنچ چکی تھی اور ستنام اس کا تعارف
دوسرے لوگوں سے کروا رہا تھا۔ ان میں دو سکھ اور دو مسلمان تھے۔ "یہ جنگ کسی اکیلی قوم
کی نہیں' کسی ایک فرقے یا مذہب کے ماننے والوں کی نہیں' ہم سب مظلوم ہیں۔ بھارت کی
تمام اقلیتیں مظلومیت کے رشتے سے بڑی مضبوطی سے ایک دوسرے کے ساتھ بندھی
ہیں۔ حالات اور واقعات نے اس رشتے میں اتنی مضبوط گانٹھیں لگا دی ہیں کہ ہم شاید اسے
توڑنا بھی چاہیں تو نہ توڑ سکیں۔" ستنام سنگھ ان سے مخاطب تھا:

"بھائیو! اس جنگ میں ہم صرف قربانیوں کے ذریعے ہی ایک دوسرے پر سبقت لے جا
سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس سوائے اپنی جانوں کے آزادی کی دیوی کو بھینٹ چڑھانے کے
لئے اور کوئی نذرانہ موجود نہیں ہے۔ یہاں سے آگے ہماری منزل کو صرف ایک ہی راستہ
جاتا ہے اور ہمارے لئے اس شاہراہ موت پر سوائے مل کر چلنے کے اور کوئی چارہ کار باقی
نہیں رہ جاتا۔ مجھے یہ سوچ کر بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ ہمارا ماضی قریب کوئی ایسا پہلو
نہیں رکھتا جس کا حوالہ دے کر میں آپ لوگوں سے داد وصول کر سکوں۔ افسوس ہمارے
لیڈروں نے سوائے ہندو کی کٹھ پتلیاں بن کر ناچنے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ انہوں نے
براہمن کی چالبازیوں کو سمجھے بغیر اس کے ہر حکم پر پالتو کتے کی طرح دم ہلائی اور ہمارے لئے
ایسے کانٹے بو گئے جنہیں آج تک ہم کاٹتے آ رہے ہیں۔ میں ماضی کو زیر بحث نہیں لانا
چاہتا۔ قومیں ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتی ہیں۔ مکافات عمل کا نشانہ ہم سے زیادہ کوئی نہ بنا ہو

گا۔ جس ہندو کے کہنے میں آکر ہم نے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائی تھی' اپنے محر
کا خون بہایا تھا۔ آج اسی ہندو نے ہمارے "ہرمندر صاحب" کو اپنے ٹینکوں سے روندوا
جب آگ اپنے دامن تک پہنچے تب ہی اس کی تباہ کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں آپ
صرف ایک ہی بات کہوں گا کہ آپ نے گزشتہ چالیس سالوں میں اتنے ستم نہیں اٹھائے
کا سامنا ہم نے ان دو سالوں میں کر لیا ہے۔ آیئے مل کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک ہو
آگے بڑھیں اور ہندو سامراج سے نجات حاصل کر کے اپنی آنے والی نسلوں کو آزاد فضا
میں زندگی گزارنے کا حق دیں۔"

ستنام شاید اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اب اس کے جذبات کا ساتھ د
کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔

"ستنام سنگھ! میں شروع سے یہی بات کہتا آ رہا ہوں کہ بھارت کی اقلیتوں کو مل کر
آزادی حاصل ہو سکتی ہے' الگ الگ رہے تو دشمن ہمیں چن چن کر مار ڈالے گا۔ خدا
شکر ہے کہ آج حالات نے تجھے بھی اس تلخ حقیقت کا احساس دلا دیا ہے۔ تاریخ کا دھارا
ظالم ہے ستنام سیہاں! اس کی کاٹ بہت گہری ہوتی ہے۔" کریم خان کچھ کہتے کہتے رک گ
"کہہ ڈالو کریم خان۔ جو دل میں آئے کہہ ڈالو۔" ستنام سنگھ کی آواز بھرا گئی تھی۔

وہاں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا تھا۔ مل کر مشترکہ د
کے خلاف لڑنے کا معاہدہ۔ اب وہ ایک منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ کیپٹن ستنام سنگھ
اپنی دانست میں کشمیری حریت پسندوں کو اپنی طرف سے پہلا بھرپور نذرانہ پیش کرنے کا فی
کر لیا تھا۔

کھانا سب نے اکٹھے ہی کھایا تھا پھر خورشید تو یہیں رہ گیا۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی م
کی طرف چل دیئے۔ امریک کو ستنام اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

ooo

پکاڈلی کی رونق اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔

دونوں ایک کونے والی میز سنبھالے بیٹھے تھے۔ ویٹرس کے نزدیک ان کی حیثیت
گدھوں سے زیادہ کچھ نہیں تھی کیونکہ دونوں نے ابھی تک "سافٹ ڈرنکس" کے علاوہ
کچھ آرڈر نہیں دیا تھا حالانکہ اس "ڈسکو" میں کوئی پاگل ہی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ پ
بیس منٹ سے دونوں فارغ بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔

اب تک دو مرتبہ ویٹرس انہیں بیہودہ اشارہ کر کے اگلے آرڈر کی بابت دریافت کر چکی تھی لیکن دونوں ایک مرتبہ---- پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتے۔ جلد ہی ستنام کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی کیونکہ اس نے سامنے والے دروازے سے ٹھگنے قد کے ایک سیاہ فام کو اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

نووارد نے دروازے پر کھڑے ہو کر نظریں ہال میں چاروں طرف دوڑائیں پھر تیر کی طرح سیدھا ان کی طرف آ گیا۔

"مسٹر بل کیری۔" ستنام نے امریک سے اس کا تعارف کروایا۔

"امریندر----" امریک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بل کے ہاتھ ملانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ پیشہ ور فوجی ہے۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے نزدیک گزرتی ویٹرس کے جسم پر ہلکا سا ہاتھ جما کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"ون لارج وہسکی!" بل نے کہا اور ویٹرس بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اگلے ہی لمحے وہ جھومتی ہوئی اس کے لئے وہسکی کا ایک بڑا پیگ لئے اس کے سر پر موجود تھی۔

بل نے چند منٹ میں گلاس خالی کر کے اگلے گلاس کے لئے آرڈر دے دیا تھا لیکن اس کے اطوار سے کہیں ذرہ برابر احساس نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

"مسٹر بل معاملات تم سے طے ہیں۔ ہمیں صرف تربیت ہی نہیں سامان بھی چاہیے۔" ستنام نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ضرور ملے گا' ڈیل ہونے کے بعد۔" بل کیری نے محتاط رویہ اختیار کیا تھا۔

"ابھی ہماری تمہاری پہلی ڈیل ہے۔ تمہارے آدمی کو پہلی مرتبہ ہم آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائیں گے۔ جب تک ہمارا اعتبار قائم نہ ہو جائے۔ جو آدمی بھی جائے گا اسے ہمارے سنٹر پر ہمارے احکامات کی تعمیل کرنا ہو گی۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا----" اس نے اپنی سفید رنگ کی آنکھیں باری باری ستنام اور امریک کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" ستنام سے پہلے امریک سنگھ نے جواب دیا۔

"ویل مسٹر امریندر۔ آئی ویل کم یو۔" بل نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔

کھانا انہوں نے اسی "ڈسکو" میں کھایا تھا۔ پھر اگلے روز کے لئے وہ ملاقات کی جگہ طے

کر کے رخصت ہو گیا۔ بل کی روانگی کے قریباً" پانچ منٹ بعد وہ دونوں بھی میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کار ستنام چلا رہا تھا----!

یہ "مرسنریز" (کرائے کے سپاہی) ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا ٹریننگ سینٹر کھول رکھا ہے بل وہاں انسٹرکٹر ہے۔ ہم اس سے پہلی ڈیل کر رہے ہیں۔ تمہارے لئے وہاں کچھ نیا نہیں ہو گا سوائے دھماکہ خیز مواد کی تیاری اور ریموٹ تیار کرنے کے۔" ستنام نے ایک مرتبہ پھر بل کا تعارف دہراتے ہوئے اسے کہا۔

"چلو یہی سیکھنا باقی رہ گیا تھا۔" امریک سنگھ نے گہری سانس لی۔

"امریک یہاں اس مرتبہ تم برٹش پاسپورٹ پر سفر کرو گے۔ ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے۔ تمہارے لئے بادی النظر میں تو خطرات کم ہوں گے لیکن بازی الٹ بھی سکتی ہے۔ گورے اپنے سابقہ غلاموں سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے اس مرتبہ تم کسی ہندو نام سے سفر کرو۔ واہے گورو نے مہر کی تو آج کل میں تمہارے کاغذات مکمل ہو جائیں گے۔ یاد رکھنا دنیا میں برٹش پاسپورٹ رکھنے والا کسی احساس کمتری کا مظاہرہ کبھی نہیں کرتا۔"

"ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔" اچانک ہی امریک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ویل ڈن۔ گویا تمہارا ذہن بیدار ہے۔ شاباش! لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں' یہ بل کے آدمی ہیں۔ پیشہ ور لوگ ہیں اپنا اطمینان بہرحال کریں گے۔ کل تک یہ ہمارے ساتھ اسی طرح چمٹے رہیں گے۔ اگر انہیں شک گزرا تو فوراً" ڈیل ختم ہو جائے گی۔ امریک یہاں سکاٹ لینڈ یارڈ اگر ہمارا تعاقب کرے گی تو میں اور تم کبھی نوٹس نہیں لے سکیں گے۔ یہ بہت گہرے لوگ ہیں۔" ستنام نے ایک سگنل پر گاڑی روک کر اس کی طرف گردن گھماتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں زیادہ عرصہ بھارت میں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ تین ماہ سے زیادہ نہیں۔ تمہیں "منڈ" کے علاقے میں جانا ہو گا۔ سامان وہاں ملتا رہے گا۔ تمہیں کوئی بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ ادھر ہمارے لوگوں میں بہت سے "سرکاریئے" بھی موجود ہیں۔ ہر قدم احتیاط سے دیکھ بھال کر اٹھانا۔ اپنا پاسپورٹ اور شناخت ہمیشہ خود سے الگ رکھنا۔ مرجانے کی صورت میں بھی تمہاری موجودہ حیثیت

علم نہیں ہونا چاہیے اور گرفتاری کی صورت میں.....!"

"نہیں ستنام سیہاں میں گرفتار نہیں ہوں گا۔ میں زندہ کبھی ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اس امکان کو کبھی زیر بحث نہ لانا۔" امریک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے کی مضبوطی سے ستنام اندازہ لگا سکتا تھا کہ امریک جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔

مجھے تمہارے متعلق کبھی غلط فہمی نہیں رہی لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ ہمارے پاس تمہاری طرح باقاعدہ فوجیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہندوؤں نے چن چن کر مار ڈالا ہے اپنے لوگوں کو---- تمہاری جان تمہارے لئے ہی نہیں ساری قوم کے لئے بہت قیمتی ہے۔ امریک سیہاں ہماری جانیں ہماری نہیں قوم کی امانت ہیں اور اس امانت میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو' میں بھارت جا کر کچھ کر گزرنے کے لئے کتنا بے چین ہوں لیکن مجھے اجازت نہیں مل رہی۔ سکھ پنتھ کی مرضی کے بغیر ہم ایک قدم نہیں چل سکتے۔"

گھر آ گیا تھا----!

ستنام نے گاڑی گھر کے سامنے ہی پارک کر دی تھی۔

اس کی خوش قسمتی کہ پارکنگ کے لئے جگہ موجود تھی۔ تعاقب میں آنے والی سیاہ رنگ کی سیڈان آگے نکل گئی۔ انہوں نے گلی کے کارنر پر اسے رکتے دیکھا' پھر ایک سیاہ فام اس میں سے برآمد ہوا اور کار آگے چلی گئی۔

دونوں اندازہ کر سکتے تھے کہ اب یہ اگلے روز تک ان کے سر پر مسلط رہے گا اور اس دوران ان کی معمولی حرکات پر نظر رکھی جائے گی۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ اپنے خصوصی ذرائع سے ان کا فون بھی "ٹیپ" کر رہے ہوں۔

ooo

رات گہری ہونے لگی تھی۔ دیر گئے تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے ذہن میں طے شدہ "آپریشن" دہرائے تھے۔ پھر ستنام سنگھ امریک سنگھ کو خواب گاہ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات دیر گئے تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح جب ستنام سنگھ "نت نیم" (صبح کی عبادت) کرنے کے لئے اٹھا تو امریک گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے امریک کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ دیر گئے تک وہ سوتا رہا' پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ دونوں اپنے ماضی کو دہراتے رہے۔ امریک کو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں

اپنے انجام پانے والے کارناموں سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ نادانستگی میں اس سے کوئی بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ ہندو کی غلامی کا احساس اسے رہ رہ کر ڈس رہا تھا۔

مجھے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہو گا۔۔۔۔!

اس جرم کا برا شچت کرنا ہو گا۔۔۔۔!

یہی تھا اس کا فیصلہ۔

یہی تھا اس کا عزم۔

ان ہی عزائم کے ساتھ وہ زندگی کی نئی مسافتوں کی طرف عازم سفر تھا۔

نئی مسافتیں

انہیں شام کو ایک جگہ ملاپ کرنا تھا۔۔۔۔!

شام تک دونوں گھر ہی پر رہے۔ ستنام تھوڑی دیر کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اس دوران امریک ویڈیو اور ٹی وی سے دل بہلاتا رہا۔ ستنام کے گھر میں بھارتی اخبارات اور رسائل کا ڈھیر لگا تھا لیکن امریک نے اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ ستنام کی واپسی ایک قدرے بڑے بیگ کے ساتھ ہوئی جس میں امریک کے لئے نئے کپڑے موجود تھے۔ مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنی "میٹنگ پلیس" کی طرف چل دیئے۔

راستے میں ایک مرتبہ پھر ستنام سنگھ نے بل کے ساتھ اپنے معاہدے کو دہرایا۔ اس معاہدے کے مطابق اسے بل کیری کے احکامات کی مکمل پابندی کرنی تھی اور اس کی حیثیت ٹریننگ سینٹر میں ایک نظر بند کی سی تھی۔

بل کیری عین وقت پر آ گیا تھا۔ وہ لوگ ایک سٹیشن ویگن میں آئے تھے۔ امریک سنگھ بیگ سمیت ستنام سے الگ ہو کر ویگن میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ ان لوگوں نے "موٹر وے" پر ۲۳ نمبر سڑک اختیار کی تھی' وہ کہاں جا رہے تھے؟ اسے کہاں لے جا رہے تھے؟ یہ سفر کتنا لمبا ہو گا؟ یہ تھے وہ سوالات جو اس کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے لیکن معاہدے کے مطابق وہ ان سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔

ویگن کے جس حصے میں وہ بیٹھا تھا وہاں سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک لمبا تڑنگا انگریز بل سمیت اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا جب کہ بل کیری ایک کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ ان لوگوں نے چائے سے بھری تھرماس اس کے سامنے رکھ دی تھی اور دونوں مسلسل شراب نوشی کر رہے تھے۔

قریباً" تین گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا۔۔۔۔!

ویگن اب ایک جگہ رک گئی تھی۔ وہ لوگ حاجات ضروریہ کے لئے ایک ایک کر کے آ جا رہے تھے۔

"تم اگر چاہو تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جا سکتے ہو۔" لمبے انگریز نے اسے آفر دی۔

"نہیں شکریہ۔ میرے خیال سے اس کی ضرورت نہیں۔" امریک نے بڑے مضبوط لہ میں جواب دیا۔

"مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا ہے۔" لمبے انگریز نے بل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"شکریہ!" امریک مسکرا کر رہ گیا۔

ویگن پھر چل پڑی۔ قریباً" ایک گھنٹہ مزید سفر کے بعد اسی انگریز نے امریک کو مخاطب کیا۔

"سولجر! ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھیں گے۔"

"او کے۔" امریک نے لاپرواہی سے کہا۔

اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ کسی جنگل میں سفر کر رہے ہوں۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ ویگن رک گئی' پھر اسے کسی نے نیچے اترنے کہا۔ ایک اور شخص نے بازو پکڑ کر اترنے میں مدد دی اور پندرہ بیس منٹ تک پیدل چ کے بعد انہوں نے امریک کی آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ چند منٹ تک تو اسے کچھ نظر نہ آیا پھر اندھیرے میں اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے خود کو ایک کمر میں موجود پایا۔ بل کیری اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"باتھ روم اٹیچ ہے۔ ساتھ والے کمرے میں ریڈیو' ٹی-وی موجود ہے۔ جس چیز ضرورت ہو گھنٹی بجا کر طلب کر لینا۔ رات کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ گولی چلانے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔" بل کیری نے مسکراتے ہوئے ا ہدایات جاری کر دیں۔

ایک مودب ویٹر اس کے لئے کھانا چن کر چلا گیا' کھانا ملحقہ کمرے میں لگایا گیا تھا جہ ٹی وی چل رہا تھا۔ امریک نے وہیں کھانا کھایا۔ دیر گئے تک وہ ٹی وی سے دل بہلاتا ر یہاں پہنچ کر اس نے گھڑی سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے مسلسل پانچ گھنٹے سفر کیا ہے رات قریباً" ایک بجے کے بعد وہ بستر میں جا گھسا۔ تھوڑی دیر بعد نیند کی آغوش میں پہنچ گ

OOO

صبح اس کے بیدار ہونے پر سب سے پہلے جس صورت سے واسطہ پڑا تھا' اس نے ا مرتبہ تو امریک سنگھ کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔ اس کے سامنے بمشکل تیس سال کی ایک نوجو عورت فوجی وردی میں کھڑی تھی۔ جس نے اپنے بالوں کا سٹائل مردانہ بنایا ہوا تھا۔

"سٹیفی----!" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا ہاتھ امریک کی طرف بڑھا دیا۔

"امریندر!" اس نے لڑکی کے ہاتھ کی مضبوطی سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی عام قسم کی لڑکی نہیں ہے۔

"تمہیں میری کمپنی میں شامل کیا گیا ہے۔ میں تمہاری کمپنی کمانڈر ہوں۔" اس کا لہجہ خالص فوجی قسم کا تھا۔

عام حالات میں اگر کوئی لڑکی اسے "کمپنی کمانڈر" ہونے کی اطلاع کرتی تو امریک اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیتا لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔

"نو بجے سے گیارہ بجے تک مارشل آرٹ' گیارہ بجے ٹی بریک۔ ایک بجے لنچ' دو بجے سے پانچ بجے تک اگلی ٹریننگ' اس کے بعد تم مخصوص علاقے میں گھومنے پھرنے کے لئے آزاد ہو۔ رات کو نو بجے بریفنگ' دس بجے ڈنر اور صبح آٹھ بجے بریک فاسٹ۔ اس دوران سافٹ ڈرنکس' کافی' چائے تم اپنی مرضی سے جتنی جی چاہے استعمال کر سکتے ہو' شراب پینے کی اجازت نہیں۔"

کمانڈر سٹیفی نے اسے "آرڈر آف دی ڈے" سنا دیا۔

"او کے مم" امریک نے فوجیوں کی طرح تن کر جواب دیا۔

"کمانڈر ناٹ مم۔" سٹیفی نے تصحیح کی۔

"او کے کمانڈر۔" امریک نے ایڑیاں بجاتے ہوئے کہا۔

کھڑکی کھول کر اس نے سامنے ایک گراؤنڈ کی نشاندہی کی جو اس کی ٹریننگ گراؤنڈ بننے والی تھی۔

کھڑکی کھلنے پر امریک کو پہلی مرتبہ علم ہوا کہ وہ ایک گھنے جنگل میں موجود ہے جس میں جا بجا پہاڑی ٹیلے اور ندی نالے ہیں اور ان لوگوں نے کچھ علاقے کو اپنی رہائش کے لئے ہموار کر رکھا ہے۔

"ناؤ گیٹ ریڈی!" کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

کمانڈر سٹیفی کی روانگی کے بمشکل دو منٹ بعد ایک گورا اندر گھس آیا۔ امریک اس کی رہنمائی میں ایک سٹور میں پہنچا۔ یہاں مختلف سائز کی تیار فوجی وردیاں لٹک رہی تھیں۔ اپنے سائز کی وردی زیب تن کر کے وہ باہر آ گیا۔ یہاں خاص ہدایت کے تحت "جوگر شو" استعمال کئے جاتے تھے۔

ٹریننگ گراؤنڈ میں وہ ٹھیک نو بجے پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مختلف

رنگ و نسل کے پندرہ مرد اور پانچ عورتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ یہ سب لوگ بھی اس کی طرح دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ آزادی کے لئے اور کچھ عالمی امن کی بربادی کے لئے تخریب کاری کی تکنیک پر عبور حاصل کرنے کے متمنی تھے۔

کمانڈر سٹیفی نے انہیں مختصر لیکچر کے ذریعے یہاں کے اصول و ضوابط سے آگاہ کیا۔ انہیں بتایا کہ اپنے رسک پر وہ ایک دوسرے سے فارغ اوقات میں ذاتی تعلقات قائم کر سکتے ہیں خواہ ان کی نوعیت کیسی ہی ہو لیکن دوران تربیت کسی بھی اصول کی خلاف ورزی پر انہیں طے شدہ شرائط کے مطابق سکول سے خارج بھی کیا جا سکتا ہے۔ سب نے باری باری اپنا نام پکار کر تعارف کروایا تھا۔

ooo

آج نئی کلاس کا اجراء ہوا تھا۔ سٹیفی کو اس مختصر کمپنی کے کمانڈر اور انسٹرکٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ امریک نے کیڈٹ لائف میں جوڈو کی کچھ تربیت حاصل کی تھی لیکن یہاں معاملہ ہی مختلف تھا۔ اسے اپنے سارے سبق بھولتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ گروپ چونکہ "تخریب کاری" کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو مارشل آرٹس بھی ایسے سکھائے جا رہے تھے جن میں مارو اور بھاگو کے اصول کارفرما تھے۔ انہیں گھیرے میں آنے کے باوجود مسلح لوگوں کی دست برد سے محفوظ رہنے کی خصوصی تربیت دی جا رہی تھی۔

پہلے آدھ گھنٹے کی ورزش نے ہی امریک کے سارے کس بل نکال دیئے۔۔۔۔ لیکن وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران اس نے ایک ٹھگنے قد اور جاپانی نقش رکھنے والے شخص کو کونے میں کھڑے ہو کر انہیں تربیت کرتے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا پھر وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ناقابل برداشت معاملات کی صورت میں وہ دوران تربیت پانچ منٹ تک وقفہ کر سکتے تھے۔

دو گھنٹے اس مسلسل تربیت میں امریک کا ساتھ صرف اٹلی کی ایک لڑکی اور ایک فلسطینی نوجوان حمدان نے دیا تھا۔

"ویل ڈن!" پہلی تربیت کے خاتمے پر سٹیفی نے باری باری تینوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

چائے کے وقفہ میں احمد حمدان اس کا دوست بن چکا تھا۔ اس کا تعلق تنظیم آزادی فلسطین کے اس گروپ سے تھا جو مسلح جدوجہد پر ایمان رکھتا تھا۔ احمد حمدان کو بھارت کے متعلق صرف اتنی معلومات تھیں کہ وہ بڑا امن پسند اور مظلوم عوام کی حمایت کرنے والا

تیسری دنیا کا ملک ہے۔ جب امریک نے اسے بھارت کا مختصر سا تعارف کروایا اور بتایا کہ مسلمانوں کے بعد اب ہندوؤں نے سکھوں کی طرف بھی "دست شفقت" بڑھا دیا ہے تو احمد حمدان چونک پڑا۔

رات کو بریفنگ کے بعد دونوں دیر گئے تک اپنے معاملات پر باتیں کرتے رہے۔ حمدان کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا تھا کہ بھارت میں مسلمان جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں خصوصاً" مقبوضہ کشمیر کے متعلق اطلاعات پر خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

انہیں پندرہ روز میں ہمہ اقسام کے بم بنانے' انہیں مرضی کے مطابق استعمال کرنے' سیکورٹی کے حفاظتی جال کو توڑنے' سیکورٹی انتظامات کے دوران اپنا کام کرنے اور فرار ہونے کی تربیت دی گئی تھی۔ سٹیفی ایک ماہر تخریب کار کی طرح ان کی قدم قدم پر راہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے ان لوگوں سے باری باری مختلف نوعیت کے دھماکے کروا کر ان کا ٹیسٹ لیا تھا۔ ہمہ اقسام کے بم بنانے کے عملی مظاہرے بھی دیکھے تھے۔

ooo

ایک تربیت یافتہ فوجی ہونے کے باوجود کیپٹن امریک سنگھ کے لئے یہاں بہت سی باتیں نئی تھیں۔ رخصت ہونے سے پہلے ان سے باری باری ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق اس بات کا عہد لیا گیا تھا کہ زندگی کے کسی مرحلے پر وہ اس بات کا انکشاف نہیں کریں گے کہ انہوں نے کبھی یہاں تربیت بھی حاصل کی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے انہیں ٹائپ شدہ لسٹیں فراہم کی گئی تھیں جس میں بم بنانے کے لئے متعلقہ سامان حاصل کرنے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک کے اسلحہ ڈیلروں کی لسٹ فراہم کی گئی تھی۔ اس لسٹ میں بمبئی کے ایک ہندو کا نام امریک نے خاص طور سے ذہن نشین کر لیا تھا۔

رخصت ہونے والی رات کو انہیں سکول کی طرف سے خصوصی شراب پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا جس میں احمد حمدان اور امریک سنگھ نے کوئی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور محض بیئر پینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ صبح انہیں رخصت ہونا تھا۔ سب ایک دوسرے سے گرمجوشی سے گلے مل رہے تھے۔ یہ سب تربیت یافتہ تخریب کار تھے لیکن ان کے سینوں میں بھی دل دھڑکتے تھے۔ چند روزہ تربیت اور خیالات کی ہم آہنگی نے انہیں ایک دوسرے کے خاصا قریب کر دیا تھا۔ ایک بات پر تو وہ سب متفق تھے کہ وہ ظالم سے جنگ کر رہے ہیں۔ ظلم کی نوعیت مختلف تھی اور شکل بھی ایک نہیں تھی باقی سب کچھ مشترک تھا۔ احمد حمدان نے رات اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس سے بغلگیر ہو کر اس کے اور اپنے جہاد کی

کامیابی کی دعا کی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے وطن کی آزادی پر ایک دوسرے سے بشرط زندہ ملنے کا عہد دہرایا تھا۔

دونوں کتنے بے وقوف تھے----!

وہ نہیں جانتے تھے جس دنیا میں انہوں نے قدم رکھنا ہے اس کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں۔ وہاں سچ بھی اپنی مرضی کا ہوتا ہے---- اور اپنی مرضی کا جھوٹ بھی۔ بھیڑیوں کے اس ریوڑ میں ان کی حیثیت بھیڑوں سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے اپنے مفادات کے لئے بظاہر ایک دوسرے کی دشمن سپر طاقتیں ایک دوسرے کی بہترین دوست ہو جایا کرتی ہیں اور مظلوموں کے خلاف تو ان کا محاذ ہمیشہ مشترک رہتا ہے۔

عظیم آورش سیاسی اور اقتصادی سودے بازیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

صبح اسے معمول کے مطابق ناشتہ اپنے کمرے میں ملا تھا۔ تھوڑی دیر میں کمانڈر ایک مسلح گارڈ کے ساتھ وہاں موجود تھی۔

"تمہیں اب رخصت ہونا ہے۔" سٹیفی کا لہجہ قطعی غیر جذباتی تھا۔

اس کے ہمراہی نے امریک کا پہلے سے تیار کردہ بیگ اٹھا لیا تھا۔ تینوں کمرے سے باہر گئے جہاں ایک سٹیشن ویگن پر بل کیری ایک مرتبہ پھر اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

"ہاؤ آر یو سولجر؟" اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔

"فائن----!" امریک نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"گڈ لک۔" سٹیفی نے اپنی روایات کے مطابق اس کے دونوں گالوں پر بوسہ لیتے ہوئے رخصت کیا۔

بیگ ویگن میں رکھ کر وہ اپنے گارڈ کے ساتھ واپس گھوم گئی اور بل کے اشارے پر امریک سنگھ ویگن میں سوار ہو گیا---- ویگن دس پندرہ منٹ چل کر رک گئی۔ امریک کی آنکھوں میں پٹی باندھ کر وہ لوگ اسے نیچے لے آئے۔ ایک مرتبہ پھر اسے بازو سے پکڑ کر پیدل چلایا گیا۔ پھر ایک اور ویگن میں سوار کر دیا گیا۔

○○○

ویگن کی روانگی کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ اس مرتبہ اس کی ہمراہ ایک لڑکی اور سابقہ لمبا تڑنگا انگریز تھا جو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مسکرا دیا۔ لڑکی اور اس کا ساتھی شراب نوشی میں مشغول رہے۔ انہوں نے امریک کے لئے حسب سابق کافی

اور کولڈ ڈرنکس رکھے ہوئے تھے۔ ویگن کے شیشوں سے باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس مرتبہ سفر تقریباً" تین گھنٹوں پر محیط تھا۔ سفر کا اختتام ایک پررونق بازار میں ہوا۔ غالباً" یہ کسی شہر کا "سٹی سینٹر" تھا۔ وہ لوگ شاید وقت ضائع کرنے کے لئے ویگن کو سڑکوں پر گھما رہے تھے۔ انگریز نے گھڑی پر نظریں جما رکھی تھیں پھر ویگن رک گئی۔

"او کے سولجر!" اس کے ہمراہیوں نے ایک جگہ گاڑی روک کر اس کے اندر بیٹھے ہی ہاتھ ملایا۔ شاید مطلوبہ وقت ہو گیا تھا۔

"یہاں تمہارا ساتھی تمہیں لینے آئے گا۔" دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی نے ایک سٹور کی طرف اشارہ کیا۔

ویگن آگے بڑھ گئی اور امریک سڑک عبور کر کے سٹور کے سامنے لڑکی کی نشان زدہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں اترنے کے بعد اسے علم ہوا کہ وہ "نیو کاسل" شہر میں موجود ہے۔ بمشکل پانچ منٹ انتظار کے بعد اس نے خورشید کو اپنے سامنے موجود پایا۔ دونوں گرمجوشی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے۔ نزدیک ہی اس نے اپنی کار پارک کر رکھی تھی۔ اب دونوں خورشید کی گاڑی میں "کوئنم سٹریٹ" کی طرف جا رہے تھے۔ اسی سٹریٹ میں موجود گوردوارے پر رک گئے۔

گوردوارے میں پہلے سے اس کی آمد کے منتظر تین سکھوں نے انہیں "خوش آمدید" کہا اور لنگر خانے کی طرف چل دیئے۔

لنگر خانے سے سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا تھا۔ وہ لوگ اپنے پیروں کی طرح اس کا احترام کر رہے تھے پھر وہ خورشید کے ساتھ ٹاؤن میں نکل گیا۔ دونوں سٹی سینٹر کی طرف جا رہے تھے۔ امریک کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود خورشید نے اس کے لئے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔ رات انہوں نے گوردوارے میں بسر کی تھی۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ان لوگوں نے "ارداس" کے ساتھ اسے رخصت کیا تھا۔

خورشید کے علاوہ ایک مقامی نوجوان بھی ان کے ہمراہ تھا۔ گاڑی اس مرتبہ وہی چلا رہا تھا۔ شہر سے باہر ایک "سروس سینٹر" پر رک کر انہوں نے پٹرول سے ٹینک بھرا۔ اب ڈرائیونگ سیٹ خورشید نے سنبھال لی تھی۔

کہر آلود شام لندن کی ٹھٹھرتی ہوئی سڑکوں پر اتر رہی تھی جب وہ ستنام کے گھر پہنچے۔ رات دیر گئے تک سب باتیں کرتے رہے اور صبح دیر گئے تک سوتے رہے۔ اس دوران ستنام نے خورشید کے ساتھ علیحدگی میں کچھ باتیں کی تھیں۔

صبح خورشید تو برمنگھم چلا گیا جب کہ نوورو پریتم سنگھ وہیں رہ گیا تھا۔ خورشید کی روا
کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنا بریف کیس کھولا اور دو پاسپورٹ ستنام کی طرف بڑھا دیئے
ستنام نے تنقیدی نظروں سے باری باری دونوں کا بغور جائزہ لیا' پھر دونوں پاسپورٹ امریک
تھما دیئے۔

"ان دونوں میں سے کوئی ایک پسندیدہ شناخت اپنا سکتے ہو۔"

امریک نے دونوں پاسپورٹوں پر موجود مندرجات کا گہری نظروں سے مطالعہ کرنے
بعد ایک اسے لوٹا دیا۔

"میرے خیال سے یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دل ہی دل میں وہ پریتم کو نجانے اب تک کتنی مرتبہ داد دے چکا تھا۔ اس نے
پاسپورٹ حاصل کئے تھے عمر اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس پر بالکل فٹ بیٹھتے تھے۔

"ٹھیک ہے----" پریتم نے دونوں پاسپورٹ دوبارہ اپنے بریف کیس میں بند کر
تھے۔

"رات کے کھانے پر ملاقات ہو گی۔" اس نے دونوں کو مخاطب کیا اور ہاتھ ملا کر وا
چلا گیا۔

روانگی پر ستنام نے امریک کی تین چار مختلف تصویریں اسے تھما دی تھیں' یہ
پورٹریٹ اس نے اپنے کیمرے سے اپنے گھر کی چھوٹی سی لیبارٹری میں تیار کئے تھے۔

"تم اب اکیلے باہر نکلو اور گھوم پھر کر شہر کا جائزہ لو۔ خیال رہے کہ تم لندن باسی ہو
اس شہر کے متعلق تمہاری معلومات قابل رشک ہونی چاہئیں۔ نئے نام کے ساتھ تم آزا
سے ہر جگہ آ جا سکتے ہو۔ اپنے لاشعور سے بھی یہ بات نکال پھینکنا کہ تم نے امریندر سنگھ
نام پر سفر کیا ہے۔ اب تم ٹھاکر روندر ناتھ ہو اور تمہارا نک نام "روی" ہے۔ پاسپورٹ
لکھے اپنے ایڈریس پر خود پہنچو اور اس علاقے کی سڑکوں اور عمارتوں کو اپنے ذہن میں
لو۔ تمہیں اب ایک مہینہ صرف یہی کام کرنا ہے۔

ستنام نے اسے تازہ ہدایات کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ اپنے نئے حلئے میں اس
داڑھی بہت مختصر کر لی تھی اور مونچھیں ٹھاکروں کی طرح خاصی بڑھا لی تھیں۔ رات
جب وہ لندن کے انڈر گراؤنڈ ریلوے میں لندن کے چاروں اطراف سفر کرنے کے بعد وا
پہنچا تو اس میں خاصا اعتماد آ چکا تھا۔ کم از کم اس نے سفر کرنے کے آداب جان لئے تھے۔

اس کی آمد کے قریباً" گھنٹہ بعد پریتم کی واپسی ہوئی تھی۔ تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا

لیونگ روم میں آ گئے جہاں پریتم نے بریف کیس کھول کر کچھ کارڈ اور کاغذات پاسپورٹ
سمیت ستنام کی طرف بڑھا دیئے۔

ستنام تحسین آمیز نظروں سے باری باری ان کا جائزہ لیتا رہا اور ایک ایک کر کے وہی
کارڈ امریک کو تھماتا رہا۔ پریتم کی فنکاری پر امریک نے دل کھول کر اسے داد دی تھی۔ کمپیوٹر
بھی شاید اس کی چالاکی نہ پکڑ سکتا۔ اس نے کاغذات کمال ہوشیاری سے تیار کئے تھے اور ان
میں ٹھاکر روندر ناتھ کے گزشتہ پانچ سال کا مکمل ریکارڈ موجود تھا کہ اس نے کہاں کہاں یہ
عرصہ گزارا۔

"او کے مسٹر روی! آپ مطمئن ہیں تو میں چلوں۔" اس نے امریک کی آنکھوں میں
جھانکا۔

"ویل ڈن!" امریک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

ooo

دونوں اسے سٹیشن تک چھوڑنے گئے تھے جہاں سے اس نے انٹرسٹی ٹرین پکڑنی تھی۔
یہاں سے دونوں نے مقامی "ڈسکو" کا رخ کیا تھا جہاں سے ان کی واپسی رات دو بجے کے بعد
ہوئی تھی۔ "ویک اینڈ" کی وجہ سے لندن کی کمر آلود سڑکوں پر کاروں میں زندگی اپنی تمام تر
جولانیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ کہیں کہیں سڑکوں پر شراب کے نشے میں دھت نوجوان
لڑکے اور لڑکیاں بھی جھومتے اور ڈگمگاتے دکھائی دے جاتے تھے۔

گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے پیشہ ور عورتیں جن کی ہڈیوں میں سردی اتر رہی تھی' اپنے
جسمانی خطوط کی نمائش پر مجبور تھیں۔ زندگی کا یہ رخ اتنا بھیانک تھا کہ امریک ایک مرتبہ
چکرا کر رہ گیا---- وہ "ڈسکو' پب" یا کسی "نائٹ کلب" میں محض مقامی زندگی کے اسرار
و رموز سے آشنائی حاصل کرنے جاتا تھا۔ تفریح کرنے نہیں---- اس کے باوجود اسے یہ
سب کچھ کبھی پسند نہیں تھا۔ رات ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے گرم بستر میں منتقل ہوا۔

ooo

بھارتی قونصلیٹ گلگرنی کے سامنے ورشن کا وزیٹنگ کارڈ دھرا تھا اور وہ اپنے ذہن پر زور
دے رہا تھا کہ اس شخص کو کیسے جانتا ہے' پھر اسے یاد آ گیا کہ ورشن تو بخشی کا سیکرٹری
ہے۔

"لیکن یہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

یہی تھا وہ سوال جو بار بار اس کے ذہن کو کچوکے دے رہا تھا۔ اس جھنجٹ میں پڑنے کے بجائے اس نے کرنل مہتہ کو براہ راست معاملات میں لانا زیادہ مناسب سمجھا۔ جب درشن اس کے آفس میں داخل ہوا تو میز کے دوسرے کونے پر کرنل مہتہ بھی موجود تھا۔

"مجھے آپ سے علیحدگی میں بات کرنا تھی۔" درشن نے نمسکار کے بعد گنگنی کو براہ راست مخاطب کیا۔

"مطمئن رہو' مہتہ صاحب اپنے آدمی ہیں۔"

"میں انہیں جانتا ہوں جناب۔" درشن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

ایک مؤدب ویٹران کے لئے کافی کے مگ رکھ کر چلا گیا۔

"میں آپ کو زیادہ دیر شش و پنج میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ آپ میرے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ جناب! میں براہ راست آپ سے "ڈیل" کرنا چاہتا ہوں۔ اگر بخشی صاحب نے بڑھ کر آپ کو مطمئن نہ کر سکا تو آپ کو حق حاصل ہے جب بھی چاہیں اس ڈیل کو ختم کر سکتے ہیں۔" درشن نے کافی کا ایک لمبا گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد اپنی وہ بات کہہ دی جس نے اسے پچھلے پندرہ بیس روز سے پریشان کر رکھا تھا۔

"ہوں۔" کرنل مہتہ نے سگریٹ کا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں بناتے ہوئے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

"دراصل پہلے بھی تمام کام میرے ہی ذریعے ہو رہا ہے۔" اس نے سلسلہ تکلم جاری رکھا۔

گنگنی خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا--- مہتہ نے کئی مرتبہ درشن کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑی تھیں۔ درشن اپنے آپ میں بڑا بدمعاش بنتا ہوا لیکن اسے کرنل مہتہ کی آنکھیں اپنے جسم میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں۔

اب مہتہ نے براہ راست اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا--- درشن خورشید اور نیلما کے تعلقات کا اشارتاً" ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی یہ "کارڈ" کھیلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ عین مناسب موقع پر یہ "ترپ چال" چلنا چاہتا تھا۔ یہ ساری بساط وہ ایک چال کو چلنے کے لئے ہی تو بچھا رہا تھا۔ کرنل مہتہ اسے اپنے آفس میں لے آیا تھا۔ جانتا تھا گنگنی بخشی کی بیوی کے ساتھ ایک رات گزار چکا ہے اور اب وہ واقعی بخشی کا بہترین دوست بن چکا ہو گا۔ وہ درشن جیسے آدمیوں کو عموماً" ہاتھ میں رکھا کرتا تھا۔ کسی

ایجنٹ کے سر پر تلوار لٹکائے رکھنا اس کی عادت تھی۔ گو کہ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ اپنے محکمے میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن جس تیزی سے اس نے ترقی کی تھی اور جتنے ضرورت سے زیادہ اسے اختیارات حاصل تھے ان کے بعد کوئی اس کے منہ لگنے پر تیار ہی نہیں ہوتا تھا---!

"دیکھو جوان ہمارے بزنس میں "ڈیل" دو طرفہ ہوتی ہے۔ ہم "اس ہاتھ سے دو' اس ہاتھ سے لو" کے اصول کے قائل ہیں۔ بخشی ہمارا بہت وفادار آدمی ہے اور اس کے تعلقات بھی بہت دور تک ہیں۔ اگر تم اس کی جگہ لینا چاہتے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ ہمیں کشمیری حریت پسندوں اور خالصتانیوں کی سرگرمیوں کی پل پل کی خبر چاہیے۔ ہاں ایک طریقہ اور بھی ہے اگر تم بہت جلد ہماری "گڈ بکس" میں آنا چاہتے ہو تو تمہیں ایک قتل کرنا ہو گا----" مہتہ نے اپنی گفتگو کے آخر میں جیسے ہتھوڑا ہی اس کے سر پر دے مارا تھا۔ وہ بڑا کائیاں آدمی تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر کب اور کس شدت سے چوٹ کرنی ہے یہی تو اس نے سیکھا تھا۔

"کس کو؟" درشن نے بڑے اعتماد کا مظاہرہ کیا۔

"گویا تم تیار ہو!" مہتہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جب آپ سے "ڈیل" ہو گئی تو انکار کس بات کا۔"

"ویل' ویل!" مہتہ مسکرایا۔

ooo

اس نے اٹھ کر نزدیکی الماری کا تالا مخصوص کوڈ نمبروں کو ملا کر کھولا اور ایک فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر ایک تصویر لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"کریم خان! یہی ہے وہ شرارتی ذہن جس نے جموں و کشمیر میں ہماری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ یہی ہے بریگیڈیئر پانڈے کا قاتل۔ بس اسے اور جینے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔ بہت جی لیا کمبخت۔" مہتہ نفرت سے پھنکارا۔

"یہ کام ہو جائے گا مہاراج۔" درشن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کام سلیقے اور قرینے سے ہونا چاہیے۔ کسی آدمی کو مار دینا بہت بڑی بات نہیں ہے۔ خیال رکھنا اس ملک میں قتل ہونے کے بعد معمولی سراغ بھی قاتل کی موت کا پھندا بن جایا کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے اتنی ہی صفائی سے قتل کرو جس طرح اس نے پانڈے کو قتل کیا تھا۔" کرنل مہتہ کے لئے اپنی نفرت کے اظہار پر قابو پانا ناممکن ہو رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں مہاراج! کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن کام ہو جائے گا۔"

"ہم تمہاری قسمت بدل ڈالیں گے درشن۔ وہی بخشی جو آج تم پر حکومت کر رہا تمہاری جوتیاں چاٹنے پر مجبور ہو جائے گا۔" مہتہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ جماتے ہو کہا۔

درشن جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

جب وہ قونصلیٹ بلڈنگ سے رخصت ہو رہا تھا تو یہ بات اس کے وہم و گمان میں نہیں تھی اس کی آمد سے روانگی تک کی مکمل فلم تیار ہو چکی ہے۔ کرنل مہتہ نے اسے سے اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ ابھی بخشی کے ساتھ اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہ لائے گا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ منافقت کا خول اپنے چہرے پر چڑھائے رکھنا ہی اس کی کا کا راز ہے۔ اس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل رہا تھا کیونکہ پہلی ہی ملاقات ثمر ثابت ہوئی تھی۔ وہ یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جا رہا تھا۔ اپنے ساتھ بہت کچھ لے آیا تھا۔ ایک سہانے مستقبل کا خواب اور بخشی کی مغرور بیٹی نیلما کو اپنے قدموں میں دینے کی خواہش بھی اسے پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

ورشن کے برمنگھم پہنچنے سے پہلے اس کی کرنل مہتہ کے ساتھ طویل اور قونصلیٹ کے ساتھ مختصر ملاقات کی خبر بخشی کو مل چکی تھی۔ بخشی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں ہر جگہ اس کے آدمی موجود تھے اور اپنے خاص آدمیوں نے معمولات سے باخبر رہنا تو وہ ضروری خیال کرتا تھا۔ جتنا کوئی اس سے زیادہ نزدیک ہوتا اس کے ذاتی معاملات پر بخشی نظر اتنی ہی گہری ہوتی تھی۔

"الو کا پٹھا! ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

OOO

دو ماہ اس نے لندن کی آوارہ گردیوں کی نذر کر دیئے تھے!

اب اسے یہاں کے معمولات کا مکمل ادراک تھا اور روندر ٹھاکر نے ماضی میں جہاں وقت گزارا تھا' ان مقامات کے متعلق مکمل آگاہی حاصل ہو چکی تھی۔ اس کی میں اعتماد لوٹ آیا تھا۔ خدا ہی جانے ابھی اس نے اور کتنے بہروپ بھرنے تھے۔ فی الو اپنی موجودہ شناخت کو ہی اس نے اپنی مکمل شناخت بنا لیا تھا۔

آج پھر وہ لوگ کریم خان کے ہاں اکٹھے ہوئے تھے۔

اکٹھے ہونے والوں کی تعداد دس تھی لیکن امریک' خورشید' کریم خان اور ستنام سنگھ علاوہ اور کسی کے نام سے آگاہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

یہ ان کے درمیان منصوبہ طے پا چکا تھا۔ آزادی کشمیر تحریک اور تحریک آزادی خالصتان کے درمیان یہ پہلا باقاعدہ معاہدہ تھا جس کے تحت وہ عملی قدم اٹھا رہے تھے۔ اس منصوبے کے مرکزی کردار خورشید اور امریک کو ادا کرنا تھے۔ دونوں نے بھارت کے لئے الگ الگ سفر کرنا تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ دونوں گروپوں کے لوگوں نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اس مہم کی کامیابی کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی۔ پھر وہ الگ ہو گئے۔ اب خورشید اور امریک کو اگلی ملاقات بھارت میں کرنی تھی۔

اگلے روز جب نیلما خورشید سے ملی تو خورشید نے جیسے اس کے دل کی بات کہہ دی۔

"سری نگر جانے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

"واقعی۔۔۔۔؟" نیلما نے خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

"ہاں! آج کل موسم بھی بہت شاندار ہے۔ مارچ میں کشمیر کا حسن دو چند ہو جاتا ہے۔"

"میں بھی چلوں گی۔ میرا دل بھی بہت چاہتا ہے۔"

"نیلما! یہ میری خوش قسمتی ہو گی کہ تم میری ہم سفر بن رہی ہو۔" خورشید نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر عجیب سی حرکت کر ڈالی۔

دونوں میں اگلے ہفتے ہی روانگی کا پروگرام طے پا گیا تھا۔ خورشید کی درخواست پر ان کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا تھا کہ دونوں ہمسفر تو ضرور ہوں گے لیکن یہاں کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ نیلما کے لئے یہ بات بہت عجیب تھی۔ لیکن خورشید کے بضد ہونے پر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے جذبات کا احترام کرے گی۔

OOO

اگلے روز ورشن کے کانوں تک یہ افواہ پہنچ چکی تھی کہ خورشید اس ہفتے امریکہ جا رہا ہے۔ شاید یہ کشمیری وہاں کوئی کانفرنس کرنا چاہتے تھے۔

اس نے اپنی طرف سے کرنل مہتہ کو پہلی باقاعدہ رپورٹ دی تھی کہ کشمیری یو این او کے سامنے کسی مظاہرے کا پروگرام بنا رہے ہیں جس میں شرکت کے لئے تحریک آزادی کشمیر کا خطرناک دہشت گرد خورشید کاشمیری بھی اگلے ہفتے نیویارک جا رہا ہے۔

"ایف بی آئی" کو نیویارک میں کشمیری دہشت گرد کی آمد کی اطلاع "را" کی طرف سے باقاعدہ دی گئی تھی۔ واشنگٹن اور نیویارک کو چوکس رہنے کی ہدایات جاری ہو گئی تھیں اور خورشید کی تصاویر امریکہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر سیکورٹی حکام کو فراہم کر دی گئی

تھیں۔ یہ اس کی کلین شیو تصاویر تھیں۔

اگلے ہفتے وہ نیلما کے ساتھ برٹش ایئرویز کی ایک فلائیٹ کے ذریعے دہلی کی طرف پرواز تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ نیلما نے اس روپ کو بہت پسند کیا تھا' یہ الگ بات تھی کہ خورشید کی پاسپورٹ پر لگی تصویر میں اس داڑھی بھی موجود تھی اور پاسپورٹ پر اس کا مکمل نام فاروق خورشید درج تھا۔ اس بات تصدیق ان لوگوں کو ہو چکی تھی کہ "را" کی فائلوں میں اسے خورشید کاشمیری ہی لکھا ہے۔

دونوں کی سیٹ مشترکہ تھی لیکن کماری نیلما کو رخصت کرنے کے لئے آنے والی اس ماں مسز بخشی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ جہاز کی روانگی تک وہ لاؤنج میں موجود رہی پھر چلی گئی۔ دونوں امیگریشن کی حدود پار کرنے کے بعد اکٹھے ہوئے تھے اور اب برٹش ایئر کے جہاز میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سفر کر رہے تھے۔

ایف بی آئی کے کارندے نیویارک اور واشنگٹن کے ہوائی اڈوں پر خورشید کے منتظر تھے جب اس کا جہاز دہلی ایئرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔

میدانِ کارزار میں

دہلی ایئرپورٹ پر بخشی کی بیٹی کا استقبال کرنے کے لئے اہم شخصیات موجود تھیں۔ جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہی وہ خورشید سے چپک گئی تھی۔ یہ اس کے دوست کی خواہش تھی کہ وہ اسے فاروق کے نام سے پکارے۔ یوں بھی یہ نام کماری نیلما کو کچھ زیادہ ہی پسند تھا۔

"مائی فرینڈ مسٹر فاروق۔" اس نے آنے والوں سے خورشید کا تعارف کروایا۔

ان لوگوں کو کماری نیلما کے ساتھ کسی نوجوان کی آمد کی کوئی باقاعدہ اطلاع تو نہیں تھی لیکن وہ سمجھتے تھے کہ جس سوسائٹی سے اس کا تعلق ہے وہاں یہ عام سی بات ہے۔ یوں بھی کسی نے خورشید کی موجودگی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان لوگوں نے خود ہی ان کے پاسپورٹ امیگریشن کاؤنٹر پر درج کروائے تھے اور رن وے سے ایک کار انہیں سیدھے "اشوکا ہوٹل" دلی لے گئی تھی۔

آنے والوں میں سے کسی نے نیلما کے بازو میں لٹکتے کیمرے اور اس کی دوست کی گردن سے جھولتے "واک مین" کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد خورشید نے سب سے پہلے اس "واک مین" کے حفاظت سے پہنچ جانے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا کیونکہ اس میں امریک سنگھ کے استعمال کی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑے سلیقے سے نصب کی گئی تھیں۔ باقی استعمال کی چیزیں اس کے اٹیچی کیس میں موجود الیکٹرک چیزوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان تمام منتشر پرزہ جات کو ایک مقام پر اکٹھا کرنے کے بعد وہ لوگ کوئی بھی تباہ کن دھماکہ کر سکتے تھے۔

سامان ان کے تعاقب میں آ رہا تھا----!

خورشید نے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا کہ اس کا اٹیچی کیس کھولنے کا تکلف نہیں کیا گیا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ کماری نیلما کی حیثیت "وی آئی پی" سے بھی کچھ بڑھ کر تھی اور اس کے دوست کا احترام ان کا فرض تھا۔ بے چارے سرکاری ملازموں کو یہی خوف دامن گیر رہا کہ ان سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہو گئی تو شاید

ملازمت سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں کیونکہ نیلما کسی عام سے آفیسر کی نہیں "را" کے ڈائریکٹر کی مہمان تھی۔

دلی کی مقامی برانچ کو ہیڈکوارٹر سے براہ راست احکامات موصول ہوئے تھے۔ ان کی ہوٹل میں آمد کے کچھ دن بعد ہی "را" کا ڈائریکٹر فون پر کماری نیلما سے مخاطب تھا۔

"بیٹی خیریت سے پہنچ گئے؟"

"شکریہ انکل۔" کماری نیلما نے کہا۔

اس نے سلسلۂ کلام ختم ہونے سے پہلے راؤ کو باور کرایا تھا کہ وہ اپنی "پرائیویسی" میں مداخلت پسند نہیں کرے گی۔ راؤ بھی سمجھتا تھا کہ مغربی تہذیب کی پروردہ کماری نیلما اپنے ساتھ کسی محافظ کا وجود برداشت نہیں کرے گی۔ یوں بھی وہ سیرو تفریح کے لئے ہی آئی تھی اور اپنے باپ کو لاعلم رکھ کر اپنا ایک "دوست" بھی ساتھ لے آئی تھی۔ راؤ کو اس دوست کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی لیکن اس نے بخشی سے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اس نے کماری نیلما کو دو فون نمبر دہلی اور سری نگر کے لکھوا دیئے تھے کہ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو وہ ان میں سے کسی ایک نمبر پر فون کر کے ان لوگوں کو مطلع کر دے۔

راؤ نے اسے بھارت کے کسی بھی شہر میں کار بہم پہنچانے کی پیش کش کی تھی لیکن نیلما نے شکریے کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ وہ جب بھی کوئی ضرورت محسوس کرے گی' اسے خود مطلع کر دے گی۔

"انکل میں اپنے ماتا پتا کی جنم بھومی کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں سب کچھ انجوائے کروں گی۔" اس نے کہا تھا۔

راؤ کو علم تھا کہ مغربی مزاج کی حامل یہ لڑکی عام مغربی نوجوانوں کی طرح "ایڈونچر پسند" ہے۔ اس نے بھی کوئی خاص تردد نہیں کیا تھا۔ بس یہ ضرور کہا تھا کہ وہ اپنی آمد اور روانگی سے اسے مطلع کرتی رہا کرے۔ نیلما نے اس سے جیسا تیسا وعدہ کر کے جان چھڑالی تھی۔

دوسرے ہی روز وہ سیرو تفریح کے لئے سری نگر جا رہے تھے۔ سری نگر کے جس ہوٹل میں انہوں نے قیام کیا تھا وہاں اپنے کمرے کا نمبر اسی روز شام کو نزدیکی ٹرنک کال آفس سے خورشید نے ایک مختصر کال کے ذریعے لندن میں صرف کریم خان کو بتا دیا تھا۔

○○○

ٹھاکر رودندر سنگھ کے پاسپورٹ پر سرسری نظر ڈال کر امیگریشن والوں نے اپنا بیرل ہٹا لیا

تھا۔ وہ بڑی پروقار چال چلتا لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا۔ ویزہ لگوانے کے لئے اس نے انڈین سفارتخانے میں جانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ یہ کام مقامی ایجنٹ نے کروا دیا تھا۔ آج جب امریک برٹش شہری ٹھاکر رودندر سنگھ کی حیثیت سے بمبئی کی طرف محو پرواز تھا تو خود کو خاصا پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ کی گھبراہٹ جو یہاں سے لندن روانگی کے وقت اس پر طاری رہی تھی' اب رخصت ہو چکی تھی۔

پین ایم کے جس جہاز سے وہ بمبئی جا رہا تھا اس میں بھی امریک کے لئے خصوصی کلاس کا ٹکٹ خریدا گیا تھا۔

ایئرپورٹ پر امیگریشن کی طرف سفر کرتے ہوئے اس نے جیسے ہی اپنا پاسپورٹ آگے بڑھایا' کاؤنٹر آفیسر کی آنکھوں میں خواہ مخواہ احترام کی جھلک اتر آئی۔

"تھینک یو سر!" اس نے ایک سرسری نگاہ پاسپورٹ پر ڈال کر اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔

کسٹم کاؤنٹر پر اس نے اپنا اٹیچی کیس رکھتے ہی دس دس پاؤنڈ کے تین نوٹ کسٹم آفیسر کی طرف اس طریقے سے بڑھائے تھے کہ وہ پاسپورٹ کے اندراج دیکھنا ہی بھول گیا۔

"ہم مصروف آدمی ہیں بھائی اور تم بھی۔ وقت نہ ہمارے پاس ہے نہ تمہارے پاس۔"

اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے پھسلتی مسکراہٹ نے کسٹم آفیسر کو قدرے نارمل کر دیا تھا۔

"تھینک یو سر! تھینک یو سر----!" اس نے چاک سے اٹیچی کیس اور بیگ پر مخصوص نشان لگاتے ہوئے ایک پرچی اس کے ہاتھ میں تھما دی جو باہری دروازے پر کھڑے ایک کسٹم والے کو اس نے تھماتے ہوئے اپنی ٹرالی آگے بڑھا لی تھی۔

"تاج محل" اس نے باہر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کہا۔

○○○

ٹیکسی ڈرائیور بمبئی کی سڑکوں پر گاڑی اڑاتا اسے بمبئی کے شاندار ہوٹل میں لے آیا تھا جہاں اب ایک آرام دہ صوفے کی نشست سے ٹیک لگائے وہ اپنا اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ رات کا کھانا بھی اس نے اپنے کمرے ہی میں منگوایا تھا۔ خود پر بہت جبر کرنے کے بعد اس نے بالآخر یہ فیصلہ کیا تھا کہ پہلا کام مکمل ہونے کے بعد ہی "اپنے لوگوں" سے رابطہ کرے گا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

رات کے دس بج رہے تھے اور بمبئی کی رونق اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ ایک ٹرنک کال آفس سے اس نے سری نگر کے لئے "ارجنٹ کال" بک کرائی اور چند منٹ بعد

وہ خورشید سے فون پر مخاطب تھا۔ ان کے درمیان بمشکل چند فقروں کا تبادلہ ہی ہوا تھا جب اس نے "نمسکار" کہہ کر فون رکھ دیا۔

ooo

"کون تھا یہ؟" نیلما نے چھٹتے ہی دریافت کیا کیونکہ دونوں کے درمیان یہ معاہدہ طے پا گیا تھا کہ وہ اپنے ایڈریس سے کسی کو آگاہ نہیں کریں گے۔

"مصیبت! اور تم جانتی ہو مصیبت کہہ کر نہیں آتی۔ میں نے صرف برمنگھم اپنے گھر والوں کو خیریت بتائی تھی بدقسمتی سے یہاں اپنے ماموں کا ایڈریس کھو بیٹھا ہوں جن سے ملنا ضروری تھا۔ خدا جانے ان حضرت نے کہاں سے میرا ایڈریس لے لیا۔" خورشید نے وضاحت کی۔

"لیکن یہ ذات شریف ہیں کون؟" نیلما نے جھنجھلا کر دریافت کیا۔

"ٹھاکر روندر سنگھ۔ لندن کا باسی ہے اور عورتوں کا رسیا۔ باپ کی بے پناہ دولت کا اکلوتا مالک' بگڑا ہوا رئیس زادہ اور بدقسمتی سے میرا بچپن کا دوست۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ایسا کرتے ہیں چار پانچ روز کے لئے تم اپنے رشتہ داروں کو بھگت لو اور میں اپنوں کو۔ پھر دو ماہ اکٹھے گزاریں گے اور کسی کو کباب میں ہڈی نہیں بننے دیں گے۔" خورشید نے تجویز پیش کر دی۔

"بات تو تمہاری معقول ہے لیکن دل نہیں چاہتا۔" نیلما نے اس کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

"بھئی ایسا کرنا تو ہے ہی' یوں اچانک اگر تم غائب ہو گئیں تو سارے بھارت کی پولیس میری جان کو آ جائے گی۔" خورشید نے کہا۔

نیلما قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ دو روز بعد نیلما دہلی میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے چلی جائے گی اور خورشید یہاں سری نگر میں اپنے رشتہ داروں کو بھگتائے گا۔ ساتویں روز انہوں نے اسی ہوٹل میں ایک دوسرے سے ملنا تھا۔ نیلما نے اپنے تمام فون نمبر خورشید کو دیے دیئے تھے لیکن اس کی طرف سے کوئی ایڈریس بھی نہیں ملا تھا۔

"بے چارے غریب لوگ ہیں۔ جانے ضروریات زندگی کیسے پوری کرتے ہیں' تم ٹیلی فون کو رو رہی ہو۔"

اس نے واقعی خود کو خورشید کے سامنے بے بس محسوس کیا تھا۔ گو کہ ابھی تک اپنی

زبان سے اس نے محبت کا اقرار نہیں کیا تھا اور اس جذبے کو صرف "دوستی" ہی سمجھنے پر بضد تھی لیکن وہ اب محسوس کرنے لگی تھی کہ بالآخر ایک روز اسے اپنی انانیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔

سری نگر کے ہوائی اڈے سے جب خورشید اسے دہلی کی پرواز پر رخصت کر رہا تھا تو نیلما کے خوبصورت چہرے پر سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے خود پر جبر کر کے اپنے آنسوؤں کے آگے انا کی دیوار کھڑی کر دی ہو۔

ooo

صبح کی فلائٹ سے خورشید جموں پہنچ گیا۔

اس نے نیلما کو رخصت کرنے کے کچھ دیر بعد ہی ہوٹل چھوڑ دیا تھا اور اپنا سامان سری نگر کے ایک محلے کے مکان میں رکھ دیا تھا جہاں اس کی آمد کی اطلاع اس سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ فی الوقت خورشید نے یہاں کے مکینوں کو یہی ہدایت کی تھی کہ اس کی آمد کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔

دوسرے روز وہ جموں جا رہا تھا۔

جموں کے ہوٹل گرینڈز میں امریک اس کا منتظر تھا۔ امریک کو یہاں آئے آج دوسرا دن تھا۔ دونوں رات گئے تک منصوبے کی جزئیات پر بحث کرتے رہے۔ خورشید نے اپنا بیگ کھول کر ریڈیو اور دوسرا سامان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"میں نے پلان میں صرف ایک چھوٹی سی تبدیلی کی ہے۔" اس نے امریک سے کہا۔

"کیا۔۔۔۔؟" امریک جو مختلف پرزوں کو بڑی مہارت سے ایک ٹائم بم کی شکل دے رہا تھا' اپنا ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس مرحلے پر تیسرے آدمی کی شمولیت ٹھیک نہیں۔"

"میں خود بھی یہی کہنے والا تھا لیکن کیا تم اکیلے....."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" خورشید نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں تمہاری محنت رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔"

"او کے۔" امریک نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

رات ڈھل رہی تھی جب امریک نے اپنا کام مکمل کیا۔ اس نے خورشید کو تمام باریکیاں سمجھا دی تھیں۔

"میں نے اس پر تانبے کی پلیٹ نصب کر دی ہے۔ یہ قدرے محفوظ طریقہ بھی ہے۔

تیزاب ڈالنے کے ٹھیک ۳۲ منٹ بعد بم پھٹے گا۔"

"تم صبح کی فلائیٹ سے دہلی واپس چلے جاؤ۔ باقی خبریں تمہیں اخبارات کے ذریعے
جائیں گی۔ ایک بات سے مطمئن رہنا۔ میں گرفتاری نہیں دوں گا۔" خورشید نے اپنے
میں چھپے کیپسول کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ست گورو سچا بادشاہ ایسی نوبت ہی نہیں آنے دے گا۔ مہاراج ہمیشہ چڑھدی کلا رہے
گا۔" امریک نے بڑے مضبوط لہجے میں امید ظاہر کی تھی۔

"یار دعا کرنا۔ کارزار عشق میں پہلا قدم رکھنے جا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کی فکر نہیں
آزادی کی فکر ہے۔ خدا کرے مرنے سے پہلے وہ دن دیکھ لوں۔" خورشید کا لہجہ بڑا گھمبیر
تھا۔

"ست گورو سچا بادشاہ انگ انگ سہائی ہووے۔ دیگ تیغ فتح ہو۔ میرا کلغی دھرا
بچوں کے سر پر سایہ رکھے۔" امریک نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ دونوں جانتے تھے اس مشن
کی کامیابی پر بھارت کے مختلف حصوں خصوصاً کشمیر اور پنجاب میں چلنے والی تحاریک آزادی
کی نظریں لگی تھیں۔ اگر وہ کامیاب رہتے تو حریت پسندوں کے حوصلے دوچند ہو جاتے۔

دہلی کے لئے امریک نے صبح گیارہ بجے کی فلائیٹ پکڑ لی۔ خورشید صبح ناشتے کے بعد ان
سے الگ ہو گیا تھا۔ اسے اب کٹھوعہ کی طرف جانا تھا۔ تحریک آزادی کشمیر جسے غاصبوں
مردہ گھوڑا سمجھ رکھا تھا' آج زندگی کے مکمل ثبوت کے ساتھ ان کے سامنے آنے والی تھی۔

OOO

پٹھانکوٹ چھاؤنی سے آرمی سپیشل دوپہر گیارہ بجے برآمد ہوئی۔ اس میں ڈوگرہ بٹالین
کمپنی نمبر سات اور تین کے دو سو جوان کرنل رامیشور کی کمانڈ میں جموں کی طرف محو سفر
تھے۔ انہوں نے جموں سے اوڑی کی طرف جانا تھا اور اپنی بٹالین کی دوسری کمپنیوں کو واپس
بھیج کر ان کی جگہ سنبھالنی تھی۔ دونوں کمپنیوں کو "براس ٹیک" کی خصوصی مشقوں میں حصہ
لینے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

سپیشل ٹرین جموں کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ کٹھوعہ پل عبور کرنے کے بعد اب
سامبا کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ سامبا سے تین میل پیچھے ہی اچانک ایک زوردار
دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ ٹرین کے درمیانی حصے میں ہوا تھا۔ ممکنہ تخریبی کارروائی سے بے خبر
فوجیوں پر قیامت ٹوٹ گئی۔ انہیں سنبھلنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ درجنوں فوجی دیکھتے ہی دیکھتے
لقمہ اجل ہو گئے۔ مرنے والوں میں لیفٹیننٹ کرنل رامیشور بھی شامل تھا۔ ٹرین کا آخری

حصہ قدرے محفوظ تھا۔ جوان اپنی جانیں بچانے کے لئے دیوانہ وار باہر کود رہے تھے۔ کمپنی
نمبر سیون کے کیپٹن شرما کے اوسان بحال تھے۔ اس نے ہی سب سے پہلے سامنے والی پہاڑی
پر ایک شخص کو دوڑتے دیکھا تھا اور اب اپنے گرد اکٹھے ہونے والے جوانوں کو چلا چلا کر
اس سمت والی پہاڑی کو گھیرے میں لینے کے احکامات جاری کر رہا تھا۔

OOO

کیپٹن شرما کے حکم پر اس کے جوان بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ان کا رخ اس درمیانی
نالے کے پل کی طرف تھا جس کو عبور کر کے وہ دوسری سمت واقع پہاڑی سلسلے میں پہنچ کر
اس مشکوک شخص کو گرفت میں لے سکتے تھے جسے شرما نے اس طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ سب
سے پہلے شرما ہی پل تک پہنچا تھا۔ اس کے چار پانچ جوان اپنے افسر کی حفاظت کے لئے اس
کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ بالکل آرمی کی فارمیشن میں----!

جیسے ہی وہ پل پر پہنچا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سانبا کا پہاڑی سلسلہ لرز اٹھا۔ پل پر
موجود کسی فوجی کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی خارج از امکان تھا کیونکہ پہاڑی نالہ پل سے کم
از کم سو فٹ تو نیچے رہا ہو گا اور اتنی بلندی سے گرنے کے بعد کسی کی جان سلامت رہ جانا
معجزہ ہی ہوتا۔

صوبے دار کرپا رام نے جو زوردار دھماکے کی آواز سے زمین بوس ہو گیا تھا۔ اپنی
آنکھوں سے کیپٹن شرما اور اس کے تعاقب میں جانے والے جوانوں کے پرخچے اڑتے دیکھے
تھے۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔ اس خوف ناک منظر کو دوبارہ
دیکھنے کی تاب اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ کرپا رام اور ڈوگرہ بٹالین کے بچے کھچے جوان
زمین سے چمٹے کافی دیر تک اگلے دھماکے کے منتظر رہے لیکن خیریت گزری۔

سب سے پہلے لیفٹیننٹ چٹو پادھیائے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد باقی جوان اس کی
تقلید میں ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب تربیت یافتہ فوجی تھے اور ایسی
صورت حال کا سامنا کرنے کی تربیت بھی انہیں حاصل تھی لیکن اس طرح اچانک ٹوٹنے والی
قیامت نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ خصوصاً دوسرے دھماکے کے بعد سے تو وہ گڑبڑا کر
ہی رہ گئے تھے۔

"رک جاؤ۔ کوئی جوان آگے نہیں جائے گا۔" لیفٹیننٹ چٹو پادھیائے نے گونج دار آواز
میں سب کو للکارا۔

اسے اور تو کچھ نہ سوجھا' بچے کھچے جوانوں کو اس نے منظم کیا۔ انہیں اسٹینڈ بائی رہنے

کا حکم دیا اور کمپنی کے بیچ رہنے والے دو تین مارٹروں سے پل کے پار والی پہاڑی پر گولہ باری شروع کروا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وائرلیس پر بھی پٹھانکوٹ میں اپنے رجمنٹ ہیڈکوارٹر کو کمپنی پر ٹوٹنے والی قیامت سے باخبر کر دیا تھا۔

"بے وقوف! گدھے!" دوسری طرف سے بریگیڈیئر دت نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "فائرنگ بند کرو' ادھر سویلین بھی ہو سکتے ہیں۔ حادثے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے اور تمہاری عقل گھاس چرنے لگی ہے۔"

"رائیٹ سر۔۔۔۔!" چٹو پادھیائے نے وائرلیس کے سامنے ہی بوکھلاہٹ میں ایڑیاں بجا دیں۔

اگلے ہی لمحے وہ ڈوگرہ رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سامبا میں ڈسپلائے بھارتی افواج کو اس علاقے میں موجود نامعلوم دہشت گردوں کی خبر جاری کر رہا تھا۔ ساری بھارتی فوج "سٹینڈ ٹو" ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پٹھانکوٹ کے آرمی ایوی ایشن سینٹر سے تین ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوئے۔ ان گن شپ ہیلی کاپٹروں کو اس حکم کے ساتھ سامبا کے پہاڑی سلسلے کی طرف روانہ کیا جا رہا تھا کہ وہ بہرصورت کسی دہشت گرد کو زندہ بچ کر نکلنے کا موقع نہ دیں۔ تینوں فی گن شپ ہیلی کاپٹرز کے تعاقب میں بھارتی کمانڈوز کے دو ہیلی کاپٹر بھی کچھ وقفے سے بلند ہوئے جن میں موجود "بلیک کیٹس" اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ان لوگوں کو اس خصوصی ہدایات کے ساتھ بھیجا گیا تھا کہ مقامی آبادی کو اس کارروائی کی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ موقعہ واردات کا معائنہ کرنے کے لئے ایک خصوصی ٹیم الگ ہیلی کاپٹر میں جائے حادثہ کی طرف محو پرواز تھی۔

ooo

خورشید نے پل اور اس پر موجود فوجیوں کی دھجیاں اپنی آنکھوں سے فضا میں بکھرتی دیکھی تھیں۔ اب وہ مطمئن انداز میں سرہلاتا اس راستے کی طرف جا رہا تھا جو اس نے واپسی کے لئے طے کر رکھا تھا۔ قریباً" دو فرلانگ تک وہ بھاگتا چلا گیا۔ اس راستے کا اختتام ایک پکی سڑک پر ہوا جہاں ایک ٹیکسی کار کا بونٹ اٹھائے ایک سکھ اس کا منتظر تھا۔

"او کے" اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی خورشید کے چہرے پر ناچتی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

"لکھ لکھ دادھیاں دیر جی! لکھ لکھ دادھیاں۔۔۔۔" شدت جذبات سے مغلوب ٹیکسی ڈرائیور کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں پر بڑے جبر سے کنٹرول کیا ہوا تھا۔

گرمیت سنگھ جموں میں ٹیکسی چلاتا تھا اور خورشید اس کے ساتھ ہی ایک "ٹورسٹ" کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ گرمیت سنگھ کی جتھے بندی کی طرف سے اسے "مہمان" کی مکمل حفاظت اور "سیوا" کے علاوہ اس کے ہر حکم کی بلاچون و چرا تعمیل کی ہدایات ملی تھیں۔ شاید اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ یہ مہمان ایک خصوصی مشن پر آیا ہے جس کی کامیابی پر ان کی مستقبل کی جدوجہد کا انحصار ہے۔ ٹیکسی کا رخ پٹھانکوٹ کی طرف تھا۔

یہ لوگ جموں سے سفر کرتے اس طرف آئے تھے۔ خورشید نے یہ ٹیکسی ڈرائیور سمیت مقامی ٹورسٹ کارپوریشن سے پانچ روز کے لئے کرائے پر حاصل کی تھی۔ ٹیکسی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے چند منٹ میں ہی ان بوسیدہ کپڑوں سے نجات حاصل کر لی تھی جو اس نے پہن رکھے تھے اور اب وہ دوبارہ قیمتی سوٹ میں اپنی مہنگی "رے بین" کی عینک سمیت موجود تھا۔ اس کے مختصر سے سامان کیمرے اور شکل و صورت کو دیکھ کر کوئی بھی اس کے امیرکبیر غیر ملکی ہونے پر شک نہیں کر سکتا تھا۔

ٹیکسی مقامی ٹریفک کے سیلاب میں پٹھانکوٹ کی طرف جانے والی شاہراہ پر بہے جا رہی تھی۔ کار کی کھڑکی سے ہی دونوں نے باری باری ان دیو ہیکل فوجی ہیلی کاپٹروں کو دیکھا تھا جو دہشت ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے پہاڑی سلسلے کے عقب سے بلند ہوئے تھے۔ ان کا رخ اسی سمت تھا جہاں سے وہ لوگ آ رہے تھے۔

کٹھوعہ سے کچھ دور ہی انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ مقامی پولیس اور آرمی کے جوان سڑک کے دونوں اطراف اس طرح مستعد کھڑے تھے جیسے وہ کسی غیر ملکی مہمان کے استقبال کو موجود ہوں جس کی جان کو مقامی آبادی سے زبردست خطرہ ہے یا پھر دشمن فوج کے حملے کے منتظر!

ooo

کٹھوعہ چیک پوسٹ سے کچھ ادھر ہی انہوں نے بسوں اور کاروں کی لمبی قطار لگی دیکھ لی تھی۔ پولیس اور آرمی کے جوان ایک ایک بس اور کار کی تلاشی لینے اور پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہی کسی کو آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ اس کی بارعب شخصیت پر نظر پڑتے ہی سب انسپکٹر کے پولیس کا ایک انسپکٹر اس کی طرف بڑھا۔

"یس۔۔۔۔!" خورشید نے کار سے باہر نکلتے ہی پھاڑ کھانے والے لہجے میں مخاطب کیا۔

"کہاں جائیں گے آپ سر؟" انسپکٹر واقعی کوئی گدھا نکلا۔

میرا نام فاروق خورشید ہے۔ میں "برٹش نیشنل" ہوں۔ ٹورسٹ ہوں۔ جموں سے آ رہا

ہوں۔ یہ کار میں نے ٹورسٹ کارپوریشن سے پانچ روز کے لئے کرائے پر حاصل کی
اب مجھے کٹھوعہ جانا ہے۔۔۔۔!" خورشید نے چڑ جانے کے انداز سے انسپکٹر پر اپنی اگر
رعب بھی جھاڑ دیا۔

"آل رائیٹ! جناب ٹھیک ہے جناب۔" انسپکٹر نے اگلا سوال پوچھنے کی جرات ہی
کی تھی۔ اس نے ڈرائیور کا لائسنس چیک کیا اور آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

خورشید نے سفید کپڑوں میں انسپکٹر کے نزدیک موجود اس گول پگڑی والے سکھ کو
انداز نہیں کیا تھا جس نے بظاہر ان سے نظریں بچا کر ٹیکسی کا نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ
تھا جو اب نزدیکی ٹیلی فون سے کٹھوعہ پل کے دوسری طرف موجود اپنی ایجنسی کے لوگ
ٹیکسی اور اس کے سواروں پر نظر رکھنے کی ہدایات کر رہا تھا۔

کٹھوعہ پل کے پار بھی کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔ یہ الگ بات کہ ایک کار ان
چپک گئی۔

"تعاقب کر رہے ہیں۔" گورمیت بولا۔

"پروا نہیں' کار کو کسی بڑے ہوٹل میں لے جاؤ۔" خورشید نے لاپرواہی سے کند
اچکاتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی تھوڑی ہی دیر بعد گورمیت نے ہوٹل فلش مین کے اندر پارک کر دی
خورشید نے ڈبل روم لیا اور ایک خطیر رقم ایڈوانس دے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کر
تک گورمیت اسے چھوڑنے آیا تھا۔

"یہ لوگ آپ کا فون سنیں گے۔" اس نے خورشید سے کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔" خورشید نے مطمئن انداز سے سر ہلایا۔

گورمیت مسکرا دیا۔

"تم ایک کام کرو!"

"کیا۔۔۔۔؟"

"مقامی حالات کو تو تم جانتے ہی ہو گے۔ اس ہوٹل کے متعلقہ آدمی سے کہہ کر
لئے کسی کال گرل کا بندوبست کرو۔" خورشید نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"مم میں....." گورمیت گڑبڑا کر رہ گیا۔

"فی الوقت ان لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے مجھے اور کچھ نہیں سوجھ رہا۔ مجھے جو
جلد ان سے جان چھڑانی ہے۔ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں انہیں اپنے پیچھے لگانے نہیں

ooo

گورمیت سنگھ کو اب اس کی باتوں کی سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔ تھوڑی
بعد ہی وہ کاؤنٹر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پیشہ ور ٹیکسی ڈرائیور تھا اور بندے کی شناخت میں
باہر۔ تھوڑی ہی تگ و دو کے بعد وہ متعلقہ آدمی سے ٹکرا گیا۔

"پیسے تمہاری مرضی کے ہوں گے مگر مال صاحب کی مرضی کا۔" اس نے سب کچھ
سمجھانے کے بعد دلال سے کہا۔

"کم از کم ہزار روپیہ ہو گا سردار جی۔" دلال نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
کہا۔

"مہاراج اتنے پیسوں کی تو وہ تمہیں ٹپ وے دے گا سالے! تم سمجھتے نہیں وہ بھارتی
لڑکی نہیں ہے۔"

گورمیت کی بات نے مقابل کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی۔ اس نے پانچ سو
روپیہ پکڑا اور چل دیا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل سے باہر نکلا' ایک سفید پوش اس سے چپک گیا۔
لھانکوٹ کی ایک ماڈرن آبادی کی طرف جو ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی' وہ پیدل ہی جا رہا
قاجب دو مضبوط ہاتھوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف مخاطب کیا۔

"جناب!" رلیا رام نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تھانے چلو۔ ہم پولیس کے آدمی ہیں۔"

"میرا نام رلیا رام ہے' آپ ایس پی .ھٹنا گر صاحب سے پہلے بات کر لیں ورنہ اپنی
وکری سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

"تیرے ایس پی کی....." حملہ آور نے .ھٹنا کو گالی دی اور اسے دھکا دے کر
ڈیک کھڑی جیپ میں پھینک دیا جہاں پہلے سے موجود دو آدمیوں نے اسے اپنی گرفت میں
لے لیا۔ وہ لوگ اسے سیدھا گاندھی نگر کے پولیس اسٹیشن میں لے آئے تھے۔ جیپ انہوں
نے تھانے کی وسیع و عریض عمارت کے کونے میں بنے ایک بڑے سے کمرے کے سامنے
کھڑی کی تھی۔ رلیا رام کو وہ دھکے مارتے ہوئے کمرے میں لے آئے تھے۔

"رلیا رام ہمیں تمہارے ایس پی سے کچھ لینا دینا نہیں' نہ ہی وہ ہمارے معاملے میں
دخل دیں گے۔ نہ ہی تمہیں بچا سکیں گے۔ بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ تم ہمارے
سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات دے دو۔" ایک لمبے تڑنگے آدمی نے اسے مخاطب کیا۔

رلیا رام پہچان گیا تھا کہ یہ سیکورٹی کے لوگ ہیں۔ اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے رہتا تھا لیکن اس مرتبہ کوئی خاص ایجنسی ہی اس کے حصے میں آگئی تھی۔

"پوچھئے مہاراج۔۔۔۔" وہ کسی سے پوچھے بغیر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"تمہارے اور ڈرائیور کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟" دوسرے آدمی نے جو اسے تک لایا تھا' پوچھا۔

رلیا رام نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اس نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ ایسے تماش بین زندگی میں ذرا کم ہی ملا کرتے ہیں۔

"تم کوئی بات چھپا تو نہیں رہے؟" سوال کرنے والے نے اس کی آنکھوں میں جو خدا جانے اس کی آنکھوں میں کیا مقناطیسیت تھی کہ رلیا رام تھرا کر رہ گیا۔

"نہیں مائی باپ!" اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو' ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ اگر ہمارے ساتھ تعاون کرو گے فائدے میں رہو گے۔ ہم کام آنے والے بندے ہیں۔" لمبے تڑنگے آدمی نے جو ان کا لگتا تھا' رلیا رام سے کہا۔

"جو حکم مائی باپ۔" رلیا رام نے دانت نکال دیئے۔

تھوڑی دیر کے بعد رلیا رام کے ساتھ وہی لمبا تڑنگا آدمی جس نے اپنا تعارف ملک نام سے کروایا تھا ایک جیپ میں جا رہا تھا۔ رلیا رام اسے ایک ماڈرن قحبہ خانے پر لے جہاں سے اس نے "مال" آگے سپلائی کرنا تھا۔

"مس کولہاپوری۔" اس نے ملک کا تعارف ایک خوبصورت لڑکی سے کروایا جس نے رلیا رام کی شکل دیکھتے ہی اپنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"ملک" کہہ کر سیکورٹی آفیسر نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ کولہاپوری نے ہاتھ ملانے میں گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ملک اس سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

"آپ کی مہمان نوازی کا لطف تو پھر کبھی اٹھائیں گے۔" ملک نے بیئر کا گلاس حلق انڈیلتے ہوئے اپنا تعارف کروانے کے بعد اسے مخاطب کیا۔ "فی الوقت آپ سے تھوڑی "دیش سیوا" لینی تھی۔"

"بھارت ماتا کے لئے تو اپنی جان بھی قربان ہے ملک صاحب۔" مس کولہاپوری اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

اس کے بدن پر ملی مختلف خوشبوئیں ملک کے دماغ میں گھس کر اس کی نس نس

ازنے لگی تھیں لیکن وہ بڑا منجھا ہوا انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ فی الوقت اسے اپنا کام نکالنا تھا۔

"آپ کو اپنے گاہک کی اصلیت معلوم کرنی ہے۔ صرف اتنا پتہ لگانا ہے کہ وہ کیا وہی ہے جو خود کو ظاہر کر رہا ہے یا پھر معاملہ کچھ اور ہے۔" ملک نے قدرے سنبھل کر اسے کہا۔

"ارے یہ تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" مس کولہاپوری نے مٹک کر کہا۔

"ٹھیک ہے ہماری ملاقات اب کل ہو گی۔" کہہ کر ملک باہر نکل گیا۔ کولہاپوری اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ملک نے مکان کی دہلیز عبور کرنے سے پہلے مس کولہاپوری سے مکمل آشنائی حاصل کر لی تھی۔ اس کے مشاق ہاتھوں نے چند منٹوں میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مس کولہاپوری کوئی عام قسم کی جسم فروش لڑکی نہیں ہے۔

ہوٹل سے ان لوگوں نے خورشید کے کمرے میں لگے فون پر ہونے والی گفتگو سننے کا بندوبست کر لیا تھا۔ گو ابھی تک خورشید ان کے نزدیک مشتبہ نہیں تھا لیکن بھارت کی "ایس بی" (سپیشل بیورو) کسی کو چیک کئے بغیر کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ انہوں نے گورمیت سنگھ پر اچھی طرح نظر رکھی تھی جو ایک تابعدار شوفر کی طرح اپنی گاڑی کے باہر کھڑا اپنے مالک کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔

ooo

مس کولہاپوری جب خورشید کے پاس پہنچی تو اس کے سامنے دنیا کی قیمتی شراب کی بوتل اور آدھا خالی گلاس دھرا تھا۔

"میں اکیلا شراب پیتا ہوں' یہ میری عادت ہے۔ اس پر کوئی سوال نہ کرنا' بحث بھی نہ کرنا۔" اس نے کولہاپوری کو چونکا دینے والے انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

"فائن۔" کولہاپوری نے اپنے جسمانی خطوط نمایاں کئے۔

تمہیں ایک رات کی قیمت ملے گی۔ رات کا استعمال میری مرضی پر منحصر ہے۔ ناچنا جانتی ہو نا۔۔۔۔" خورشید کے اگلے سوال نے اسے پھر چکرا دیا۔

"اوہ کیوں نہیں جناب۔۔۔۔" کولہاپوری نے سنبھالا لیا۔

وہ جانتی تھی اس قماش کے لوگوں خصوصاً غیر ممالک سے آنے والے تماش بینوں نے کیسے کیسے نفسیاتی عوارض پال رکھے ہیں۔ اس نے لندن دیکھا نہیں تھا لیکن وہاں کے "طوائف خانہ آداب" سے ضرور آگاہ تھی۔

"تو پھر آؤ میرے ساتھ ناچو۔۔۔۔" خورشید نے اپنی ٹیپ پر کیسٹ چلا دی۔

دونوں میوزک کی دھن پر ناچنے لگے۔ کمرے میں ہر طرف شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی مس کولہاپوری نے یہی اندازہ لگایا کہ اس کا گاہک بالکل آؤٹ ہو چکا ہے۔

"سر کچھ کھا لیجئے۔۔۔۔" اس نے قریباً ڈگمگاتے ہوئے خورشید سے ملتجی لہجے میں کہا۔

آدھ گھنٹے تک ناچنے سے اس کے جسم کا بند بند درد کرنے لگا تھا۔ اسے یہ شخص پاگل لگتا تھا۔ شدید سردی کے باوجود کولہاپوری کے جسم سے پسینہ پھوار کی طرح بہنے لگا تھا۔ وہ بے بس سی ہو کر اس کی گرفت سے نکل کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

"بس۔۔۔۔" خورشید نے اپنے قدم روک دیئے۔ وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

"سوری سر!" کولہا پوری کے منہ سے بمشکل ہی نکل سکا۔

"تھک گئی ہو شاید' کوئی بات نہیں یہ لو۔" خورشید نے ایک بڑا پیگ بنا کر اسے تھما دیا۔

"تھینک یو ڈیئر!" کولہا پوری نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا وہ واقعی بڑی تھکن محسوس کر رہی تھی۔

پہلے پیگ نے ہی اس کا دماغ آسمان پر چڑھا دیا۔ خورشید کے مشاق ہاتھوں نے شراب میں نیند کے نشے کا اضافہ کر دیا تھا۔ کولہاپوری خود کو ہوا میں تیرتا محسوس کر رہی تھی۔ خورشید نے کھانا کمرے میں ہی منگوایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کولہاپوری نے باقاعدہ اوگلنا شروع کر دیا تھا۔ خورشید اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ تک لایا۔ پھر کولہاپوری کو علم نہ ہو سکا کہ وہ کب نیند کی دیوی کی بانہوں میں سما گئی۔

ooo

علی الصباح جب اس کی آنکھ کھلی تو میز پر رکھی شراب کی بوتل خالی تھی اور خورشید اس کے ساتھ ہی رات والے کپڑوں میں خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے بیدار ہونے کے محض چند منٹ بعد ہی اس نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ مس کولہاپوری کو رہ رہ کر اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ جس مقصد کے لئے یہاں لائی گئی تھی وہ بھی پورا نہیں ہوا۔ شراب پینے' ناچنے اور سونے کے علاوہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ تم تو ایک دم آؤٹ ہو جاتی ہو۔ تم انڈین لڑکیاں ہوتی ہی بہت کمزور ہو بھئی آخری مشرقی روایات وغیرہ وغیرہ....." خورشید نے مسکراتے ہوئے اس کا تمسخر اڑایا۔

"معافی چاہتی ہوں سر! آپ اگر چاہیں تو مجھے کچھ بھی پے نہ کریں۔"

"ارے نہیں بھئی! میں نے تو اپنے پیسے اچھی طرح وصول کر لئے تھے۔ کمال ہے تمہیں احساس ہی نہیں ہو سکا۔" خورشید نے قہقہہ لگایا۔

مس کولہاپوری نے بے یقینی کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے یہ شخص صحیح کہہ رہا ہو' وہ تو نشے میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

"دیکھو معافی تو مجھے مانگنا چاہیے۔ تم نے مجھے بہت خوشی دی۔ بہت انجوائے کیا میں نے۔" اس لمحے خورشید ایک مکمل بدلا ہوا انسان تھا۔

اس نے چند ہی منٹ میں اس فاحشہ کو اپنے الفاظ کے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اس نے نہ صرف کولہاپوری کو توقع سے بہت زیادہ پیسے دیئے بلکہ اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی اسے دیا تھا اور لندن آنے کی پرخلوص دعوت کے ساتھ اس کے ساتھ وقت گزارنے کی شدید خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ مس کولہاپوری کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ ایسے انٹلیکچوئل قسم کے غیر ملکی سے اس کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ وہ کبھی عام آدمی کو خاطر میں نہیں لائی تھی لیکن خورشید کی شخصیت کے سامنے خود کو مکمل لاچار اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔ جب وہ چائے پینے کے بعد وہاں سے رخصت ہو رہی تھی تو خورشید کی طلسماتی شخصیت کی اسیر ہو چکی تھی۔ خورشید نے اپنے ڈرائیور گورمیت سنگھ کے ساتھ اسے گھر بھیجا تھا۔

ooo

صبح ہو چکی تھی۔۔۔۔!

بیرا اس کے کمرے کے باہر اخبار پھینک گیا تھا۔ کولہاپوری کو رخصت کرتے ہی اس نے اخبار پر بے چینی سے نظریں دوڑائیں۔ سارا اخبار کل کے زوردار دھماکے کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ چیختی چلاتی سرخیاں اس امر کی شاہد تھیں کہ ایسے حادثے کی بھارتی فوج ہی نہیں سویلین کو بھی توقع نہیں تھی۔ اخبارات نے مختلف سرکاری حوالوں سے اس دھماکے کی ذمہ داری پڑوسی ملک کے تربیت یافتہ دہشت گردوں پر عائد کی تھی اور حکومت کے اعلیٰ افسران کی طرف سے اس اعلان کی تکرار موجود تھی کہ وہ جلد از جلد دھماکے کے ذمہ داروں کو گرفتار کر لیں گے۔ نشاندہی کرنے والوں کے لئے خطیر رقم کے انعام کا اعلان بھی موجود تھا۔

اس تضاد بیانی پر خورشید صرف زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنی ڈائری کھولی اور مسٹر راؤ کی طرف سے مہیا کردہ نمبروں پر

نظر دوڑا کر آپریٹر کو سری نگر کا ایک نمبر ملانے کی ہدایت کی۔

○○○

ملک فون پر مستعد بیٹھا تھا----!

ہوٹل کے آپریٹر نے اسے کمرہ نمبر ۳۱۵ کے مہمان کی طرف سے جموں کے ایک نمبر فون پر بات کرنے کی اطلاع دی تھی۔ ایکسچینج نے وہ لائن سیدھی ملک کے سامنے رکھے فون سے منسلک کر دی تھی۔ جیسے ہی نمبر ملا اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا تو ملک چونک اٹھا۔ خورشید اس کے چیف سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے سری نگر میں موجود "ایس بی" کے چیف کو اپنا تعارف کروایا تو دوسری طرف سے آنے والی آواز نے ملک کے ہاتھوں پیروں سے جان ہی نکال دی۔

"اس نے راؤ صاحب کو اپنی موجودہ قیام گاہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ابھی دو تین دن گھوم پھر کر پنجاب کی سیر کرنا چاہتا ہے لیکن اسے یہاں آ کر علم ہوا کہ غیر ملکیوں کا پنجاب میں داخلہ بند ہے۔"

"حضور! یہ حکم آپ کے لئے نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیے۔ ابھی میں بندوبست کر دیتا ہوں۔" دوسری طرف سے خورشید نے فون رکھ دیا۔

جیسے ہی اس کا فون بند ہوا ملک کی انگلیاں حرکت میں آ گئیں۔ وہ خورشید کی نگرانی پر مامور تمام لوگوں کو فوراً ہٹ جانے کی ہدایات جاری کر رہا تھا۔

"لیکن سر....." ایک انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

"شٹ اپ سر کے بچے---- وہ تیرا باپ ڈی جی کا ذاتی دوست ہے' جانے کس گدھے الو کے پٹھے نے یہ اطلاع دی تھی۔"

"سر! انسپکٹر گوکھلے نے لکھن پور پل سے سگنل دیا تھا۔"

دوسرے ہی لمحے وہ لکھن پور کی "ایس بی" پوسٹ سے مخاطب تھا۔ ایک اے ایس آئی نے فون ریسیو کیا تھا۔

"جب بھی وہ گدھا گوکھلے یہاں آئے' اسے لائن حاضر ہونے کا حکم سنا دینا۔ جانے کہاں سے جھک مارتے ہوئے آ گئے ہیں یہ لوگ سپیشل بیورو میں۔" اس نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

جیسے ہی اس نے فون رکھا' فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے اس کا چیف مخاطب تھا۔

"کیا بات ہے فون کو اتنا "بیزی" کیوں رکھتے ہو؟"

"سر! میں رپورٹ لے رہا تھا سر!" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"باقی تو سب باتیں پھر کریں گے' فی الحال تم ہوٹل فلیش مین کے روم نمبر ۳۱۵ میں مسٹر فاروق خورشید سے ملو۔ وہ ہمارے خاص مہمان ہیں۔ انہیں پنجاب جانا ہے' اپنا آدمی ساتھ کر دو اور پنجاب میں بھی اپنے لوگوں کو الرٹ رکھنا ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔ معاملہ بہت اوپر تک جا سکتا ہے۔" دوسری طرف سے ملک کو تنبیہہ کی گئی۔

"یس سر! آپ بے فکر رہیں۔" ملک نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہوٹل فلیش مین کے کمرہ ۳۱۵ پر دستک دے رہا تھا۔ اس کا استقبال خورشید کی بجائے ڈرائیور گورمیت سنگھ نے کیا تھا جسے "صاحب" نے ناشتے کے لئے بطور خاص اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ ورنہ تو اس کے لئے ایک سنگل روم الگ سے بک کیا گیا تھا۔

"آئی ایم ورما ملک سر! ان یور سروس۔" اس نے قریباً جھکتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا تھا۔

"آئی ایم فاروق! ویل مسٹر ملک آپ کو شاید چیف صاحب نے بھیجا ہو گا۔" خورشید نے بڑی بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا۔

"یس سر!"

"میں آج کا دن اور رات اسی شہر میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میری ماں یہاں کی رہنے والی تھی۔ پٹھانکوٹ کی بہت باتیں سنایا کرتی تھی مجھے اور ہم تو ملک صاحب ذرا بھگتی والے بندے ہیں۔ دنیا کے ساتھ دین بھی چلتا رہے تو بہتر ہے۔ میری خواہش ہے کہ دربار صاحب بھی دیکھوں۔ وہاں اپنے سکھ دوستوں سے بہت سنا ہے گولڈن ٹیمپل کے بارے میں۔ آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ....."

"جناب جو حکم آپ دیں گے اس کی تعمیل ہو گی۔" ملک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے ادھر کا تو علم نہیں مسٹر ملک لیکن ہمارے ہاں کسی کی "پرائیویسی" میں دخل اندازی کو اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ میں اپنے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا پسند نہیں کروں گا۔ یو سی! کہ ہم لوگ یہاں ہندوستان میں چینج کے لئے آتے ہیں۔ میں نے راؤ صاحب کو شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ میں کوئی دی آئی پی نہیں کہ میری حفاظت کے لئے گارد دی

جائے۔ یوں بھی میں عام انسانوں کی طرح انجوائے کرنا چاہوں گا۔" اس نے ملک کو باتوں باتوں میں خبردار کر دیا تھا۔

"آپ کی ہر خواہش کا احترام ہو گا فاروق صاحب۔" ملک مسکرایا۔

"ٹھیک ہے میں کل آپ سے اگلے پروگرام کے لئے رابطہ قائم کروں گا۔ آپ مجھے اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیں۔" ملک نے میز کے قریب دھری سلپ پر اپنا نمبر لکھ کر اس کے حوالے کیا اور باہر نکل آیا۔ یہ شخص اس کے اندازے سے زیادہ سمجھدار تھا اور ملک کو یہ بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے کوئی چالاکی دکھائی تو یہ شخص ان کے لئے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ بہرحال وہ ڈی جی کا خاص آدمی تھا۔

ایک ہی منزل کے راہی

ملک کی روانگی کے بعد وہ ہاتھ میں بریف کیس لئے ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا جہاں گورمیت سنگھ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ اس نے مؤدب شوفر کی طرح اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا تھا۔

"رابطہ ہوا۔۔۔۔؟" بیٹھتے ہی اس نے دریافت کیا۔

"ہاں ٹھاکر صاحب ہمیں شوجی کے مندر میں تین اور ساڑھے تین کے درمیان ملیں گے۔" گورمیت نے جواب دیا۔

"فون کہاں سے کیا تھا؟" خورشید نے اطمینان کے لئے پوچھا۔

"ایک میڈیکل سٹور سے۔" گورمیت نے تیزی سے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ہم دو بجے شوجی کے مندر چلیں گے۔"

وہ لوگ دو بجے تک پٹھانکوٹ میں مٹرگشت کرتے رہے۔ گورمیت نے اسے یہاں کی ہر قابل ذکر شے دکھا دی تھی۔ اس دوران خورشید کا کیمرہ مسلسل حرکت میں رہا۔ اس نے کئی جگہ مختلف لوگوں کے ساتھ اپنی تصویریں بنائیں اور دوپہر کا کھانا بھی دونوں نے ایک روایتی "ویشنو ڈھابے" میں کھایا تھا۔

دو بجے وہ شوجی مندر دیکھنے جا رہے تھے۔

گورمیت نے گاڑی مندر کے نزدیک پارک کر دی تھی۔ وہ وہیں رک کر اس امر کا جائزہ لینے لگا تھا کہ کسی نے ان پر نظر تو نہیں رکھی ہوئی۔ خورشید بھی چوکنا تھا۔ وہ گلے میں کیمرہ لٹکا کر اپنا بریف کیس سنبھالتا مندر میں جا گھسا۔ یہاں کچھ اور غیر ملکی بھی پہلے سے موجود تھے۔ آٹھ دس منٹ بعد ہی اس نے امریک کو وہیں بریف کیس ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور وہ مسکرا دیئے۔

"ویل ڈن۔۔۔۔" خورشید کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ کیونکہ امریک نے بم واقعی زوردار تیار کئے تھے۔

"یو ویل ڈن ٹو!" امریک نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امید سے بڑھ کر کامیابی دی ہے واہگورو نے۔ ویر جی آپ کو لکھ لکھ ودھائیاں۔ میں نے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے شاندار نتائج برآمد ہوں گے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کامیابی نے "کھاڑو سنگھوں" کا حوصلہ کتنا بلند کیا ہے۔ کشمیر کی وادیوں میں اس دھماکے کی آواز نے اتنی گونج پیدا کر دی ہے کہ مردوں نے بھی آزادی کی اس پکار پر کان دھر دیئے ہیں۔ نقارہ بج چکا ہے ویر جی! ہم نے طبل جنگ پر ضرب لگا دی ہے۔ سچا بادشاہ اپنی مہر رکھے اب چل سو چل----!" جوش جذبات سے امریک بے قابو ہوا جاتا تھا۔

"وقت کم ہے امریک سیہاں۔ مجھے اگلا حکم سناؤ۔" خورشید نے اس طرف آتے ہوئے ایک جوڑے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"وہاں ہرمندر صاحب میں گور سیوک سنگھ ملے گا آپ سے۔ وہ آپ کو پہچان لے گا۔ سامان اسے منتقل کرنا ہے اور اگلی ملاقات بھی آپ نے ہی اس سے پنجاب سے باہر طے کرنی ہے۔" امریک سنگھ نے چاروں اطراف کا جائزہ لینے کے بعد بڑے محتاط لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ووا کرنا مولا کریم اس امتحان میں بھی پورا اتار دے۔" کہتے ہوئے خورشید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ooo

دونوں نے اپنے ایک جیسے بریف کیسوں کا تبادلہ اتنے نامحسوس انداز میں کیا تھا کہ ان پر گہری نظر رکھنے والا بھی اس تبدیلی کو محسوس نہ کر پاتا۔ خورشید مندر کی مخالف سمت میں جا رہا تھا اور ٹھاکر روندر سنگھ کا رخ مندر کے ہال کی طرف تھا جہاں کتھا اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔

خورشید نے محسوس کیا کہ بریف کیس کا وزن کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کار کی طرف آ گیا۔ دو تین تصویریں اس نے خواہ مخواہ یہاں کی بھی اتار لی تھیں اور اب بظاہر تھکا ماندہ اپنے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔

ooo

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے بریف کیس میں موجود سامان اس بیگ میں منتقل کیا جو اس نے خصوصی ہدایات کے تحت یہاں سے خریدا تھا۔ اسے ایک خاص کمپنی کا بنا ہوا مخصوص رنگ کا پیراشوٹ بیگ خریدنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ شام کو چائے اس

نے کمرے میں پی تھی اور رات گئے تک ہوٹل میں ہونے والے ورائٹی شو کا نظارہ کرتا رہا۔ رات کا کھانا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھا کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور تھوڑی دیر بعد وہ فون پر ورما ملک سے مخاطب تھا۔

"میں صبح دربار صاحب جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ گاڑی میں سفر کرنا پسند کریں گے؟" دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

"شکریہ! میرے پاس اچھی کار موجود ہے۔ میں نے یہ کار لمبے عرصے کے لئے ڈرائیور سمیت کرائے پر حاصل کر لی ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی جناب۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہمارا ایک آدمی آپ کے ساتھ کسی بھی ممکنہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے۔" دوسری طرف سے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا گیا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ مجھے حالات کا علم نہیں۔ اگر حالات اتنے ہی سنگین ہیں تو....." اس نے جان بوجھ کر بات نامکمل چھوڑ دی۔

"ہم کوشش کریں گے جناب کہ آپ کو کم از کم زحمت دی جائے لیکن بار بار کی چیکنگ سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ پسند فرمائیں تو متبادل انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔ کل ہمیں صبح ہی سفر کا آغاز کر دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔ ہمارا آدمی صبح سات بجے آپ کے پاس ہو گا۔"

"تھینک یو!" کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ooo

اگلے روز صبح سات بجے سے پہلے انہوں نے ضروری سامان گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ ٹھیک سات بجے ایک انسپکٹر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنا تعارف امرت راج کے نام سے کروایا تھا۔ شاید امرت راج کو خاص طور سے اس کے لئے منتخب کیا گیا تھا کیونکہ وہ انگریزی روانی سے بول لیتا تھا۔ دونوں امرتسر تک باتیں کرتے آئے تھے۔ کھانا انہوں نے راستے میں ایک ڈھابے سے ہی کھایا تھا۔ اس دوران انہیں تین مرتبہ روکا گیا تھا لیکن امرت راج کے مخصوص اشارے پر کوئی ان سے سوال کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ خورشید نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ "را" کی یہ ذیلی ایجنسی "ایس بی" بھارت کی باقی سیکورٹی ایجنسیوں کے لئے "گستاپو" کی سی حیثیت رکھتی تھی اور شاید بھارت کی سب سے اعلیٰ

سیکورٹی ایجنسی بھی یہی "سپیشل بیورو" تھی۔

دربار صاحب تک وہ لوگ آ گئے تھے۔ کار انہوں نے باہر ہی سی آر پی والوں کی پوسٹ کے نزدیک کھڑی کر دی تھی۔ جہاں امرت راج نے سکھوں کی اس عظیم عبادت کی سیکورٹی پر متعین خصوصی کمپنی کے کمانڈر سے تنہائی میں کچھ بات کی تھی' پھر وہ خورشید کی طرف آیا۔

"آپ لوگ جائیں' میں اس جگہ آپ کو دو گھنٹوں بعد ملوں گا۔ اتفاق سے مجھے یہاں ایک دو کام کرنے ہیں۔ اول تو کوئی آپ سے پوچھے گا نہیں' اگر پوچھے تو کمانڈر بلی مشرا کا نام لے لیجئے۔" امرت راج نے جو اس کا خاصا بے تکلف دوست بن گیا تھا کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج لیکن آ جایئے گا۔" خورشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب اب آپ سے کیا پردہ۔ یہاں میری منگیتر کے ماموں رہتے ہیں اور کل وہ ادھر ہی آئی ہوئی ہے۔" امرت راج نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"تب تو واقعی تمہیں وقت کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔" خورشید نے قہقہہ لگایا۔

"آیئے سر!" اس اثناء میں بی ایس ایف کا ایک باوردی انسپکٹر اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"او کے! نائیس ٹائم۔" خورشید نے امرت راج کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

دونوں انسپکٹر کی معیت میں داخلے کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ خورشید نے بیگ بڑی لاپرواہی سے اپنے کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور کیمرا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ گیٹ پر موجود مسلح گارد نے جیسے ہی انسپکٹر کو دیکھا' ان کے ہاتھ سلیوٹ کے لئے اٹھ گئے۔ انسپکٹر نے خورشید اور گورمیت کی طرف ہاتھ سے مخصوص اشارہ کیا تھا۔

دونوں بھیڑ میں آگے بڑھ گئے' کسی نے ان کو تلاشی کے لئے روکنے کی جرات نہیں کی تھی۔ انسپکٹر باہر ہی رک گیا۔ اس نے انہیں کہہ دیا تھا' اگر کوئی پرابلم ہو تو اسی گیٹ پر بلا لیں۔ دونوں شکریہ ادا کرتے آگے بڑھ گئے۔

"شکر ہے تیرا خدایا۔ لاکھ لاکھ شکر ہے۔" خورشید نے بے اختیار کہا۔

ooo

اب اس کی کمان گورمیت نے سنبھال لی تھی اور وہ اس کو رام داس سرائے کی طرف لے جا رہا تھا۔ کمروں کی لمبی قطار کے سامنے انہوں نے ۲۳ نمبر کمرہ تلاش کیا اور اس میں داخل ہو گئے۔ کمرہ کیا تھا خالصتان حکومت کا دفتر نظر آ رہا تھا۔ اندر خالصتان کے نقشے اور اسلحہ دیواروں پر لٹکتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں موجود اس کمرے کے واحد نگران کو شاید

کا انتظار تھا۔

"واہے گورو جی کا خالصہ۔ واہے گورو جی کی فتح۔۔۔۔" گورمیت سنگھ نے اسے فتح بلائی۔

"آپ گورمیت سنگھ جی ہو؟" وہاں موجود سیوا دار نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" خورشید نے اس کے بجائے جواب دیا۔

"میں لنگر پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔" کہتا ہوا وہ شخص باہر نکل گیا۔

اسے باہر نکلے ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی ہوئے تھے جب دوسری سمت والا دروازہ کھلا اور ایک گٹھے ہوئے جسم اور درمیانی عمر کا سکھ اندر داخل ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی۔

"جھتیدار گورو سیوک سنگھ جی" گورمیت نے دونوں کا تعارف کروایا۔

"مہاراج باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی پہلے آپ یہاں سے کمرہ نمبر ۱۶ میں چلے جائیں۔ باہر موجو ہمارے سالوں نے دوربینیں اس طرف گاڑھ رکھی ہیں۔"

اتنا کہتے ہوئے اس نے کمرے کے ایک کونے میں اسی طرح کا اسی رنگ کا پہلے سے موجود بیگ خورشید کو تھما دیا۔ خورشید نے اپنا بیگ وہیں چھوڑا اور دوسرا بیگ بغیر کچھ کہے اٹھا کر باہر کو لپکا۔

"اس طرف سے!" گورمیت نے مخالف سمت اشارہ کیا جدھر سے وہ اندر آیا تھا۔

دونوں باہر نکل گئے۔ جھتیدار اندر رہ گیا تھا۔ گورمیت اسے ۱۶ نمبر کمرے میں لے آیا جہاں وہی سیوادار ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں لوہے کے دو گلاس پکڑے ہوئے تھے جن میں دودھ موجود تھا۔ دونوں نے دودھ کے گلاس بڑے احترام سے تھامے اور دودھ پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے جھتیدار کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔

"سفر خیریت سے گزرا؟" جھتیدار نے خورشید سے دریافت کیا۔

"بہت خیریت سے سرکاری بندوں کی حفاظت میں یہاں تک آئے ہیں۔" خورشید اور گورمیت کے ساتھ گورسیوک نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔

"میں "سرور" کے اشنان اور "ہرمندر صاحب" کے درشن کر کے آتا ہوں' آپ باتیں کریں۔" اتنا کہہ کر گورمیت باہر نکل گیا۔

"دوائیاں ٹھیک پہنچ گئیں۔" گورمیت کے باہر جاتے ہی خورشید نے پوچھا۔

"ہاں مہاراج۔ بالکل ٹھیک اور بروقت۔" جھتیدار مسکرایا۔

اس نے جس احساس اور تشکر کے ساتھ خورشید کا شکریہ ادا کیا تھا اسے صرف محسوس کر سکتا تھا۔ قریباً" جھکتے ہوئے اس نے خورشید کے گھٹنوں کو چھو لیا تھا۔۔۔!

"جو کچھ آپ جی کر رہے ہیں' اس کا بدلہ تو اللہ واہگورو کے ہاں ہی ہے۔ ہم تمہارے کچھ کر نہیں سکتے۔" گورسیوک کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"جھتیدار جی! ہمارے دکھ سانجھے ہیں۔ وقت آئے گا جب ہماری خوشیاں بھی سانجھی ہوں گی۔ یہ جنگ ہمیں مل کر کندھے سے کندھا ملا کر لڑنی ہے۔ ایک مٹھ ہو کر تب ہی سب کچھ حاصل کر پائیں گے۔ بس یہ ہے کہ آپ حوصلہ نہ ہاریں۔" خورشید نے کہا۔

ooo

دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران جھتیدار نے دہلی میں امریک سنگھ کے ساتھ ملاقات کی جگہ اور وقت کے متعلق خورشید کو آگاہ کر دیا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے تجربات ایک دوسرے کو منتقل کئے تھے اور مشترکہ جدوجہد کے ثمرات اور نقصانات پر بحث کرنے کے بعد ایک لائحہ عمل طے کیا تھا۔ جھتیدار گورسیوک سنگھ نے اسے بتایا تھا کہ بھارتی فوج ہرمندر صاحب پر ایک اور حملہ کرنے کے لئے پر تول رہی ہے کیونکہ اندر سے ہتھیار جمع ہو چکے ہیں اور "کھاڑکو" کسی بھی لمحے کچھ کر گزرنے کو بے چین ہو رہے ہیں۔ اس نے خورشید کو بتایا کہ بھارتی سیکورٹی فورسز نے سکھوں کو مزید اشتعال دلانے کے لئے دربار صاحب کی ہر ممکنہ توہین کا پروگرام بنا رکھا ہے۔

"بنیا ہماری غیرت کا امتحان لینے پر ایک بار پھر تل گیا ہے ویر جی! دعا کرنا مہاراج امتحان میں بھی پہلے کی طرح کامیاب کرے۔" جھتیدار نے کہا۔

گورمیت سنگھ اپنی عبادات سے فارغ ہو کر واپس آ گیا تھا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ گورسیوک نے ان کے لئے لنگر وہیں کمرے میں منگوا لیا۔ لنگر سے فارغ ہونے کے بعد دونوں کو اس نے الوداع کہا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے اور گورمیت نے مل کر ارداس پڑھی تھی۔ دونوں نے بادل نخواستہ باہر موجود امرت راج کے لئے "کڑھا پرشاد" بھی لے لیا تھا۔ اگلی کسی اچھی ملاقات کے ساتھ جھتیدار نے انہیں رخصت کیا تھا۔

دونوں نے قریباً" تین گھنٹے اندر گزار دیئے تھے۔ باہر گیٹ پر امرت راج بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"خیریت! میں تو گھبرا ہی گیا تھا۔" امرت راج نے خورشید کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔

"اجی کہاں خیریت۔ بس ایک بیوقوف سے پالا پڑ گیا تھا۔ کمبخت گھنٹہ بھر بحث کرتا رہا۔ بھلا تم یہ بتاؤ اول تو یہ مار دھاڑ صرف فلموں میں ہی اچھی لگتی ہے' چلو اگر عملی زندگی میں بھی یہ لوگ ایسا ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو کیا یہ اس طرح خالصتان بنا لیں گے بے وقوف کہیں کے۔" خورشید بولا۔

"برادر! مجھے تو یہ معلوم نہیں کہ خالصتان بنائیں گے یا نہیں۔ فی الوقت ان لوگوں نے ہمیں ضرور ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ جس کی ڈیوٹی پنجاب میں لگ جائے سارا گھرانہ اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ آفیسر جس سے ناراض ہو جائیں اس کو ادھر پنجاب میں دھکیل دیتے ہیں۔" امرت راج نے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو یار چھوڑو کوئی اور بات کرو۔ ہاں کیسی رہی تمہاری ملاقات۔" خورشید نے باتوں کا رخ بدلا۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ آسمان حالات کی بدبختی پر کسی بھی لمحہ نوحہ کناں ہوا چاہتا تھا۔ ایک بے نام سی وحشت نے امرتسر کے گلی بازاروں میں ڈیرہ جما لیا تھا۔ اندھیرے کے سیاہ ناگ درودیوار پر پھنکاریں مارتے پھر رہے تھے۔ خوف نیزے کی انی کی طرح شام ڈھلتے ہی یہاں کے مکینوں کے کلیجوں میں اترنے لگتا تھا۔ وہ لوگ سی آر پی کی دو جیپوں کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ امرت راج نے رات یہیں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے خورشید کو بتایا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد یہاں زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ان کا سفر موت کا سفر بھی بن سکتا تھا۔ اس لئے وہ اب صبح ہی پٹھانکوٹ واپس جائیں گے۔ اس نے پہلے سے ہی امرتسر کے بہترین ہوٹل میں دو کمرے ریزرو کروا لئے تھے۔

تارکول کی سیاہ لمبی سڑک پر دور دور تک سوائے سیکورٹی یا فوج کی گاڑیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی فائر کی آواز ضرور رات کا کلیجہ چھلنی کر دیتی تھی۔

"بسا اوقات معمولی شک پر یہ لوگ فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔" امرت راج نے خورشید کی سوالیہ نظروں کا مفہوم جان لیا تھا۔

"یار معاملہ واقعی سیریس ہے۔ میں تو مذاق سمجھ رہا تھا۔" خورشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی پہلے مذاق ہی سمجھا کرتا تھا۔ اس علاقے میں تین ماہ ہماری ڈیوٹی رہی ہے۔ پانچ ساتھیوں کا گروپ آیا تھا یہاں اور ہم دو ایسے خوش قسمت تھے جو زندہ بچ کر گئے تھے۔ صحیح سلامت میں اکیلا گیا تھا' دوسرے کو تو سٹریچر پر ڈال کر لے جانا پڑا۔" امرت راج کو جیسے

اچانک بھولا ہوا ماضی یاد آ گیا تھا۔

"کمال ہے یار! تم لوگ تو سادہ کپڑوں میں ہوتے ہو' تمہیں یہ کیسے پہچان لیتے ہیں؟" خورشید نے جان بوجھ کر اسے ٹٹولا۔

"ان کے بہت ذرائع ہیں۔ بیوقوف نہ سمجھو انہیں۔ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے ان کا سلسلہ۔ کڑی سے کڑی ملتی ہے اور یہ جال بنتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ہمدرد کہاں نہیں۔ صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی سکھ بھی اب قابل اعتبار نہیں۔" آخری بات اس نے جان بوجھ کر قریباً" سرگوشی کے انداز میں خورشید سے کہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چلاتے ہوئے گورمیت تک اس کی آواز پہنچ سکے۔

ہوٹل پہنچ کر تینوں پہلے سے ریزرو اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امرت راج اور خورشید ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ اس نے خورشید کے لئے کچھ منگوانا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔

"یار ابھی ہرمندر صاحب سے آ رہا ہوں۔ ۲۴ گھنٹے تو گزر لینے دو۔" اس نے امرت راج کو ٹرخایا۔

امرت راج نے اپنے لئے ایک پیگ منگوا لیا تھا۔ خورشید اسے اکیلا چھوڑ کر باتھ روم کھول کر کی تھی۔ واقعی وہ ان لوگوں کی مہربانی سے مصائب کا ماؤنٹ ایورسٹ سر کر چکا کمرے میں چلا گیا۔ اس نے سوچا نیلما کو فون تو کر لے جس کے سبب اس نے اتنی کٹھن دوپہر کے بعد وہ ایک ڈھابے میں امریک سنگھ سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے امریک اور اہم منزل سر کی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے آپریٹر کو نمبر ملانے کو کہا اور تھوڑی دیر تک گور سیوک کا پیغام اور اندر کے حالات پہنچا دیئے تھے اور اسے سری نگر میں اپنے بعد نیلما لائن پر تھی۔

"میں تمہیں سری نگر فون کرتی رہی ہوں' کہاں ہو؟" اس نے چھٹتے ہی کہا۔

"ارے بابا تمہیں کہا تو تھا کہ رشتہ داروں کو بھگتا رہا ہوں۔ یہاں امرتسر میں میرے کئی ماموں کا کاروبار ہے ان سے ملنے آیا ہوں۔ صبح واپس چلا جاؤں گا۔۔۔۔" اس نے پٹھانکوٹ والے ہوٹل کا نمبر نیلما کو لکھا دیا۔

"خیال رکھنا صرف تین دن باقی ہیں' اس کے بعد....." نیلما نے لمبی سانس بھری تھی۔

"ہاں ہاں مجھے علم ہے بھئی۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ تمہارے بغیر ایک ہفتہ کیسے گزرے گا!" خورشید نے جدائی کا رونا رو دینا ہی مناسب سمجھا۔

نیلما تو بہت دیر تک باتیں کرنے پر تلی ہوئی تھی لیکن خورشید نے اسے بتایا کہ وہ باتھ روم سے فون کر رہا ہے۔ کسی اور کو بھی لائن کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ نیلما نے بادل نخواستہ

الوداع کہا تھا۔

جس اندیشے کے تحت اس نے فون کیا تھا اس کی تسلی ہو گئی تھی۔ شاید نیلما نے اپنے کو فون کیا ہی نہیں تھا اگر کیا تھا تو خورشید کا ذکر نہیں کیا ہو گا ورنہ بخشی کو ضرور تشویش لاحق ہوتی۔ خورشید اب بھی یہی چاہتا تھا کہ نیلما کے نزدیک ہی رہے۔ ممکن ہے وہ اس کی غیر موجودگی میں اپنے باپ سے بے تکلف ہی نہ ہو جائے۔

ooo

صبح وہ لوگ پٹھانکوٹ کی طرف عازم سفر تھے۔

ہوٹل پہنچ کر خورشید نے امرت راج کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ پٹھانکوٹ میں ہے' امرت راج کی مہمان نوازی سے ضرور لطف اندوز ہوتا رہے گا۔

امرت راج کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد ملک فون پر اس سے مخاطب تھا اور سفر بخیریت گزر جانے کی تصدیق طلب کر رہا تھا۔ خورشید نے اس کی اور اس کے آدمیوں کی تعریف

دوپہر کے بعد وہ ایک ڈھابے میں امریک سنگھ سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے امریک سنگھ کو جو مشن سونپا گیا تھا وہ اس نے مکمل کر لیا تھا۔

امریک سنگھ نے اسے گورداسپور کا ایک نمبر لکھواتے ہوئے کہا تھا کہ یہاں اس کے لئے کوئی پیغام چھوڑا جائے گا وہ اس تک کچھ ہی دیر میں پہنچ سکتا ہے۔ اب دونوں کو الگ ہو جانا تھا۔ اس کے بعد امریک سنگھ نے میدان عمل میں کودنا تھا۔

رخصت دونوں تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے تھے۔

پہلے امریک سنگھ ڈھابے سے باہر آیا تھا۔ اس کی روانگی کے کچھ دیر بعد وہ دونوں بھی باہر آ گئے تھے۔ کار کا رخ فلیش مین ہوٹل کی طرف تھا۔ گزشتہ روز کے دھماکے کی گونج ابھی تک پٹھانکوٹ کے گلی بازاروں میں سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے ڈھابے میں بھی لوگوں کو زیادہ تر اسی موضوع پر باتیں کرتے سنا تھا۔

ooo

اگلے روز خورشید نے پٹھانکوٹ کے اس ہوٹل کو چھوڑ دیا۔ اب وہ دوبارہ جمو
طرف واپس جا رہا تھا۔ جہاں شام کی فلائٹ سے اسے سری نگر جانا تھا۔ گورمیت سے
ہوتے ہوئے اس کا دل بھر آیا۔ اس نے قدم قدم پر خورشید کا ساتھ دیا تھا۔ گورمیت
خورشید کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ وہ اسے کچھ پیسے دینے پر تلا ہوا
گورمیت نے وہ پیسے اس شرط پر قبول کئے تھے کہ وہ ان میں سے آدھے "پنتھ کی سیوا"
لئے دے دے گا۔

اسی شام ایئر انڈیا کا ایک بوئنگ خورشید کو سری نگر کی طرف اڑائے لئے جا رہا
سرسبز و شاداب زندگی سے بھرپور پہاڑیوں پر پرواز کرتے ہوئے وہ اپنی کھڑکی سے نیچ
بسیط کی بیکراں وسعتوں میں گم سوچ رہا تھا: "کیا کبھی اس وادی جنت نظیر کے مکیں
آزادی کا سانس لے پائیں گے؟"

سورج کی روشنیاں پہاڑی چوٹیوں پر جمی برف سے منعکس ہو کر ساری وادی میں
رہی تھیں۔ وہ جہاز کے اندر بیٹھ کر دھوپ کی نرم کرنوں میں چھپی ممتا کی آغوش کا ا
کر سکتا تھا۔ خورشید کے خیالات کا سلسلہ ایئر ہوسٹس کی آواز سے ٹوٹا جو سری نگر کی
اعلان کرنے کے بعد مسافروں کو حفاظتی بیلٹ باندھنے اور کرسی کی پشت سیدھی کر
تلقین کر رہی تھی۔

ooo

دونوں نے اپنے کان بی بی سی کی خبروں پر لگائے ہوئے تھے۔ ٹی وی کی باقاعدہ
سے پہلے خبروں کے فلیش دکھائے جا رہے تھے۔ اچانک ہی کریم خان نے اسے جھنجھوڑ ڈا
"ستنام سیہاں! دیکھ رہے ہو۔" اس نے ٹی وی سکرین کے نزدیک پہنچ کر انگلی سے
خبر کی طرف اشارہ کیا جو ابھی ابھی فلیش ہوئی تھی اور بھارتی مقبوضہ جموں کے علاقے
کسی زبردست دھماکے کی خبر سنا رہی تھی۔

خبروں کے آغاز تک دونوں اپنے سانس روکے وہیں جمے رہے۔ خبر میں ٹرین کی تب
منظر دکھایا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ خصوصی فوجی ٹرین تھی جس میں موجود فوجی
جنگی مشقوں میں حصہ لینے جا رہے تھے۔ دونوں شدت جذبات سے ایک دوسرے سے
ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں الگ الگ کاروں میں لندن میں ایشیائی لوگوں کے مرکز
ہال کی طرف جا رہے تھے۔

گورودوارہ سنگھ سبھا میں مجلس پہلے ہی سے جمی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی کمرے میں موجود
تمام سکھوں نے زوردار آواز میں جے کارہ بلند کیا تھا۔ وہ شدت جذبات سے باری باری ایک
دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ گیانی بلکار سنگھ کی سفید داڑھی بار بار آنسوؤں سے بھیگ
رہی تھی۔۔۔۔ اسے دو مہینے پہلے پولیس کے جعلی مقابلے میں مارا جانے والا اپنا گھبرو یاد آ گیا
جسے بھارتی سیکورٹی فورسز نے سامبا کے نزدیک ایک "پولیس مقابلے" میں مارنے کا دعویٰ
کیا تھا۔ حالانکہ پولیس نے سرون سنگھ کو دوران تفتیش اذیتیں دیدے کر ہی مار ڈالا تھا اور
اس کی محض لاش پھینکنے کے لئے اس جگہ کو منتخب کیا تھا۔

"گیانی جی! تیرے سرون سیہاں کے خون کے ایک ایک قطرے کے بدلے ایک ایک
دشمن مرے گا۔" ستنام نے اس سے بغلگیر ہو کر کہا۔

"میرے سینے میں ٹھنڈ پانے والے ست گورو سچا بادشاہ تیری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔
میرے انگ انگ سہائی ہو کر تیری مدد کو آئے۔ ربا اس کی ہر دم خیر خبر۔ نرنکار! اس سورمے
کو سدا چڑھدی کلا میں رکھنا جس نے میرے ارمان ٹھنڈے کئے۔" اس کی ہچکی بندھ گئی
تھی۔

وہاں موجود ہر آنکھ اشکبار تھی۔۔۔۔!

تمام لوگ کریم خان سے بار بار بغلگیر ہو رہے تھے۔ اس رات برطانیہ کے ہر دوسرے
ایشیائی گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دیوانہ وار بغلگیر ہو کر مبارک باد
دے رہے تھے۔ مشترکہ میٹنگ کے بعد ان لوگوں نے یہ کارنامہ خالصتان کمانڈو فورس اور
حزب المجاہدین کے ذمے ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس روز دنیا بھر میں یو پی آئی کے قریباً" ہر دفتر میں بذریعہ فون یہ اطلاع پہنچ چکی تھی
کہ اس ایکشن کی ذمہ واری خالصتان کمانڈو فورس اور حزب المجاہدین نے قبول کر لی ہے۔
عالمی اخبارات کو مقامی نمائندوں نے ٹیلکس روانہ کر دیئے تھے۔ اگلے روز کے بھارتی
اخبارات کی سرخیاں اس ذمہ داری کا راگ الاپ رہی تھیں۔ پہلی کامیابی بڑی اور اہم کامیابی
تھی۔۔۔۔!

ooo

ٹھاکر روندر سنگھ دہلی کے ایک ہوٹل میں منتقل ہو چکا تھا۔

اس روز وہ گوردوارے بہادر گوردوارے کی طرف ایک نئے عزم کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس
بات کا خیال وہ ہمیشہ رکھتا تھا کہ اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔

آج "گور پوربھ" تھا۔ سکھ گوردوار جن دیو کی برسی منا رہے تھے۔ دہلی کے اس کانگریس ذہنیت کے حامل سکھوں کے گوردوارے سے اس نے جب یہ آوازیں سنیں۔

جے تو ہے پریم کھیلن کے چاؤ۔
سر دھر تلی گلی مورے آؤ۔
اول مرن قبول جیون کی چھڈ آس۔
ہو سب ناں کی رینکا تب آؤ ہمارے پاس۔

(اگر تمہیں محبت کا کھیل کھیلنا ہے تو سر تلی پر رکھ کر میری گلی میں چلے آؤ۔ اس شرط کے ساتھ کہ موت تمہاری پہلی پسند ہو گی اور زندگی کی امید چھوڑ دو۔ اگر یہ شرطیں قبول ہیں چلے آؤ۔)

تو اس کے خون کی گروش تیز ہو گئی۔ اس نے جان لیا کہ اب سکھ جاگ پڑا ہے۔ اب وہ راج سنگھاسن لے کر ہی ہٹے گا۔ گوردوارے میں وہ گرنتھ صاحب کو سیس نوانے کے بعد ایک کونے میں بیٹھ کر شبد کیرتن سننے لگا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ کیرتن کرنے والے صرف زبان سے ہی یہ الفاظ ادا نہیں کر رہے' یہ ان کی دل کی آواز بھی ہے۔

اسے بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی جب امریک نے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ شفقت کا دباؤ محسوس کیا۔

"گیانی جی مہاراج----!" اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے جھتیدار گو سیوک سنگھ کے پاؤں چھو لئے۔

"لنگر میں آ جاؤ۔" کہہ کر جھتیدار کیرتن دربار سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لنگر خانے میں موجود تھا۔ چائے کا ایک کپ لے کر وہ جھتیدار تعاقب میں ہی ملحقہ کمرے میں پہنچ گیا جہاں پہلے ہی سے دو تین جانی پہچانی صورتیں مو تھیں۔

"نوجود سیہاں----!" اس نے ایک نوجوان سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ویر جی!" نوجود اس کے سینے سے لگ گیا۔

"ابھی میرے گھر تو اطلاع نہیں ہوئی؟" اس نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

"نہیں ویر جی! پر سردار صاحب کو شاید علم ہے کہ آپ انڈیا آ چکے ہیں۔ جس سامبا میں "دشت سودھے" ہیں اس روز ہی انہوں نے گوردوارے میں سنگھوں کی چڑھ کلا کے لئے بھوگ رکھا تھا۔" نوجود نے کہا۔

"تم بہرحال ابھی انہیں خبر نہ ہونے دینا۔ وقت آنے پر میں خود ملوں گا۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت کچھ.....!"

ببر خالصہ کے جھتیدار اور گوروسیوک سنگھ کی کمان میں ان لوگوں نے ایک مضبوط منصوبہ بنایا۔ اس مرتبہ بھی کیپٹن امریک سنگھ نے ایک بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ لوگ ایس ایس پی کو جیپ سمیت اڑانے کا منصوبہ تیار کر کے اٹھے تھے۔ اس منصوبے میں اہم ترین کردار امریک سنگھ نے ہی ادا کرنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ انہیں علیحدہ علیحدہ پنجاب کی طرف لوٹنا تھا۔

ooo

مکھن سنگھ مذہبی سکھ تھا اور اس کی واحد سفارش یہ تھی کہ وہ بھارتی ہوم منسٹر کا رشتہ دار تھا۔ مکھن سنگھ کو جالندھر کا ایس پی بنے ہوئے تین ماہ ہونے کو تھے۔ ان تین مہینوں میں اس نے سارے شہر میں ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ شام ڈھلنے کے بعد سکھ عورتیں اپنے بھائی بندوں کو کسی بھی صورت گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ رات کے کسی بھی پہر کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا۔ پولیس باہر موجود ہوتی اور گھر کے مکین کو حکم دیا جاتا کہ اپنے جوان لڑکے کو اسی وقت پولیس کے روبرو پیش کرے۔ نیند سے اٹھا کر لڑکے کو پولیس کے سامنے کیا جاتا اور محلے کے دو تین معتبر لوگوں سے گواہی بھی دلائی جاتی کہ متعلقہ شخص یہی ہے تو بھی پولیس گھر والوں سے "خرچہ پانی" لے کر ہی واپس آتی تھی۔ اگر گھر کا نوجوان لڑکا گھر پر رات کو نہ ملتا تو اس کا مطلب یہی لیا جاتا کہ وہ "دہشت گردوں" کا ساتھی ہے اور سارے گھر والوں کو پولیس والے گھیر کر تھانے لے جاتے جہاں ان کی ہر ممکن بے عزتی کی جاتی۔ تشدد تو معمول کی کارروائی تھا۔ اگر لڑکا گھر سے باہر کسی کام گیا ہے تو اس کا باقاعدہ ثبوت فراہم کرنا ضروری تھا کہ اس نے یہ وقت کہاں کہاں گزارا ہے۔ اس دہشت گردی سے لوگ بلبلا اٹھے تھے لیکن شنوائی کہیں نہیں تھی۔ مکھن سنگھ شام کے بعد شراب کے نشے میں دھت ہو کر مجبور اور بے کس عورتوں کی بوٹیاں ان کے مردوں کے سامنے نوچتا رہتا۔ اس کے خصوصی عملے نے جنسی تشدد کے بعد دو نو عمر لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اخبارات نے اس ظلم کی دہائی دی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

آج مکھن سنگھ کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ دہشت گردوں نے ایک پولیس حوالدار کو اس کے گھر سے اغوا کر کے شہر سے باہر ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی

دے دی تھی۔ یہ خفیہ پولیس کا حوالدار تھا۔ جس نے بہت سے سکھ دہشت گرد گرفتا
کروائے تھے اور اذیتیں دے کر تفتیش کرنے میں تو وہ مہارت رکھتا تھا۔ اب تک تیر
نوجوان اس کے تشدد کی تاب نہ لا کر مر چکے تھے۔

مکھن سنگھ پولیس کی جیپ میں اپنے چار مسلح جوانوں کے ساتھ جائے واردات کی طرف
جا رہا تھا۔ اس کی جیپ آگے تھی جس کے پیچھے دو اور جیپیں آ رہی تھیں۔ مکھن سنگھ کا بس
نہیں چلتا تھا کہ کسی کو کچا چبا جائے۔ وہ غصے سے اپنے دانت پیس رہا تھا۔ اس نے اپنے
ماتحتوں کو حکم دیا تھا کہ شہر کے تمام مشتبہ نوجوانوں کو ان کی ماؤں بہنوں سمیت تھانوں کی
حوالات میں بند کر دیا جائے۔ وہ خود ہر ایک کی الگ الگ تفتیش کر کے قاتلوں کا سراغ
لگائے گا۔

جی ٹی روڈ سے اب وہ لوگ ایک ذیلی سڑک اتر رہے تھے جہاں کھیتوں میں بنے ایک
درخت سے حوالدار کی لاش لٹک رہی تھی۔ جیسے ہی مکھن سنگھ کی جیپ ذیلی سڑک پر بمشکل
پندرہ بیس گز آگے بڑھی' اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جیپ کے اپنے سواروں سمیت
پرخچے اڑ گئے۔

ooo

امریک سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اس راستے پر ڈائنامیٹ دبا رکھا تھا۔ ان لوگوں -
امریک کے منصوبے کے مطابق ایس ایس پی مکھن سنگھ کے چیتے اور خاص حوالدار کو اغوا
کے یہاں پھانسی دی تھی۔ امریک نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مکھن سنگھ غصے میں باؤلا ہو کر موقہ
واردات پر آئے گا۔ اس نے پولیس کو لاش کی اطلاع پہنچانے کے بمشکل پانچ منٹ بعد بڑ
پھرتی سے یہاں ڈائنامیٹ لگایا تھا۔

دھماکہ ایسا زوردار تھا کہ اس کی جیپ سے کسی کے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہ
تھا۔ تعاقب میں آنے والی ایک جیپ تو الٹ گئی جب کہ دوسری جیپ کے ڈرائیور نے ا
اوسان بحال رکھے اور واپس بھاگنا چاہا لیکن کھیتوں میں چھپے گورسیوک سنگھ کے ساتھیوں -
انہیں گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا تھا۔ امریک سنگھ نے انہیں اس انداز میں ڈسپلائے کیا تھا
گھیرے میں آئے پولیس والوں میں سے کسی کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے۔

منصوبے کے مطابق اسے اب یہاں سے نکل جانا تھا لیکن بھاگنے سے پہلے اس -
احتیاطاً" دو ہینڈ گرنیڈ یکے بعد دیگرے مکھن سنگھ کی شعلوں میں گھری جیپ پر پھینک د
تھے۔

مکھن سنگھ کی موت کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس پر سرکار چپ سادھ لیتی۔ عام پولیس
ران تو دہل کر رہ گئے تھے۔ کوئی بھی اس حادثے کی تحقیقاتی ذمہ داریاں لینے کو تیار نہیں
کیونکہ یہ دھمکی ان تک پہنچ چکی کہ جس کسی نے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش
اس کا انجام ایس ایس پی مکھن سنگھ سے کوئی مختلف نہیں ہو گا۔ خصوصاً" پنجاب کے
ہنے والے پولیس افسران تو خود کو بالکل غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔

ایس پی شوراج کو خصوصی طور سے یہ انکوائری سونپی گئی تھی کیونکہ آئی جی پولیس اس
سکھ حریت پسندوں کے ساتھ نفرت کے متعلق اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اس سے
لے شوراج کے ذریعے بٹالہ اور گرداسپور کے دوسرے علاقوں میں اچھی خاصی دہشت
پھیلائی تھی اور ان علاقوں میں "دہشت گردوں" کی کارروائیاں بھی خاصی کم ہو کر رہ گئی
تھیں۔

شوراج کا اپنا کام کرنے کا طریقہ تھا۔ اس نے آئی جی صاحب کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ
ی صورت میں کام کر سکتا ہے اگر اسے اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ
اجازت اسے مل چکی تھی اور اس نے اپنے تمام کارنامے "را" کی خصوصی ایجنسی----
"ایس پی" کے ذریعے انجام دیئے تھے۔ شوراج جانتا تھا کہ پنجاب پولیس میں موجود سکھ
فسران کی زیادہ تعداد حریت پسندوں سے ہمدردی رکھتی ہے اور وہ لوگ بادل نخواستہ سرکاری
حکامات پر عمل پیرا ہیں۔ اس کے پاس اس بات کا ثبوت بھی موجود تھا کہ کئی دفعہ پولیس کی
کارروائی سے پہلے ہی یہ لوگ خالصتانیوں کو اطلاع فراہم کر دیتے تھے اور وہ لوگ چوکس ہو
جاتے تھے۔

موقعہ واردات کا معائنہ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال جنم لے رہا
تھا کہ کیا یہ کسی عام دہشت گرد گروپ کی کارروائی ہے؟

جب بھی اس نے خود سے یہ سوال کیا' جواب نفی میں ملا۔ جس منصوبہ بندی سے ان
لوگوں نے ایس ایس پی مکھن سنگھ کو مارا تھا' اس کے پس پردہ ضرور کوئی اہم شخصیت تھی۔
کوئی تربیت یافتہ ذہن تھا۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟"

اس نے خود سے سوال کیا پھر "ایس پی" کے مقامی دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی
دیر بعد اس علاقے میں سرگرم عمل دہشت گردوں کی فائلیں اس کے سامنے موجود
تھیں۔ اس نے ایک ایک فائل کا بنظر غائر جائزہ لیا لیکن کوئی ایسا شخص ان میں موجود نہیں

تھا' جس سے اس نوعیت کی کارروائی کی امید کی جا سکتی ہو۔

شوراج کے ذہن میں سامبا کا دھماکہ ابھی تک گونج رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ سرحد پار سے کوئی اہم شخصیت مکمل تربیت کے بعد یہاں داخل ہو چکی ہے۔ "را" کی تحقیقاتی اس کے سامنے تھی۔ گو کہ ان لوگوں نے ایسا کوئی شک ظاہر نہیں کیا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ مکھن سنگھ اور سامبا کے دھماکے میں ایک ہی ذہن کام کر رہا ہے۔

لیکن----!

شوراج کی چھٹی حس اسے بار بار اس حقیقت کا احساس دلا رہی تھی کہ یہ ضرور انہی لوگوں کا کارنامہ ہے جنہوں نے کشمیر میں ٹرین کو بم سے اڑایا تھا۔ اس دھماکے کی ذمہ دار کشمیر لبریشن فرنٹ اور سکھوں نے مل کر قبول کی تھی۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اب بات دور تک پہنچ چکی ہے۔ معاملات کی سنگینی کا ادراک ہوتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ سیدھا "را" کے مقامی ہیڈکوارٹر کی طرف چل دیا جہاں میجر دکرم پہلے سے اس کا منتظر تھا۔

"ہمیں پچھلے ایک ماہ کے دوران سرحد پر گرفتار ہونے والے دہشت گردوں سے دوبارہ تفتیش کرنا ہو گی۔" اس نے چھٹتے ہی کہا۔

"خیریت؟" میجر وکرم نے شراب کے نشے میں دھت آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"میجر یہ کسی عام گروپ کی کارروائیاں نہیں۔ ضرور سرحد پار سے کوئی "ماسٹر برین" اور آ گیا ہے۔"

"یار تمہارے ذہن پر تو ہر وقت پاکستان سوار رہتا ہے۔" وکرم قدرے طنز سے بولا۔

"ٹھیک ہے میجر تم کہہ سکتے ہو کہ آج تک ہمارے ہاتھ کوئی اہم ثبوت نہیں لگا لیکن ایک روز میری بات سچ ہو گی۔" شوراج نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"امرتسر میں ہی ہیں سب لوگ۔ ہمارے پاس تو صرف دو آدمی ہیں جنہیں چند روز پہلے گرفتار کیا تھا۔"

"مجھے یہ دونوں ایک ہفتے کے لئے چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا' کہاں پہنچانا ہے؟" وکرم نے پوچھا۔

"پیلی کوٹھی پر!" شوراج ایک آنکھ دباتے ہوئے مسکرایا۔

پیلی کوٹھی

پیلی کوٹھی کا نام ذہن میں آتے ہی بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہونے لگتا تھا۔ اس خفیہ تفتیشی مرکز کی اطلاع صرف اس بدقسمت ہوتی تھی جسے یہاں لایا جاتا تھا۔ یہاں سے بہت کم لوگ زندہ بچ کر جیلوں تک پہنچے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کی زبان سے پیلی کوٹھی کا ذکر عوام تک پہنچا تھا۔ پیلی کوٹھی کے متعلق ایسی ایسی کہانیاں سننے کو ملتی تھیں کہ جنہیں سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ پیلی کوٹھی کا چارج عملاً ایس پی شوراج کے ہاتھ میں تھا۔ یہاں تفتیش کرنے والا عملہ زیادہ تر غیر سرکاری تھا۔

شوراج کو اپنی اس "غیر سرکاری" ٹیم پر بڑا مان تھا۔ اس کے ذریعے اس نے اپنی دانست میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ اس ٹیم میں سزا یافتہ قاتل اور مقامی غنڈے شامل تھے جنہیں اس نے سرکار سے خصوصی اجازت لے کر بھرتی کیا تھا۔ اس طرح وہ سرکاری ضابطوں سے محفوظ رہ کر اپنا کام کر سکتا تھا۔

بی ایس ایف کے جیالوں نے چند روز پہلے ہی دو سکھوں کو ایک سرحدی گاؤں سے گرفتار کر کے "را" کے حوالے کیا تھا۔ ان پر حسب روایت یہ الزام لگایا گیا تھا کہ: "وہ پاکستان کے ٹریننگ کیمپ سے تربیت حاصل کر کے آئے ہیں۔ پہلے بی ایس ایف نے خود ان کی تفتیش کی تھی جس کے بعد انہیں ادھ موا کر کے "را" کو سونپ دیا تھا۔

"را" نے ان پر ہر ستم آزما لیا تھا۔ ان لوگوں نے دہشت گرد کارروائیوں میں شمولیت کا اعتراف تو کر لیا تھا لیکن یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی سرحد پار بھی گئے ہیں جہاں انہوں نے خالصتان تحریک کے سرکردہ لیڈروں سے ملاقات کی ہے۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی دونوں کو ایک بند ویگن میں ڈال کر پیلی کوٹھی پہنچا دیا گیا جہاں ایس پی شوراج ان کے استقبال کو بنفسِ نفیس موجود تھا۔ آرمی والے دونوں کو شوراج کے حوالے کر کے واپس چلے گئے۔ دونوں کی گرفتاری کا اندراج سرکاری طور پر نہیں ہوا تھا' صرف ان کے رشتہ داروں کا علم تھا کہ بی ایس ایف نے انہیں پکڑ لیا ہے لیکن ان کی چیخ

پکار پر کسی کو کان دھرنے کی مہلت نصیب نہیں تھی۔ کیونکہ پنجاب بھر میں ایسے ہزا
گھرانے پہلے ہی سے موجود تھے جو اپنے پیاروں کی گمشدگی کا رونا روتے رہتے تھے۔

شوراج کے حکم پر دونوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی اتار دی گئی۔ ان کے سامنے
کپڑوں میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہ سب ہی شراب کے نشے میں دھت دکھائی
رہے تھے۔ مغلوبوں نے ان سے جیتے نہنگ کو پہچان لیا تھا اور انہیں یہ بھی سمجھ آ گئی
کہ دونوں پیلی کوٹھی پر پہنچا دیئے گئے ہیں جہاں سے اب وہ آزاد دنیا میں شاید نہ لوٹ
سکیں۔

"کیا نام ہیں تمہارے اوئے؟" سب سے پہلے جیتے نہنگ نے جس کے ہاتھ میں لوہے
تاروں سے بنا ایک کوڑا پکڑا ہوا تھا' بندھے ہوئے ہاتھوں والے سکھ سے دریافت کیا۔

"تیری....." اس کے سوال کا جواب دونوں نے ایک موٹی سی گالی سے دیا۔

اس کے ساتھ ہی جیتے نہنگ کا کوڑا حرکت میں آ گیا اور چند منٹ بعد ہی دونوں
میں لت پت زمین پر تڑپ رہے تھے۔

"اب نام یاد آ گیا یا نہیں----؟" جیتے نہنگ نے ٹھیکے کی شراب کا لمبا گھونٹ
میں انڈ ملتے ہوئے دریافت کیا۔

جواب پھر وہی تھا----!

"منجی لگا دو----!" شوراج نے چیخ کر حکم دیا۔

دوسرے لمحے ہی دونوں کو لوہے کی چارپائیوں سے بازو اور ٹانگیں پھیلا کر باندھ دیا
یہ عمل اتنا اذیت ناک تھا کہ دونوں کے بدن کا ایک ایک ریشہ کھنچ گیا۔ انہیں اپنی رگیں
محسوس ہو رہی تھیں لیکن دونوں دیوانہ وار انہیں گالیاں دے رہے تھے۔ شکنجے میں کسے
بس سکھوں پر ایس پی شوراج کے غنڈے بید اور کوڑے برسا رہے تھے۔ بمشکل آدھ
بعد ہی دونوں کی گردنیں ڈھلک گئیں۔

دونوں بے ہوش ہو چکے تھے----!

"کھول دو کم بختوں کو----!" جیتے نہنگ نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور دونوں کو
کر زمین پر پھینک دیا گیا۔

ان کے ہاتھ پیر ہتھکڑیوں سے جکڑ دیئے گئے۔ اس مرتبہ انہیں ہوش آیا تو اذیت
دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی رانوں پر لوہے کے دزنی رولر پھیرے جانے لگے۔
رانوں کے گوشت کا ریزہ ریزہ الگ ہو گیا تھا لیکن دونوں ابھی تک شوراج اور جیتے

کو گالیاں دے رہے تھے۔ صبح ہونے تک اذیت کا یہ سلسلہ جاری رہا' پھر شوراج کے حکم پر
ان کے منہ پر گندگی باندھ کر انہیں ایک کوٹھڑی کے فرش پر برہنہ حالت میں پھینک دیا گیا۔

شوراج اور اس کے ساتھی نشے میں دھت اپنے کمروں کی طرف چل دیئے جہاں مقامی
تھانے والوں نے ان کی مدارت کے لئے نوگرفتار لڑکیوں کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ دونوں کی حفاظت
کے لئے پولیس گارد کے مسلح جوان وہاں موجود تھے۔

○○○

صبح تک دونوں اسی حالت میں تڑپتے رہے۔ پھر ان کے منہ سے گندگی الگ کر کے
انہیں اسی حالت میں دوپہر کے بعد شوراج کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ انہیں جس
کمرے میں لایا گیا تھا' اس میں مختلف سامان اذیت بڑی ترتیب سے سجائے گئے تھے۔ دونوں
کے ہاتھ چھت سے لٹکے لوہے کے کڑوں میں کس دیئے گئے۔ دوسری طرف شوراج کے
غنڈوں نے انہیں کھینچ کر زمین سے دو تین فٹ اونچا لٹکا لیا تھا۔ شوراج اور اس کے ساتھی
ان کے جسموں کو جلتے سگریٹوں سے داغ رہے تھے۔ ان کے تڑپنے اور چیخنے چلانے پر وہ
بچوں کی طرح قہقہے مار مار کر ہنس رہے تھے۔

وہ لوگ ان سے بار بار ایک ہی سوال دریافت کر رہے تھے کہ ان کی ملاقات پاکستان میں
کس سے ہوئی تھی اور کون سا دہشت گرد بھارت میں داخل ہوا ہے جس نے آتے ہی دو
اتنی بڑی وارداتیں کر دی ہیں؟ اس سوال کا جواب دونوں کی طرف سے گالیوں کی شکل میں
موصول ہو رہا تھا۔

شام ڈھلے تک انہیں اسی طرح بھوکے پیاسے رکھ کر شوراج اور اس کے درندے
دونوں کو نوچتے کھسوٹتے رہے۔ صرف بے ہوش ہونے پر انہیں پانی کے چند گھونٹ دیئے
جاتے تھے۔ شام کو انہیں ایک اور انتہائی اذیت ناک عمل سے گزرنا پڑا۔ جب ان کے دونوں
بازو پیچھے کی سمت باندھ کر ان کی ٹانگوں کو مخالف سمت میں کھینچا جانے لگا۔

یہ اذیت ناقابل برداشت تھی----!!

"مہاراج! ان سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ کمبخت بہت پکے نظر آتے ہیں۔" رات کو زچ
ہو کر جیتے نہنگ نے ایس پی شوراج سے کہہ دیا۔

"لیکن یہ تو اب چلنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ شاید زندگی بھر اپنے قدموں پر کھڑے
ہی نہ ہو سکیں۔" ایک اور درندے نے رائے ظاہر کی۔ "مکتی کرا دو مہاراج جی بے چاروں
کی" جیتے نہنگ کی بات پر سب دیوانہ وار قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔

"ہاں اب بے چارے زندہ رہ کر کریں گے بھی کیا۔ محتاجی کی زندگی سے تو موت ہی ہے۔"

ایس پی شوراج نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ooo

رات کا دوسرا پہر تھا----!

دونوں اپنی کوٹھڑی میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے جب انہیں شوراج اس کے غنڈے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔

"آخری موقعہ ہے اب بھی سوچ لو----!" شوراج نے کوٹھڑی کی سلاخوں کے نز کھڑے ہو کر کہا۔

اپنی بات کا جواب اسے حسب معمول گالیوں اور تھوک کی شکل میں موصول ہو انہوں نے نفرت سے اس کی طرف پھینکی تھی۔

شوراج دیوانہ وار انہیں گالیاں دینے لگا۔ وہ اس وقت کسی پولیس افسر کے بجائے خارش زدہ کتا دکھائی دے رہا تھا۔

"لے جاؤ انہیں!" اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے پولیس کے جوان اور غنڈے دونوں کو ڈنڈا ڈولی کرتے ایک ٹرک پھینک رہے تھے۔ ٹرک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ لوگ شہر سے پندرہ میل دور نکل آئے۔ ان کا رخ سڑک کنارے بنے ایک دیہات کی طرف تھا۔

صبح طلوع ہو رہی تھی جب اس گاؤں کے مکینوں کے کان مانوس آوازوں سے گ لگے۔ شوراج اور اس کے غنڈے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی معاونت کے مقامی پولیس پہلے ہی سے یہاں موجود تھی۔

فائرنگ تھم گئی----!

گاؤں کے لوگ ڈرتے ڈرتے جب اس طرف پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ دو خط دہشت گرد یہاں چھپے ہوئے تھے۔ پولیس نے اطلاع ملتے ہی علاقے کو گھیرے میں جس پر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس کی جوابی فائرنگ سے دونوں مارے گئے چینی ساخت اسالٹ رائفلیں حسب دستور ان کے قبضے سے برآمد ہوئی تھیں۔

پنجاب کے کسی دیہات کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس مقابلے کی اصلیت کیا ہے۔ لاشوں پر تشدد کے نشانات ہی سچ بتانے اور سمجھانے کے لئے

تھے لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔

کسی بھی احتجاج کرنے والے کو "دہشت گردوں" کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا تھا اور ایک روز لوگوں کے سننے میں یہی آنا تھا کہ: "اس نے پولیس کی حراست سے بھاگنے کی کوشش کی جس پر وہ مارا گیا۔"

ooo

نیلما نے خورشید کے ساتھ ملاقات میں اتنی زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اسے مجبوراً" خود سے لپٹی نیلما کے کان میں کہنا پڑا کہ یہ لندن نہیں کشمیر ہے۔

"اوہ سوری.....!" نیلما کو بھی صورت حال کا احساس ہو گیا کیونکہ لاؤنج میں تمام لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دونوں تیزی سے باہر نکل آئے۔ خورشید اسے ایئرپورٹ پر لینے آیا تھا۔ دونوں نے حسب وعدہ اپنی اپنی مصروفیت نمٹا دی تھیں اور اب مل کر اس ٹرپ کو انجوائے کرنا چاہتے تھے۔

دونوں ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو دن ڈوب رہا تھا۔

چڑیوں کی چہکار ماند پڑنے لگی تھی اور صبح سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا تھک کر ست ہو گئی تھی۔ دست قدرت نے کشمیر کی جھیلوں میں کھلنے والے کنول کے پھولوں کی پنکھڑیوں کو آہستہ سے بند کر دیا تھا۔

خستگی اور درماندگی کا احساس ماحول کی طرح دونوں کو تھکا دینے پر تلا نظر آتا تھا۔

دونوں ایک پرائیویٹ کار میں ہوٹل کی طرف واپس آ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف بجلی کے کھمبوں پر روشن قمقمے کبھی کبھی اچانک جل کر اپنے ہونے کا نامکمل ثبوت دے رہے تھے۔ سیاہ پتھر جیسی تاریک اور کالی رات میں خورشید کو نیلما کا وجود اس سنہرے رتھ جیسا دکھائی دے رہا تھا جو یونان کے کسی دیوتا کی طویل تپسیا کے بعد ظلمت کی اس چادر کا سحر توڑنے کے لئے اچانک آسمان کے کسی کونے سے زمین پر اتر آیا ہو۔

کشمیر کے اداس حسن نے خورشید کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ نجانے آج کیوں وہ نیلما کے متعلق بڑے عجیب سے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ نیلما کے بہت قریب ہے۔ اس کے لمس کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک جلا سا تن گیا تھا اور اس جالے میں بہت کچھ ایکا ایکی پھنسنے لگا تھا۔

کوئی گم شدہ یاد---- اس کے لاشعور میں زندہ ہو کر کلبلانے لگی۔ شاید وہ اپنے کا کوئی منظر اپنے شعور کی گرفت میں لانا چاہتا تھا۔ شاید اسے اپنی ماں کا وہ طویل بوسہ یا تھا جو اس نے ان راستوں پر چلتے ہوئے کہیں ٹھٹرتی ہواؤں کے بیچ اس کے گالوں پر تاکہ اسے زندگی اور حرارت کا احساس دلا سکے۔

کچھ ایسا تھا جو اس کے اندر ٹوٹ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اب پہاڑی پھیلنے لگا تھا۔ بادلوں کی سیاہی رات میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔ سرگیں شام صنوبر کے بھرے درختوں پر اتر چکی تھی۔ دھندلکا اب گہرے اندھیرے کا روپ دھارنے لگا تھا۔ کے دامن سے سری نگر شہر کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹا رہی تھیں۔

نیلما اس ماحول کی واحد سچائی بن کر اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی----!

آسمان جو اچانک بادلوں سے ڈھک گیا تھا ایکا ایکی کشمیر کی بدبختی کا نوحہ الاپنے لگا۔ ونڈ سکرین پر وائپر بلیڈوں کے نیچے سے پھسلتے بارش کے قطرے آنسوؤں کی طرح رہے تھے۔ کہیں ایک بڑا آنسو اس کے دل سے بھی ٹپکا تھا----!

نجانے کیوں ایک نمی سی اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اسے اپنی ماں یاد تھی۔ ایسی ہی بارشوں میں بھیگتی ہوئی وہ جلانے کے لئے جنگل سے لکڑیاں چن کر لا تھی۔

کار ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہو گئی جہاں مودب ویٹران کے استقبال کے لئے تھے۔ انہوں نے نیلما کا سامان خورشید کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

"کچھ اداس نظر آ رہے ہو؟"

اچانک ہی نیلما نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔

"نہیں تو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا بچپن یاد آ گیا تھا۔" خورشید نے ا آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا۔

"یہ بچپن کم بخت ہے ہی ایسی چیز---- کبھی نہ کبھی یاد آ ہی جاتا ہے۔" : مسکرا کر ماحول کو قدرے بدل ڈالا تھا۔

"تم نے کبھی سوچا نیلما کہ تم نے کتنے بور آدمی کا انتخاب کیا ہے اپنی دوستی کے خورشید نے بدلی سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنے انتخاب پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔" نیلما نے قدرے سنجیدگی سے کہا "یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے۔" خورشید زیر لب بڑبڑایا۔

"شاید تم پر پھر فلسفے کا حملہ ہونے والا ہے۔ چھوڑو ان چکروں میں نہ پڑا کرو۔ آج کو صرف آج سمجھ کر بسر کرو۔ میں نے زندگی سے یہی ایک کام کی بات سیکھی ہے۔" نیلما نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔

دونوں نیچے ڈائننگ ہال میں چلے آئے جہاں کیبرے ناچ ہو رہا تھا۔ خورشید کا ذہن ابھی تک سری نگر کے گلی محلوں میں بھٹک رہا تھا۔ اس نے اب "مقامی مجاہدین" کا رابطہ امریک سنگھ سے کروانا تھا جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا۔

کھانا دونوں نے اپنے کمرے میں منگوایا تھا۔ رات دیر گئے تک وہ باتیں کرتے رہے۔ نیلما کو اس نے کشمیر جنت نظیر کے ان ان دیکھے گوشوں کی سیر کروا دی تھی جن کا وہ صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ اس نے نیلما سے وعدہ کیا تھا کہ صبح وہ اسے سری نگر کے ان گلی محلوں کی سیر کروائے گا جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

صبح اخبار پڑھتے ہوئے جب اس کی نظر پولیس مقابلے میں مارے جانے والے دہشت پسندوں کی تصاویر کی طرف گئی تو اس کا دل دہل گیا۔ مقتولین میں سے ایک گرمیت سنگھ تھا جسے اخبار نے نشان سنگھ بتایا تھا۔ گرمیت کارزار حیات کی اس سنگلاخ راہگذر پر اس کا پہلا باقاعدہ ساتھی بنا تھا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی وہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے گا۔

خورشید جانتا تھا کہ مقابلے کی خبر جھوٹی ہے۔ ان لوگوں نے اسے جس وحشیانہ انداز میں قتل کیا ہو گا اس کے متعلق بھی اسے کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے ساتھی کو نذر عقیدت گزاری جس نے مرتے دم تک اس کے متعلق پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جانتا تھا: اگر گرمیت نے پولیس کو کچھ بتایا ہوتا تو اب تک پولیس یقیناً اس تک پہنچ چکی ہوتی۔

شاید پٹھانکوٹ میں اس سے الگ ہونے کے فوراً بعد ہی گرمیت سنگھ کو کسی اگلے مشن پر روانہ کر دیا گیا تھا اور وہ اس دوران بی ایس ایف کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس بات کا اندازہ خورشید کو ضرور تھا کہ یہاں موجود اس کے ساتھیوں نے کسی "کچے آدمی" کی ڈیوٹی اس کے ساتھ نہیں لگائی ہو گی۔

"ممکن ہے اس کی نگرانی کی جا رہی ہو!" ایک لمحے کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں خوف نے سر ابھارا لیکن اس کے اعتماد نے خوف کی اس لہر کو وہیں دبا دیا۔

○○○

ناشتہ ہوٹل میں کرنے کے بعد وہ سری نگر کے ایک قدیم محلے کی طرف جا رہے تھے۔

کار انہوں نے کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ڈرائیور کو وہیں رک کر انتظار کرنے کے
کہتے ہوئے دونوں آگے بڑھ گئے۔ کشمیر کے اس قدیمی محلے کے درودیوار میں نیلما بہت دل
کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ یہاں کے مکین اس کی ذات میں
رہے تھے۔ خصوصاً" سی آر پی کے جوان تو اسے کھا جانے والی للچائی ہوئی نظروں سے گ
رہے تھے۔ کبھی کبھی اسے جھنجلاہٹ ہونے لگتی لیکن وہ انہیں "بیک ورڈ" سمجھ کر دل
دل میں مسکرا دیتی۔

ان کے سفر کا اختتام ایک گلی کے کونے والے مکان پر ہوا تھا۔ دروازے پر خورشید
وستک دینے پر کسی نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ سر
سپید رنگت کے حامل لمبے قد اور ڈھلتی عمر کے ایک بزرگ نے جن کے سر کے بالوں
چاندی لگی ہوئی تھی' دروازہ کھولا اور وہ بے اختیار خورشید سے بغلگیر ہو گیا۔

"خیریت۔۔۔۔!" خورشید نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاص انداز سے
تھا۔

"اللہ نے فضل کیا' سب ٹھیک ہے۔۔۔۔!" بوڑھے کشمیری نے جواب دیا۔

دونوں کا استقبال گھر میں موجود دوسرے لوگوں نے کیا تھا جن میں بزرگ عورتیں
جوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ خورشید نے نیلما کو پہلے ہی سے بتا دیا تھا کہ یہ روایتی قسم
لوگ ہیں اور زیادہ آزاد خیالی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ زنان خا
طرف چلی گئی تھی۔

"ٹھاکر خیریت سے پہنچ گیا ہے۔" بوڑھے کشمیری نے جسے خورشید "چاچا" کہہ ر
تنہائی میسر آتے ہی خبر دی۔

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" خورشید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہمیں آج ہی ملاقات کر لینی چاہیے۔ حالات بہت خراب ہیں خصوصاً" سامبا کے
کے بعد سے ریاست کے چپے چپے پر "را" نے اپنا جال پھیلا دیا ہے۔"

"اپنے آدمیوں کو چوکس کر دینا چاچا۔ ہم ابتدا ہی میں کسی بڑے نقصان کے
نہیں ہو سکتے۔"

"تم مطمئن رہو۔ اللہ خیر کرے گا۔ ہمیں اس کی ذات پر بھروسہ ہے اور اسی کی
مدد کا یقین ہے۔"

دونوں پیش آمدہ حالات کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ خورشید نے اسے تمام حالا

کر دیا تھا۔ نیلما گھر کی عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے اکٹھے ہی
یا' پھر نیلما کو چاچا کی بیٹیاں شاپنگ کے لئے بازار لے گئیں اور خورشید چاچا کے ساتھ اسی
لے کے ایک دوسرے مکان کی طرف چل دیا جہاں ٹھاکر رودنر سنگھ اس کا منتظر تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہونے میں ایک دوسرے سے زیادہ گرمجوشی
ائی تھی۔ خورشید نے اسے فوراً" ہی دوسرے کارنامے کی مبارکباد بھی دے دی تھی۔

"ابھی نہیں' ابھی کچھ قرض باقی ہے۔" امریک سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی ایک
حساب چکانا ہے۔ ایک جانشین ہے مکھن سنگھ کا' اس سے نمٹنا ہے۔"

"خدا تمہارے ارادوں میں تمہارا معاون ہو۔" بوڑھے کشمیری نے دعائیہ انداز میں ہاتھ
ائے۔

ooo

خورشید نے دونوں کا ایک دوسرے سے بھرپور تعارف کروا دیا تھا اور انہیں مستقبل کے
ابطوں اور منصوبوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ یہ اس کا آخری فرض تھا جو وہ نمٹا رہا تھا۔ اس
اہی چاہتا تھا کہ امریک سنگھ کی طرح یہیں رہ جائے اور اپنی زمین پر اس وقت تک جہاد
ری رکھے جب تک کہ وہ غاصبوں کے شکنجے سے رہائی نہ حاصل کر لے لیکن اپنے متعلق
لہ کرنے کا حق اسے نہیں کسی اور کو تھا۔

امریک سنگھ نے اگلے روز یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ دونوں کی الوداعی ملاقات بڑے
ا جذباتی ماحول میں ہو رہی تھی۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خواہش تھی' ایک ہی عزم
۔۔۔ کہ جو مشن لے کر وہ آئے ہیں اس میں کامیاب ہو جائیں۔

خورشید گھر پہنچا تو نیلما واپس آ چکی تھی۔ وہ ان لوگوں کی مہمان نوازی سے بہت متاثر
ئی تھی اور بار بار ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ شام تک وہ لوگ یہاں مہمان بنے رہے'
واپس لوٹ آئے۔

اگلے تین چار روز انہوں نے کشمیر کے دلفریب حسن کے مزے لوٹے اور پھر جنوب کی
رف چلے گئے جہاں سے انہوں نے واپس لندن چلے جانا تھا۔ امریک سنگھ کا ایک خصوصی
لہ اس نے کسی پیش آمدہ ہنگامی صورت حال کے پیش نظر حاصل کر لیا تھا۔

ooo

ہولاک روڈ کے گوردوارے میں وہ سب ایک مرتبہ پھر جمع ہوئے تھے۔ اس مرتبہ ان

کی میٹنگ گوردوارے کی بجائے فیڈریشن کے آفس میں ہو رہی تھی۔ ایس ایس پی مکھ
سنگھ کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح ساؤتھ ہال کے گلی بازاروں میں پھیل گئی تھی
ایک مرتبہ پھر مظلوموں نے گھی کے چراغ روشن کر لئے تھے۔ کریم خان اور ستنام سنگھ
مطمئن ہو گئے تھے ان کا مشن آگے بڑھ رہا ہے۔

سب نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بھارتی سامراج سے برسرپیکار حریت پسندوں
کامیابی کے لئے دعا کی تھی۔ "ارداس" کے خاتمے پر جب وہ لوگ اٹھ کر باہر جانے لگے
ایک نوجوان نے ستنام سنگھ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ستنام
چونک پڑا۔

"خیر تو ہے ناں؟" اس نے نوجوان کے نزدیک پہنچ کر کہا۔

"بھاؤ جی! برمنگھم سے ایک بری خبر ہے' ذرا احتیاط کرنی ہو گی۔"

"کیا؟"

"گنگدنی نے ورشن کو کریم خان کے قتل کے لئے مامور کیا ہے۔"

"کس نے اطلاع دی ہے؟" ستنام نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"ہم نے اپنا ایک بندہ رکھا ہے وہاں۔ وقت بے وقت ایسی اطلاعات دے دیا کرتا ہے
دراصل ورشن آج کل بخشی بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظر بخشی کی لڑکی نیلما
ہے اور بھارتی سفارت خانے کی مدد کے بغیر وہ نیلما پر ہاتھ صاف نہیں کر سکتا۔ یوں بھی
کا دماغ خراب ہو گیا ہے بھاؤ جی!" اس نے بخشی کی ہمیشہ کی غلامی سے نجات حاصل کر
کے لئے قونصلیٹ سے براہ راست رابطہ کر لیا ہے اور آپ جانتے ہیں گنگدنی کو۔ آج کل
کم بخت کرنل مہتہ بھی یہاں آیا ہوا ہے سیکرٹری کے روپ میں۔ مہاراج چڑھدی کلا رہے
لیکن یہ لوگ بہت ہاتھ پاؤں پھیلانے لگے ہیں۔ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"ہم پہل نہیں کریں گے۔ اس ملک کے قوانین کا احترام ہمارا فرض ہے لیکن کسی
فہمی یا خوش فہمی کا شکار رہ کر بس کیچوے کی طرح مرنا بھی نہیں چاہیں گے۔ میں جانتا
بھارتی سفارت خانہ ہاتھ دھو کر کریم خان کے پیچھے پڑا ہے لیکن ہمارے جیتے جی اگر اسے
ہو گیا تو "سکھی مریادہ" پر آنچ آتی ہے اور نہیں آنے دیں گے ہم---- تم آج ہی بر
چلے جاؤ' ورشن پر کڑی نظر رکھنا۔" ستنام نے اسے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"ایک بات ہمارے حق میں جاتی ہے بھاؤ جی۔" نوجوان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا!"

"ورشن بہت احتیاط پسند بدمعاش ہے۔ وہ یہاں لندن میں بھی---- کسی کی مدد کے بغیر
ہم کرنا چاہے گا کیونکہ معاملہ کچھ زیادہ ہی نازک ہے۔ اگر ہم نے اس کو نظروں میں رکھا
ہ کر جانے نہیں دیں گے۔"

"مہاراج تیری زبان مبارک کرے چھندے۔ ایک مرتبہ وہ یہاں تک آ جائے' میں بھی
کو فارغ محسوس کرتے ہوئے بوڑھا محسوس کرنے لگا ہوں۔ آزما لوں اپنی صلاحیتوں کو کہ
ں زنگ آلود تو نہیں ہو گئیں۔ اچھا تم جاؤ۔"

اس نے نوجوان کو رخصت کر دیا۔

کریم خان اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا جب ستنام نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

"کیا بات ہے؟" کریم خان نے پوچھا۔

"تم آج میرے ساتھ چلو' کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے گاڑی گھر چھوڑ کر آ جاؤں گا۔" کریم خان بولا۔

"نہیں کریم خان گاڑی کوئی اور لے جائے گا۔ تم آ جاؤ ادھر۔" اس نے ضد کرنے کے
انداز میں کہا۔

کریم خان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت تو ہے؟"

"کوئی ایسی بات نہیں' گھبرانے کی۔ بس یونہی ذرا....." ستنام کہتے کہتے رک گیا۔

"چلو بھئی تمہاری مرضی----" کریم خان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

ooo

دونوں اب گوردوارے کی طرف آ رہے تھے۔

"گیانی جی لالہ کریم کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی ہے گھر پہنچا دیں۔ دفتر بند ہونے والا
ہے۔" اس نے چلتے چلتے ایک سیوادار سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج۔" گیانی نے سر ہلا دیا۔

کریم خان کے گھر کی طرف رہنے والے فیڈریشن کے ایک نوجوان کو گیانی جی نے کار کی
چابی تھماتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ گاڑی اس کے گھر چھوڑتا جائے۔ نوجوان گاڑی کی طرف
بڑھا' اس نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگنیشن میں چابی لگا دی۔

جیسے ہی اس نے چابی گھمائی' ایک زور دار دھماکہ ہوا اور پارکنگ کے ورودیوار لرز کر رہ
گئے۔ ستنام سنگھ سمیت سب لوگ ادھر بھاگے۔ کار کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اردگرد کھڑی

کاروں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

"درشو!" ستنام کو اپنی رگوں میں خون کے بجائے انگارے دہکتے محسوس ہو رہے تھے۔ فیڈریشن کے ورکرز اور گوردوارے کے سیوادار کرپانیں لہراتے اس طرف دوڑے۔ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن وہ بے بس تھے۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دشمن کہ چھپا ہے۔

"ستنام سیہاں تو نے مجھے بچانے کے لئے....." کریم خان نے اس کے کندھے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں لالہ ہم نے اپنا مقصد زندہ رکھنا ہے۔ کاش ہمیں اندازہ ہوتا کہ دشمن اس تک گر سکتا ہے' کاش!"

"ویر جی! کون ہے وہ' کون ہے وہ؟" فیڈریشن کے جوانوں کی آنکھوں میں خون اتر تھا۔

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ رب دی قسم کھاتا ہوں: تک انتقام نہ لے لوں مجھ پر گھر جانا حرام۔" ستنام کی آواز میں قہر جھلک رہا تھا۔

"لال سنگھ تم میرے ساتھ آؤ۔ باوا تم نے لالہ کریم خان کی حفاظت کرنی ہے۔ ہونے تک دشمن کو زمین کی ساتویں تہہ سے نکال لاؤں گا۔"

کریم خان کو باقی لوگوں نے اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ اگر اس پر گولیوں بارش بھی ہو جاتی تو کوئی گولی اس کے بدن تک نہ پہنچ پاتی۔ ستنام سنگھ نے اسی نوجوا اپنے ساتھ لیا تھا جس نے اسے اطلاع دی تھی۔ پولیس کاروں کے ہوٹر سنائی دینے لگے جب سکھوں نے کیپٹن ستنام سنگھ اور اس کے ساتھی کو "بیکاروں" کے ساتھ رخصت پولیس نے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ گاڑی کریم خان کی اور کریم خان نے پولیس کے روبرو یہ بیان دیا تھا کہ اس کی موت سے سوائے بھارت کے اور کسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ حملہ بھی اس پر بھارتی ایجنٹوں نے کیا تھا۔ یہ الگ کہ اس کے بجائے کسی اور بے گناہ کی جان چلی گئی۔

ooo

کیپٹن ستنام سنگھ نے کار کے ڈیش بورڈ میں رکھے پستول کا دوبارہ جائزہ لیا اور اپنی "ہیز" کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ اس کا رخ اس علاقے کی "پمپ لائن طرف تھا جہاں مشہور بھارتی صنعت کار سیوک رام رہائش پذیر تھا۔ ان لوگوں کو علم

سیوک رام کا بنگلہ "را" کا مقامی دفتر ہے اور اگر ورشن اس علاقے میں موجود ہے تو یقیناً وہ یہیں کہیں ہو گا کیونکہ "را" کے ایجنٹوں کی اس علاقے میں یہی پناہ گاہ تھی۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر دونوں نے گاڑی بنگلے سے کچھ دور ہی پارک کر دی تھی۔ اب وہ پیدل اس طرف جا رہے تھے۔

لندن کی کہر آلود شام میں دونوں اپنے لمبے اوورکوٹ کے ساتھ چلتے ہوئے کسی پراسرار کہانی کا کردار دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے پگڑیاں اتار کر سروں پر گرم ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں اور اپنی شناخت بدلنے میں خاصے کامیاب رہے تھے۔

چلتے چلتے اچانک ہی لال سنگھ ٹھٹک کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے؟" ستنام نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"یہ ورشن کی گاڑی ہے۔" اس نے ایک قدرے تاریک گلی کے نزدیک پارک کی ہوئی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں یقین ہے کیا؟"

"ہاں بھاؤ جی!" لال سنگھ نے اعتماد سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میرے خیال سے وہ جلدی ادھر آئے گا کیونکہ اب وہ فوراً یہاں سے نکل جانے کی فکر میں ہو گا۔ ستنام سنگھ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

دونوں گلی سے قدرے ہٹ کر ایسی جگہ کھڑے ہو گئے تھے جہاں سے وہ باآسانی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ان کے اندازے کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر بعد انہیں سڑک پر ایک سایہ اس طرف آتا دکھائی دیا۔

"ورشن ہے بھاؤ جی----!" لال سنگھ نے بے چینی سے کہا۔

دونوں نے اس طرح راستہ اختیار کیا تھا کہ بالکل نامحسوس انداز میں وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ورشن بہت جلدی میں دکھائی دیتا تھا شاید وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ستنام سنگھ بڑے نامحسوس انداز میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا۔ اب ان کے درمیان بمشکل پانچ سات قدم کا فاصلہ ہی رہ گیا تھا---- ورشن نے صرف ایک مرتبہ چلتے ہوئے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ پھر مطمئن ہو کر اپنی کار کی طرف جانے لگا۔

جیسے ہی اس نے کار کا دروازہ کھولا' پستول کی ٹھنڈی نالی اس کی کنپٹی سے لگ گئی۔

"سوال و جواب کرنے کی ضرورت نہیں' چپ چاپ آگے ہو جاؤ۔" کیپٹن ستنام سنگھ نے اس کی کنپٹی پر پستول کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں جانے کیا قہر چھپا تھا' درشن چپ چاپ آگے کھسک گیا۔ ستنام نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی چابیاں ستنام سنگھ نے درشن کے ہاتھ سے چھین کر گاڑی سٹارٹ کر لی تھی اور اپنا پستول لال سنگھ کو تھما دیا تھا جس نے پستول کی نالی دوبارہ درشن کی کنپٹی پر رکھ دی تھی۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ بہت چالاک ہو تو جو کر سکتے ہو ضرور کر گزرنا۔" ستنام نے جان بوجھ کر انگریزی میں بات کی تھی---- "بس ایک بات کا خیال رہے کہ میرا ساتھی گولی چلانے کے لئے میری اجازت کا پابند نہیں۔"

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" درشن منجھا ہوا بدمعاش تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"سوال پوچھنے کی اجازت نہیں۔ صرف احکامات کی پابندی کرو۔" لال سنگھ غرایا۔

درشن نے چپ سادھ لی۔

تھوڑی دیر بعد پھر اس نے ہمت کر کے کہا---- "تم لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں....."

"شٹ اپ----!" ستنام نے ڈانٹ دیا۔ "اگر یہ اب بولنے کی کوشش کرے تو اس کی کھوپڑی توڑ دینا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے لال سنگھ کو مخاطب کیا۔

"او کے باس!" لال سنگھ نے اس کی کنپٹی پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ooo

بمشکل دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ان کے سفر کا خاتمہ ایک گیراج پر ہوا تھا جس کے باہر کسی ایشیائی کے نام کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ گیراج کے مین گیٹ پر پہنچے اس کا دروازہ کھل گیا۔ ستنام سنگھ کار کو سیدھا اندر لے آیا تھا۔ درشن کی آنکھیں اب کھلی تھیں۔ اس نے اپنے سامنے موجود سکھوں میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ یہ شخص کافی عرصے سے "را" کی ہٹ لسٹ پر موجود تھا۔

"باہر آ جاؤ۔" ستنام نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسے حکم دیا۔

دوسری طرف کار کے دروازے کے سامنے ایک مسلح سکھ موجود تھا۔ درشن چپ چاپ نیچے اتر آیا۔ یہاں موجود سکھوں نے اس کی تلاشی لے کر اس کے کوٹ کی جیب سے

ریوالور نکال کر اسے غیر مسلح کر دیا تھا۔ وہ لوگ اسے بندوق کی نوک پر ورکشاپ کے اس حصے میں لے آئے تھے جہاں کاروں کے ڈھانچے کرین کے ذریعے "سکریپ" میں تبدیل کئے جاتے تھے۔

شاید وہ خاص کمرہ انہوں نے درشن جیسے لوگوں کے لئے ہی بنا رکھا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی لال سنگھ ایک اور نوجوان کے ساتھ کار میں اس طرف روانہ ہو گیا جہاں ان لوگوں نے اپنی کار پارک کی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لال سنگھ کار کو ساؤتھ ہال کی طرف اڑائے لئے جا رہا تھا۔

رات کا ایک پہر ڈھل چکا تھا جب کریم خان اور دو سکھ لال سنگھ کی ہمراہی میں اس جگہ پہنچے جہاں ان کے ساتھی ورشن سے تفتیش کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ اڑا رہا لیکن جب انہوں نے گنگانی اور کرنل مہتہ سے اس کی ملاقات کی کہانی بھی اسے سنا دی تو ورشن کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے لئے اب جھوٹ بولنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اپنی دانست میں اس نے ان لوگوں کو غچہ دے کر نکل جانے کے لئے کہانی گھڑی تھی اور انہیں الٹے سیدھے واقعات سنانے کے بعد ان سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو اس کے ذریعے بخشی کا کام تمام کروا سکتے ہیں۔

"اس معاملے پر تو بعد میں بات ہو گی۔ پہلے تم اس شخص کا نام بتاؤ جس کے ذریعے تم نے کار میں بم نصب کروایا۔"

گیانی گورمکھ سنگھ ریٹائرڈ پولیس افسر تھا اور بات کی تہہ تک پہنچنے کا فن جانتا تھا۔

"ٹھیک ہے میں چونکہ تم لوگوں سے دوستی چاہتا ہوں' اس لئے بتا دیتا ہوں۔" اس نے فیڈریشن کے دفتر میں کام کرنے والے ایک نوجوان کا نام لیا۔

"کیوں کیپٹن صاحب' میں نہ کہتا تھا کہ یہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔"

گیانی گورمکھ سنگھ نے اس کا نام سنتے ہی ستنام سنگھ سے کہا۔

"لیکن اس طرف تو ہمارا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا۔" ستنام بولا۔

"درشن کمار! ہم تمہاری پیش کش پر ضرور غور کرتے اگر تم نے ہمارے ایک ساتھی کی جان نہ لی ہوتی۔ ہمارا ایک گھبرو بے گناہ مارا گیا جس کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی سزا تمہیں ہر حال بھگتنا ہو گی----" کیپٹن ستنام سنگھ نے فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے' آپ لوگ مجھے برٹش پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں۔" درشن نے بے

چینی سے پہلو بدلا۔

"میرے خیال میں اس کھیل میں کوئی تیسرا فریق کیوں بنے؟ لڑائی تو ہماری اور ہندو سامراج کی ہے جس کے تم ایک گماشتے ہو۔ تم نے یہ قتل بھی اپنے آقاؤں کے حکم سے کیا ہے۔ جب بزعم خویش دنیا کی بہت بڑی جمہوریت اور سیکولر ہونے کی دعوے دار حکومت نے اپنے دوست ملک کے قوانین کی دھجیاں بکھیر رکھی ہیں اور تمہارے کہنے کے مطابق صرف لندن میں اپنے دس سے زیادہ اڈے بنا رکھے ہیں تو ہم پر پابندی کیوں؟ اصول کی بات ہے ہم نے پہل نہیں کی۔ ہماری جنگ ہندو سامراج سے بھارت میں ہو رہی ہے۔ ہم کسی اور ملک کو میدان جنگ کیوں بنائیں۔ اپنی لڑائی میں کسی تیسرے پرامن ملک کو کیوں گھسیٹیں----؟"

ستنام بڑے دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا اور درشن کو اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"شری درشن کمار جی! تم بھارت سرکار کے ایجنٹ ہو۔ ہم تم پر بھارتی قوانین کے تحت مقدمہ چلائیں گے۔ تم نے نہ صرف لالہ کریم خان کی کار میں بم نصب کروا کر ایک بے گناہ کے قتل میں ملوث ہونے کا اقرار کیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے تین حریت پسندوں کو قتل کر چکے ہو۔ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت یہ عدالت تمہیں سزائے موت کا حکم سناتی ہے۔"

اس نے اپنی بات کا آخری حصہ کچھ ایسے لہجے میں کہا تھا کہ درشن کمار تھرا کر رہ گیا۔

"نہیں----!" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہم تمہیں ایک رعایت ضرور دے سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو گنگرنی کے نام اپنا یہ پیغام چھوڑ سکتے ہو کہ تم نے اس کے احکامات پر عمل کیا جس کی سزا بھی تمہیں مل گئی لیکن اس میں تمہیں اقرار کرنا ہو گا کہ تمہیں بھارتی قونصلیٹ نے کریم خان کے قتل کا حکم دیا تھا اور اس سے پہلے بھی تم اس کی ہدایات پر تین قتل کر چکے ہو اور اب ضمیر کے ہاتھوں پچھتاوے کا شکار ہو کر خودکشی کرنے جا رہے ہو۔" گیانی گورمکھ سنگھ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کہ کہ کیا مطلب ہے تمہارا....." درشن کمار کے چہرے پر موت کی زردی ابھی سے چھانے لگی تھی۔

"دیکھو درشن کمار تم تو مرنے جا ہی رہے ہو لیکن وہ حرامی جنہوں نے تمہیں اس حرام موت کی طرف دھکیلا ہے وہ محفوظ کیوں رہیں؟" ستنام سنگھ بولا۔

درشن کمار کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ اسے مرنے سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھا دیں گے---- وہ معمولی بدمعاش نہیں تھا لیکن ایسے ماہرین نفسیات سے اس کا واسطہ آج پہلی مرتبہ پڑا تھا۔

چند منٹوں کی ہچکچاہٹ کے بعد واقعی وہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ آخر وہ اکیلا ہی کیوں مرے۔ گنگرنی، کرنل مہتہ اور بخشی کیوں اس کے بعد عیش کرتے رہیں۔ اس نے واقعی وہی کچھ ریکارڈ کروا دیا جو اس سے کہا گیا تھا۔

زخم خوردہ سانپ

اگلے روز علی الصباح پولیس پٹرول پارٹی نے "ہیز" کے "ریڈ لائٹ ایریا" کے نزدیک درشن کمار کی لاش اس کی کار سے برآمد کی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں اپنا ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس کی لاش کے نزدیک ہی ایک خط پڑا تھا جس پر درشن کمار نے اپنے ہاتھ سے وہی کچھ لکھا تھا جو کچھ وہ ریکارڈ کروا چکا تھا۔ خط پر اس کے علاوہ اور کسی کی انگلیوں کے نشان بھی نہیں ملتے تھے۔ وہ فلم بھی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں موجود تھا جس سے تحریر لکھی گئی تھی۔

اگلے روز برطانیہ کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کو وہ آڈیو کیسٹ بھی ڈاک سے موصول ہو گئی۔ بھیجنے والے نے لکھا تھا کہ ایک شخص نے التجا کی تھی کہ وہ یہ کیسٹ اس روزنامے کو ارسال کر دے۔ کیسٹ دینے والے کا حلیہ ہو بہو درشن کمار سے ملتا جلتا تھا۔

اخبار نے شہ سرخیوں کے ساتھ ساری کہانی شائع کر دی تھی۔ بھارتی سفارت خانے کے ایوانوں میں کہرام مچ گیا تھا کیونکہ کیسٹ کے ذریعے صرف لندن میں بھارتی انٹیلی جنس "را" کے دس ٹھکانوں کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اس واقعے نے بھارتی وزارت خارجہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دنیا بھر کے اخبارات نے بھارتی حکومت پر زبردست تنقید کی تھی۔

اسی روز شام کو بھارتی وزارت خارجہ کی طرف سے ساری دنیا کے پریس کو ایک بیان جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ اس خبر کی اشاعت کے پیچھے بھارت کے ایک دشمن ہمسایہ کا سازشی ذہن کارفرما ہے۔ یہ منصوبہ اس ملک کی انٹیلی جنس اور سکھ دہشت گردوں نے مل کر بھارت کو بین الاقوامی سطح پر بدنام کرنے کے لئے ترتیب دیا ہے۔ جن لوگوں کے نام "را" کے ایجنٹ کے طور پر لئے گئے ہیں وہ برطانیہ کے معزز شہری ہیں۔ جن کی طرف سے اخبار پر ہتک عزت کے الگ مقدمات دائر کئے جائیں گے۔

یہ وضاحت بالکل ناکافی تھی----!

کوئی ذی شعور اس سلسلے میں مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ تو بھارت سرکار دنیا

بھز میں بدنام ہو کر رہ گئی تھی۔ برطانوی اسمبلیوں میں گرم گرم بحث اس ضمن میں ایک عرصہ تک جاری رہی اور "را" کے خفیہ ٹھکانوں سے وابستہ داستانیں ایک عرصہ تک اخبارات کی زینت بنتی رہیں۔

خبر کی اشاعت کے دوسرے روز ہی کرنل مہتہ کو ایک فون کے ذریعے کسی نے کہا تھا: "دنیا میں خود کو سب سے زیادہ چالاک سمجھنے والے سب سے زیادہ بیوقوف ہوتے ہیں۔"

فون کرنے والے نے اس کے ذریعے بھارتی حکومت کو پیغام دیا تھا: "وہ ان کے ساتھ میدان جنگ میں مقابلہ کرے اور کسی تیسرے ملک کو میدان جنگ نہ بنائے۔ اسی میں سب کا بھلا ہے ورنہ وہ لوگ اس سے آگے بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوں گے۔"

اگر گنگنی اور کرنل مہتہ کو علم ہوتا کہ وہ اس بیوقوف ورشن کمار کے ہاتھوں اس بری طرح ذلیل و رسوا ہوں گے تو وہ کبھی ایسی غلطی نہ کرتے۔ ابھی تک برطانوی حکومت کی طرف سے انہیں لعن طعن ہو چکی تھی کہ انہوں نے اپنی اپنی ملازمت سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔!

ایک روز بھارتی حکومت نے کرنل مہتہ کو چپ چاپ واپس بلا لیا۔ گنگنی طویل رخصت پر کسی یورپی ملک کی طرف نکل گیا۔ اس کے علاوہ بھی بھارتی سفارت خانے کے سٹاف کے بہت سے لوگوں کے تبادلے کر دیئے گئے۔ نئے لوگ جو آئے تھے انہیں خصوصی ہدایات کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

ورشن کمار کی موت کے چند روز بعد آل گیٹ کے پررونق علاقے سے ایک لاش ملی۔ کسی کار نے اسے کچل ڈالا تھا۔ یہ وہی سکھ تھا جس کی خدمات ورشن کمار نے کریم خان کی کار میں بم نصب کرنے کے لئے حاصل کی تھیں۔

○○○

ایس پی شوراج کی ہدایت پر آج جیتے نہنگ کے گروہ نے خصوصی تیاریاں کر لی تھیں کیونکہ شوراج کو کسی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی کہ فتوال نامی گاؤں میں رات گزارنے کے لئے کچھ دہشت گرد آ رہے ہیں۔ ایسی اطلاعات پر شوراج پولیس کی بجائے اپنے غیر سرکاری گینگ کو حرکت میں لایا کرتا تھا۔

جیتا نہنگ اور اس کے پانچ ساتھی مسلح ہو کر سرکاری جیپ میں فتوال کی طرف چل دیئے۔ پولیس کے جوانوں نے شام ڈھلتے ہی علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اب وہ فتوال

طرف سے ملنے والے کسی بھی اشارے پر کسی بھی قسم کی کارروائی کے لئے تیار تھے۔

جیتا نہنگ اپنے نہنگوں کے ساتھ جیپ خود چلاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا تھا۔ اردگرد کے دیہاتوں میں اس کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے گاؤں میں داخل ہونے کی اطلاع ملتے ہی لوگوں نے خوفزدہ ہو کر اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے تھے۔ جیتے نہنگ نے اپنی جیپ نمبردار دھن سنگھ کے گھر کے سامنے روکی تھی۔ سب سے پہلے وہ جیپ سے نیچے اترا' پھر اس کے تعاقب میں اس کے ساتھی باہر آئے۔

جیتے نہنگ نے حویلی کے دروازے کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھی اس کے تعاقب میں تھے۔ یہ لوگ صحن عبور کر کے سامنے بنی بیٹھک کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اچانک ہی انہیں یوں لگا جیسے زمین میں موجود کسی عفریت نے ان کو اپنے شکنجے میں کس لیا ہو۔

وہ لوگ کیپٹن امریک سنگھ کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔

۔۔۔پانچوں منہ کے بل زور سے گرے۔ ان کے ہاتھوں سے بندوقیں دور جا گری تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ صورت حال کی انہیں کچھ سمجھ آئے' تین نقاب پوش ان کے سروں پر آٹومیٹک بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ چوتھے نے بڑی پھرتی سے ایک ایک کر کے ان کی بندوقیں اپنے قبضہ میں کر لی تھیں۔۔۔۔! اس کے ساتھ ہی۔۔۔۔ دوسری طرف سے کوئی حرکت ہوئی اور ان کے جسم شکنجوں سے آزاد ہو گئے۔

"کھڑے ہو جاؤ!" امریک سنگھ نے انہیں حکم دیا۔

پانچوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی ٹانگوں میں شدید درد ابھی تک جاری تھا۔

"تم اس طرف آ جاؤ۔۔۔۔!" امریک سنگھ نے جیتے نہنگ کو حکم دیا۔

جیتے نے اسے گالی دے کر ابھی اگلی بات کہنی ہی چاہی تھی کہ اچانک پیٹ پر پڑنے والی ضرب نے اسے منہ کے بل زمین بوس کر دیا۔ درد کی شدت سے وہ تڑپ اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے آہنی سریہ اس کے پیٹ میں اتار دیا ہو۔ پہلے ہی وار نے اسے احساس دلا دیا کہ سامنے کوئی عام قسم کا دہشت گرد نہیں کھڑا' عین ممکن ہے یہ وہی شخص ہو جو سرحد پار سے آیا ہو اور جس نے آتے ہی دو بڑی وارداتیں کی ہیں۔

"تم سمجھتے ہو پولیس کے کتے بن کر ہر ایک پر منہ مارتے پھرو گے۔ جیتے میں تمہیں زندہ گور کر دوں گا' تو شوراج سے موت کی التجا کرے گا اور موت تجھے نصیب نہ ہو گی۔" مارنے والے کا لہجہ ایسا خونخوار تھا کہ جیتے کی شراب کا نشہ ہرن ہونے لگا۔

اس کے ساتھی تو پہلے ہی سہمے سمٹے ایک طرف کھڑے تھے۔ آج صورت حال ان
توقع کے برعکس ہو گئی تھی۔ عموماً" اسے بندھے ہوئے شکاروں پر حملہ کے لئے لے جانا
تھا' آج تک مقابلے کی نوعیت نہیں آئی تھی۔ وہ بھی اس طرح کے تربیت یافتہ دہشت
کے ساتھ!

"تم اپنا کام شروع کرو----!" امریک نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو حکم دیا۔

ooo

چاروں کو اس کے ساتھی نے اشارہ ملتے ہی زمین پر الٹے لیٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ ایک
آدھ نے چوں چراں کی کوشش کی لیکن کمر پر زوردار بٹ کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ
اور منہ کے بل زمین پر آ رہے۔ زمین پر اوندھے منہ لیٹے جیتے نہنگ کے ساتھیوں
مشکیں کیپٹن امریک سنگھ کے ساتھیوں نے کس دی تھیں پھر وہ ان کے جسموں
ڈائنامیٹ لگانے لگے۔ جیتا نہنگ بے بسی کی تصویر بنا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس
ساتھیوں کے منہ ٹیپ سے بند کر دیئے گئے تھے تاکہ ان کے چیخنے چلانے کی آواز بھی سنائی
دے سکے۔

"چلو----!" امریک نے اس کی کمر پر رائفل کا ٹھوکہ دیا۔

نہنگ اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے سامنے ہی اس کے ساتھیوں کے ڈائنامیٹ
کنکشن دروازے سے کر دیا گیا جیسے ہی کوئی دروازہ کھولتا' زوردار دھماکہ ہوتا اور آنے والا
سمیت سب کچھ تباہ ہو جاتا۔

جیتے نہنگ کو وہ لوگ باہر کھڑی جیپ تک لے آئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ امریک
ایک ساتھی نے سنبھالی تھی اور وہ لوگ گاؤں کی اس سمت پکی سڑک کی طرف جا رہے
جدھر پولیس کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے کھیتوں کے بیچوں بیچ شاید پہلے سے
راستہ بنا رکھا تھا۔ جیپ کے علاوہ اس راستے سے کوئی اور سواری گزر نہیں سکتی تھی۔

جیپ کا رخ پٹالہ کی طرف تھا' پھر جیتے نہنگ نے امریک سنگھ کو یہ کہتے سنا کہ جیپ
"پیلی کوٹھی" کی طرف لے جاؤ۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا' اس کے سر پر لگنے
ضرب اتنی زوردار تھی کہ ایک ہی ضرب میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔

ooo

پولیس اور سی آر پی کے جوان فتوال کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ قریباً" ایک گ

ی ایس پی ماتھر کا ماتھا ٹھنکا۔

"کہیں یہ لوگ کسی جال میں تو نہیں پھنس گئے؟" اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ایس ایچ
ے کہا۔

"صورت حال ٹھیک دکھائی نہیں دیتی سر! کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" ایس ایچ او پر بھی
ہٹ طاری ہو رہی تھی۔

"تم لوگ فوراً" گاؤں میں نمبردار دھن سنگھ کے گھر پر حملہ کر دو۔" اس نے ایس ایچ او
لم دیا۔

پولیس کے جوان بڑی ترتیب اور تنظیم سے مکان کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ گاؤں
کا عالم تھا۔ حملے کی کمان ڈی ایس پی ماتھر خود کر رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے
ے پر ٹھوکر ماری تھی۔ اس کے تعاقب میں ایس ایچ او اور تین چار جوان تھے۔ جیسے
دروازہ کھلا' اچانک سارا گاؤں لرز اٹھا۔

دھماکے کی آواز اتنی زوردار تھی کہ اردگرد کے مکانوں میں لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ اس
ساتھ ہی پولیس والوں کی چیخ پکار بلند ہونے لگی تھی۔ ماتھر اور ایس ایچ او تو وہیں جیتے
ساتھیوں سمیت مارے گئے اور پانچ چھ پولیس والے بری طرح زخمی ہو گئے۔ گاؤں کے
ڈر کے مارے گھروں سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ پولیس والوں نے گالیاں دے دے
نہیں باہر نکالا اور ان کی مدد سے زخمیوں کو ہسپتال تک پہنچایا گیا۔

ایس پی شوراج وائرلیس پر اطلاع ملتے ہی پیلی کوٹھی پہنچا تھا لیکن اس کی آنکھوں نے
جو منظر دیکھا وہ اتنا کریہہ اور المناک تھا کہ اگر اس کے ماتحت اسے پوری صورت حال
دیتے تو شاید وہ کبھی اس طرف نہ آتا۔

پیلی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر جیتے نہنگ کی جیپ کھڑی تھی۔ نہنگ اس کی اگلی سیٹ سے
ا تھا لیکن اسے صرف زندہ اس لئے کہا جا سکتا تھا کہ اس کی سانس چل رہی تھی۔ اس
دونوں بازو اور ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ خون سے جیپ کا فرش چکنا ہو رہا تھا اور جیپ
بونٹ پر ایک ٹائم بم اس طرح نصب تھا کہ اگر کوئی اسے الگ کرنے کی کوشش کرتا تو وہ
جاتا۔

"گدھو! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ ہٹ جاؤ یہاں سے۔ بم کسی بھی وقت پھٹ سکتا
ہے۔" شوراج نے چلا کر پولیس والوں کو حکم دیا۔

ooo

یہ تماشہ دیکھنے کے لئے اردگرد دیہاتوں سے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ بم ڈ
یونٹ والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بم کو الگ کیسے کریں۔ انہوں نے
معذوری ظاہر کر دی تھی اور تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹ جانے کے لئے کہا تھا۔

بمشکل پانچ منٹ بعد ہی زوردار دھماکہ ہوا اور جیتے نہنگ کے جسم کے چیتھڑے
سمیت فضا میں بکھر کر رہ گئے۔ شوراج پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے جھلا کر
والوں کو وہاں جمع ہونے والے دیہاتیوں پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا تھا۔ پولیس ملازم
بے بسی کا غصہ بے بس عوام پر نکال رہے تھے۔

ooo

شوراج کا بس چلتا تو فتوال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا---- آخر وہ ایک حد تک
جا سکتا تھا۔ ٹینکوں یا بلڈوزروں کی مدد سے گاؤں کو روند ڈالنا اس کے بس میں نہیں تھا
اس نے اپنی سی کر گزرنے کی ٹھان لی تھی اور اس وقت وہ ایک نہایت اہم مشن
"را" کے مقامی آفس کی طرف جا رہا تھا----!

میجر گپتا نے حسب معمول مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ وہ جانتا تھا کہ شوراج
خوردہ سانپ ہے اور کسی کو بھی ڈنک مار سکتا ہے۔ کم از کم گپتا اس کے زہر کا تریاق
کر سکتا تھا----!!

"گپتا صاحب کیا جواب ملا----؟" اس نے گپتا کی میز کے سامنے کرسی سنبھالتے
کہا۔

"ہائی کمان نے آپ کی تجویز مان لی ہے۔" گپتا نے مسکراہٹ بکھیری۔

"کب تک پہنچیں گے وہ لوگ؟"

"کل شام تک!"

"اپنے اعتماد کے ہیں ناں؟" شوراج نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عادی مجرموں پر اعتماد کیا؟ اپنی اپنی سوچ ہے۔ بہرحال
آپ پر منحصر ہے اور مسٹر شوراج آپ نے ان سے اپنا کام کروانا ہے انہیں بزنس پار
نہیں بنانا۔ اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات ہے؟ کم از کم میرے نزدیک اس سوال کی
کوئی اہمیت نہیں۔ ہم اپنے دھندے میں اگر ایک دوسرے پر اعتماد کرنے لگیں تو ہمارا
اگلے ہی روز چوپٹ ہو جائے گا۔" میجر گپتا بدستور مسکرا رہا تھا۔

بھی شوراج کا جی چاہتا تھا کہ اس کا ٹینٹوا دبا دے۔ اسے گپتا کی یہ بے جا مسکراہٹ
کھلتی تھی لیکن وہ مجبور تھا۔ گپتا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ "را" سے بگاڑ کر وہ اس
نے میں ایک دن بھی زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں کل شام آؤں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے بددلی سے کہا۔

"کافی نہیں پئیں گے؟" گپتا کی گھنی مونچھوں کے نیچے دبی مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

"نہیں مسٹر گپتا! اس وقت نہیں۔ اب ہم مل کر کوئی اچھی پارٹی دیں گے ایک دوسرے
لو کے۔"

اپنی جیپ میں بیٹھ کر اس نے ڈرائیور کو جیپ آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ وہ کسی گہری
میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک ہی کسی پیش آمدہ خطرے نے اسے چونکا دیا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ
کی جیپ بھی تو مکھن سنگھ کی جیپ کی طرح بھک سے اڑ سکتی ہے۔ اس کا ڈرائیور بھی
ت گردوں کا ساتھی ہو سکتا ہے؟

اس کا ڈرائیور ایک سکھ حوالدار تھا۔ شوراج اور اس کا ساتھ برسوں پرانا تھا۔ وہ جانتا تھا
ار گورنام سنگھ اس سے غداری نہیں کر سکتا' لیکن آج کل وہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار
یں تھا۔

"ٹھہرو----!" اچانک ہی اس نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"سر!" مودب ڈرائیور نے جیپ روک کر اس کی طرف گردن گھمائی۔

"تھوڑا رکنا ہو گا یہاں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنی جیپ میں نصب وائرلیس کے ذریعے نزدیک ترین گشتی پارٹی سے
قائم کر رہا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اور رات گہری ہو چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں گورنام سنگھ
ور سڑک پر ایک پولیس جیپ کو اس طرف آتے دیکھا جس میں سی آر پی کے مسلح
موجود تھے۔

"تم جیپ لے کر تھانے پہنچو' میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔"

شوراج کے اس اچانک فیصلے نے اس کے ڈرائیور کو چونکا کر رکھ دیا لیکن اگلا سوال
ت کی جرات وہ نہ کر سکا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا "صاحب" اکثر سیکورٹی ایجنسیوں سے
ی تعلقات رکھتا ہے اور عین ممکن ہے اس وقت بھی وہ کسی اہم منصوبے پر کام کر رہا

ہو۔

پولیس اسٹیشن یہاں سے دس میل دور تو رہا ہو گا لیکن حوالدار گورنام کو یقین تھا وقت سڑکیں خالی ہونے کے سبب وہ اطمینان سے تھانے پہنچ جائے گا اور صبح تک اپنی پوری کر لے گا۔ ورنہ ایس پی صاحب کے ساتھ ڈیوٹی کرتے ہوئے تو وہ اونگھ بھی سکتا۔

جیپ کو اپنی انتہائی رفتار سے بھگاتا وہ پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ جیپ دروازے بند ہونے کے باوجود سردی اس کے لمبے گرم کوٹ کو چیرتی اس کی ہڈیوں میں رہی تھی۔۔۔۔ گورنام اپنے کمرے میں پہنچ کر گرم بستر اور صبح تک کی بھرپور نیند کے سے سرشار تھا جب اچانک ہی اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سڑک کے درمیان کھڑی ایک ٹرالی پر پڑ رہی تھی۔ یہ ٹرالی کسی نے اس طرح ترچھی کر کے یہاں کھڑی کی تھی کہ سامنے راستہ بند تھا۔

ooo

"سازش!"

اس کے ذہن میں دھماکہ ہوا۔۔۔۔!

حوالدار گورنام سنگھ نے اپنی انتہائی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے بریک پر پاؤں بڑھایا تھا۔ سڑک پر جیپ کے ٹائر اتنے زور سے چرچرائے کہ نزدیکی دیہاتوں تک بھی آواز ضرور پہنچی ہو گی۔

ٹرالی کے بالکل نزدیک پہنچ کر جیپ رک گئی۔

گورنام سنگھ نے سٹیئرنگ کو تیزی سے گھمایا۔ وہ موڑ کاٹ کر دوبارہ واپس بھاگنے لئے پر تول رہا تھا لیکن اچانک ہی اس کا سر سٹیئرنگ سے ٹکرا گیا۔ باہر سے ہونے والی نے جیپ کے ٹائر پھاڑ دیئے تھے اس کے ساتھ ہی ایک گولی گورنام سنگھ کی پسلیوں کو ہوئی اندر جا گھسی۔

کسی لاشعوری خواہش کے تحت اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے وہ جیپ نصب وائرلیس کے ذریعے خود پر ٹوٹنے والی قیامت سے نزدیکی "پیٹرول پارٹیوں" کو آگاہ تھا۔ ابھی اس کا پیغام نامکمل ہی تھا جب اس کی گردن ڈھلک گئی اور اس کا آدھ سٹیئرنگ پر گر پڑا۔

اس کے جسم میں درجنوں گولیاں اچانک ہی آرپار ہو چکی تھیں۔ مائیک اس کے

نیچے لٹک رہا تھا۔

ooo

سی آر پی کی جیپ میں بیٹھے ایس پی شوراج سنگھ نے جیپ پر اپنے ڈرائیور کا آخری اور ورا پیغام سنا تھا۔

حوالدار گورنام سنگھ انہیں ڈھنگ سے اپنی لوکیشن بھی نہیں بتا پایا تھا جب زندگی سے کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ وائرلیس میں ابھی تک زندگی موجود تھی۔ شاید پیغام موصول کرنے لا بٹن "آن" ہو گیا تھا کیونکہ مائیک سے بیک وقت کئی "ہیلو ہیلو" کی آوازیں نشر ہو رہی ہیں۔

"کنٹرول روم" اور نزدیکی گشتی جیپوں کے سارے ہی سیٹ آن ہو چکے تھے اور وہ لوگ رہ حوالدار سے اس حادثے کی تفصیلات طلب کر رہے تھے۔

اچانک ہی ایس پی شوراج کی "ہیلو ہیلو" کو بریک لگ گئے جب دوسری طرف سے گونج ر آواز سنائی دی۔

"شوراج! تم مجھے جانتے ہو۔ میں ببر خالصہ کا ایریا کمانڈر گورسیوک سنگھ ہوں۔ مجھے رف یہ کہنا ہے کہ تمہاری زندگی بہت لمبی نہیں۔ آج بچ جانے کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ آئندہ زیادہ دیر تک زندہ رہ سکو گے۔ تمہیں جلد مرنا ہو گا شوراج' اور ہم جب چاہیں گے تمہیں مار ڈالیں گے۔"

شوراج دیوانہ وار گالیاں دے رہا تھا لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ پولیس ہیڈکوارٹر کے کنٹرول روم اور سی آر پی کے مقامی آفس کے کنٹرول روم میں موجود آفیسرز اور دوسرے سرکاری ملازمین شوراج کی دیوانہ وار گالیوں پر مسکرا رہے تھے۔

"سالے پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔" پولیس کنٹرول روم کے آپریٹر نے یہ کہتے ہوئے لنک آف کر دیا۔

جب تک پولیس کی گشتی پارٹیاں جائے حادثہ پر پہنچتیں وہاں سے حملہ آور ٹرالی سمیت غائب ہو چکے تھے۔ بڑی جدوجہد کے بعد پولیس نے ٹرالی برآمد کر لی تھی لیکن وہ قریباً جل چکی تھی اور اس پر کوئی ایسا نشان تک باقی نہیں رہا تھا جو اس کے مالک کی نشاندہی کر سکتا۔ اور نزدیک پولیس اسٹیشنوں پر کسی نے ٹرالی چوری کا کوئی مقدمہ درج نہیں کروایا اور نہ تھانہ میں پولیس کے ٹاؤٹ مقامی دیہاتیوں سے کسی زمیندار کی ٹرالی غائب ہونے کی اطلاع حاصل کر پائے تھے۔

پولیس ہیڈکوارٹر میں بیٹھا شوراج سوچ رہا تھا کہ اب یہ "تحریک" مضبوط ہاتھوں
منتقل ہو چکی ہے اور صرف سیدھے سادے یا جذباتی سکھ ہی اس میں شامل نہیں
"تربیت یافتہ اور منظم دہشت گردوں" نے اس کی کمان سنبھال لی ہے۔

گور سیوک سنگھ ببر خالصہ کا ایریا کمانڈر پولیس کا سابقہ حوالدار تھا اور گزشتہ چار
سے مفرور---- دو سال سے اس کا نام تخریبی کارروائیوں کے ضمن میں سننے کو مل رہا
لیکن تین چار ماہ سے ان لوگوں نے تخریب کاری کے جو جدید انداز اپنا لئے تھے' اس کے
پولیس یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ضرور کوئی "تبدیلی" ان لوگوں میں آئی ہے۔

"کون ہو سکتا ہے یہ شخص جس نے عام سے دیہاتیوں کو جدید ترین تخریب کاری
ہتھکنڈوں سے آگاہ کیا؟"

ooo

شوراج ہی نہیں اس وقت میجر گپتا بھی یہی سوچ رہا تھا۔

دہلی کی طرف سے اس پر مسلسل لعن طعن ہو رہی تھی: اگر اس حملے میں شوراج
جاتا----؟ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ اچانک ہی اس نے جیپ کے ذریعے سفر کرنے
ارادہ بدل دیا اور اس کی جان بچ گئی ورنہ تو نجانے کیا قیامت ٹوٹتی----؟

اس کا المیہ یہ بھی تھا کہ وہ شاید پنجاب کے سب سے زیادہ "حساس علاقے" میں فرائض
انجام دے رہا تھا اور یہاں کا ایس پی اعلیٰ حکام کا ایسا منہ چڑھا تھا کہ کبھی اس سے تعاون
تیار نہیں ہوتا تھا وگرنہ صرف اپنے "ذرائع" پر انحصار کر کے بھی میجر گپتا اطلاعات حاصل
سکتا تھا اور اگر شوراج اس سے مل کر چلتا تو ممکن ہے وہ لوگ اس ذلالت سے بچ جاتے
کا سامنا اسے آج ہو رہا تھا۔

اس نے متعدد مرتبہ شوراج کو "جائنٹ ٹاسک فورس" کی تجویز پیش کی تھی لیکن شوراج
نے ہر دفعہ حقارت سے اسے ٹھکرا دیا تھا۔

اس نے انٹیلی جنس "نیٹ ورک" کو کبھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی: "میجر صاحب
آپ لوگ یہاں ڈیپوٹیشن پر دو تین مہینوں کے لئے آتے اور چلے جاتے ہیں۔ آپ کو
معلوم کہ ان لوگوں کی سائیکی کیا ہے؟ آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں تیر کی طرح سیدھا
دوں گا---- مجھے بڑے طریقے آتے ہیں۔ ساری زندگی پنجاب میں ہی گزری ہے
سکھ لوگ بڑے ہوڑمت ہوتے ہیں۔ صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں' صرف ڈنڈے کی
جب بھی میجر گپتا نے اس سے سنجیدہ ہو کر گفتگو کرنے کی کوشش کی' اس کی بات

راج اسی طرح حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ اس کے نزدیک میجر گپتا ایک گدھا تھا جس پر "را"
فائلوں کا بوجھ لدا تھا اور جلد ہی وہ اپنا بوجھ کسی اور گدھے کے سر پر لاد کر یہاں سے چلا
!----

اس کے برعکس ہیڈکوارٹر نے میجر گپتا کی صورت اپنا انتہائی ذہین آفیسر میدان میں اتارا

گپتا نے سٹالن گراڈ میں کے جی بی کی تربیت گاہوں میں تخریب کاری سے نمٹنے کے
وصی کورس کئے تھے اور اس سے پہلے میزورام اور آسام میں وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا
تھا۔

اس نے اپنی اعلیٰ کمان کو کہہ دیا تھا کہ جب تک اس علاقے سے شوراج کا تبادلہ نہیں
جاتا' وہ کچھ نہیں کر سکے گا---- اس کی خواہش پر "را" نے اس سلسلے میں بہتیرے ہاتھ
ں بھی مارے تھے لیکن شوراج کو اعلیٰ حکام کی سرپرستی حاصل تھی اور دوسری ایجنسیاں بھی
ں کے ساتھ تھیں۔ گپتا یہ جان چکا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں اس کی دال نہیں گلے
اور اس کا کیریئر خواہ مخواہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس نے اپنے "ماسٹرز" سے اس ضمن
"خصوصی اختیارات" حاصل کر لئے تھے اور معاملات پر براہ راست کنٹرول کا عزم بھی کر
تھا----!

حال ہی میں اس کے ساتھ شوراج نے پہلا منصوبہ "ڈسکس" کیا تھا اور اس نے فوراً
پر صاد کر دیا تھا کیونکہ اس منصوبے کی آڑ میں وہ شوراج سے بھی نمٹ سکتا تھا۔
ایجنسی کی طرف سے اسے "گرین سگنل" مل چکا تھا اور اب اس نے کھل کر میدان
آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ooo

اپنی دانست میں شوراج نے اپنے پہلے منصوبے سے ملتا جلتا پلان بنایا تھا۔ یہ الگ بات کہ
ں نے اپنے لئے خود ہی گڑھا بھی کھود لیا تھا۔ جو کام وہ اس سے پہلے مقامی غنڈوں سے لیتا
ا تھا اب وہی کام سزا یافتہ قاتلوں سے لینا چاہتا تھا۔

اس نے تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب کے علاقے سے ماضی میں گرفتار ہونے والے ایسے
چھ سزا یافتہ قاتلوں کا گروہ تیار کیا جائے جو "خالصتانیوں" کی آڑ میں اپنا کام کرتے رہیں
۔ وہ ان لوگوں کو خالصتان نواز گوریلا گروپوں میں داخل کر کے ان کی مستند لیڈر شپ کا
نلنا کروانا چاہتا تھا اور انہی لوگوں کے ذریعے کچھ غلط حرکات کروا کر مقامی آبادی کے دلوں

میں موجود خالصتانی حریت پسندوں کے لئے ہمدردی کو نفرت میں بدلنے کا متمنی تھا۔۔۔۔!

ایس پی شوراج کی یہ تجویز بظاہر معمولی سے ردو بدل کے ساتھ منظور کر لی گئی تھی "را" نے اس دہشت گرد گروپ کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔

اس وقت میجر گپتا کے سامنے سزائے موت کے چار قیدی موجود تھے۔ ان لوگوں کو اتر پردیش کی ایک جیل سے اس معاہدے کے بعد فرار کروایا گیا تھا کہ یہ "را" کے احکامات کی مکمل پابندی کرتے ہوئے ان کے مقاصد بروئے کار لائیں گے۔ ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر مطلوبہ نتائج پچاس فیصد بھی حاصل ہو گئے تو ان کی سزائیں معاف ہو جائیں گی۔

اس گروہ کے سربراہ "کالیا" کو میجر گپتا نے ایک مشن الگ سے سونپا تھا جس کا علم اس کے ساتھیوں کو بھی نہیں تھا۔ کالیا جالندھر کا مشہور بدمعاش رہا تھا اور اب سات قتلوں کے الزام میں سزائے موت کا منتظر تھا۔۔۔۔ جب اس کو "را" نے اغوا کر لیا۔

یہ سات قتل تو وہ تھے جو اس کے خلاف پولیس نے مع ثبوت پیش کر دیئے تھے۔ اس نے زندگی میں کتنے خون کئے تھے' اس کا اندازہ کالیا کو بھی نہیں تھا۔۔۔۔

انسانی خون کی اسے لت لگ گئی تھی۔۔۔۔!

وہ انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مار دینے کا عادی رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سے "را" نے اس کے منہ کو چاٹ لگا دی تھی اور کالیا نے اس کو اپنے لئے اعزاز جانا تھا۔

○○○

شام کو ایس پی شوراج کی ملاقات چاروں سے کروا دی گئی۔ شوراج نے اپنی ساری زندگی پنجاب پولیس میں گزاری تھی اور وہ ان چاروں کو جانتا تھا۔ شراپ کے پیگ سامنے رکھے وہ چاروں بڑے مستعد ہو کر شوراج کا لیکچر سن رہے تھے۔

ان کے دلوں میں تو خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے کیونکہ زندگی میں جو کام وہ چوری چھپے کرتے آئے تھے' آج پولیس کی سربراہی میں کرنے جا رہے تھے۔ انہیں کھل کھیلنے کی مکمل آزادی دے دی گئی تھی۔

انہیں دہشت پھیلانا تھی اور اس دہشت سے "را" نے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے تھے۔

اس دہشت گردی کو قانونی شکل عطا کر دی گئی تھی۔ چاروں حیران تھے کہ وہ واقعی بقائمی ہوش و حواس ہیں یا نہیں۔۔۔۔ چاروں جانتے تھے کہ وہ شوراج اور میجر گپتا کی توقعات سے بڑھ کر "بہتر نتائج" حاصل کر سکتے ہیں۔

بندہ بہادر فورس

اگلے ہی روز بھارتی اخبارات میں "بندہ بہادر فورس" کی طرف سے قریباً" تمام قابل ذکر اخبارات کے ایڈیٹرز کو خطوط جاری کر دیئے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ خالصتان کے حصول کے لئے یہ نئی جتھے بندی قائم کی گئی ہے' جس کے احکامات کی پابندی ہر سکھ کا فرض ہے۔ اگر کسی کو "بندہ بہادر فورس" کی طرف سے کوئی حکم ملا اور اس نے اس کی پابندی نہ کی تو نتائج کی ذمہ داری اس شخص پر عائد ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی گزشتہ ہفتے ہونے والی دو بڑی وارداتوں کی ذمہ داری بھی اس جتھے نے قبول کر لی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایسے بہت سے کارنامے اور بھی انجام دیں گے اور اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

فتوال کے نمبردار وسن سنگھ نے بھی یہ خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ نئی جتھے بندی کس نے قائم کی ہے؟ کیونکہ کم از کم پنتھک کمیٹی کو اس کا علم نہیں تھا۔

اس نے یہ سوچ کر سر ہلا دیا کہ ممکن ہے لڑکوں نے خود سے کوئی تنظیم کھڑی کر لی ہو کیونکہ آج کل اخبارات میں آئے دن ایسی تنظیموں کی خبریں آتی رہتی تھیں۔

اس روز تو وسن سنگھ حیران ہی رہ گیا جب اسے ایک رقعہ "بندہ بہادر فورس" کی طرف سے موصول ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ کیش دو دن میں اکٹھا کر لے۔ اسے دو روز بعد وہ جگہ بتا دی جائے گی جہاں اس نے پیسہ لے کر آنا ہے۔ اس خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر اس نے ان احکامات کی تعمیل نہ کی تو اس کا انجام بہت برا ہو گا۔

وسن سنگھ نمبردار چکرا کر ہی تو رہ گیا۔۔۔۔!

"یہ کیا مصیبت آ گئی ہے۔۔۔۔" اس نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

حریت پسندوں کے لئے لاکھ روپے کا بندوبست کرنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن آج تک کسی جتھے بندی نے یہ طریقہ نہیں اپنایا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے' چپ چاپ ان لوگوں کو روپیہ دے دے یا پنتھک کمیٹی والوں کے علم میں یہ بات لے آئے' ممکن ہے

وہ اسے مطمئن کر سکیں؟

اب ایک اور مصیبت آن پڑی تھی کہ پنتھک کمیٹی والوں سے رابطہ کیسے قائم کرے آج تک ان لوگوں نے خود ہی اس سے رابطہ کیا تھا' خصوصاً" امریک سنگھ کے آنے کے بعد سے تو وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے اور انہوں نے کام کرنے کا اپنا طریقہ ہی یکسر بدل دیا تھا۔ ان کے کسی ٹھکانے کا علم ان کے دوستوں کو نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ جب بھی چاہتے خود ہی اپنے ہمدردوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں اپنی ضرورت سے آگاہ کر دیتے تھے۔

وسن سنگھ کو ۴۸ گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی اور اس کے لئے فی الوقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے احکامات کی تعمیل کرتا۔ یہ بات تو اس کے دل نے بھی کہی تھی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

لیکن----!

یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ صحیح لوگ ہوں۔ کام کرنے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ اس نے سوچا عین ممکن ہے کہ یہ جذباتی نوجوان اپنے انداز سے کام کرنا بہتر جانتے ہوں' پھر اس نے تو "پنتھ کی سیوا" کرنی تھی خواہ کسی بھی طرح سے ہو۔

ooo

دوسرے روز وسن سنگھ کو ایک اور رقعہ مل گیا جس میں رات کے گیارہ بجے نہر کنارے ایک خاص جگہ کی نشاندہی کرنے کے بعد وہاں رقم لے کر آنے کو کہا گیا تھا۔ وسن سنگھ نے اس بات کا ذکر صرف جاگیر سنگھ سے کیا تھا جس نے خود بھی اس پر پریشانی کا اظہار کیا لیکن فی الوقت اس نے بھی وسن سنگھ کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اس طرح ممکن ہے وہ صورت حال کا قریب سے جائزہ لے سکیں۔

جاگیر سنگھ کے متعلق صرف وسن سنگھ کو علم تھا کہ وہ خالصتان کمانڈو فورس کے لئے کام کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ یہ بات کسی طرح ان لوگوں تک پہنچا سکے لیکن جاگیر سنگھ بھی اس طرح آ پڑنے والی مصیبت کا کوئی حل نہیں جانتا تھا۔ بالآخر دونوں اس فیصلے پر پہنچے کہ وہ "بندہ بہادر فورس" کی ڈیمانڈ پوری کریں گے۔ احتیاطاً" جاگیر سنگھ نے اس مقام کے نزدیک ہی رہ کر وسن سنگھ کی نگرانی کا فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو تیار رکھ سکے----! اس کے پاس ایک کلاشنکوف اور سو کے قریب راؤنڈ تھے۔

اسے ایک نزدیکی ٹھکانے کا علم تو تھا لیکن ابھی وہ یہاں جانا نہیں چاہتا تھا' جب تک حالات کی پوری طرح سمجھ نہ آ جائے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا

ooo

رات ڈھلے جب وسن سنگھ نمبردار نہر کنارے مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو دوپہر ہی سے وہاں موجود جاگیر سنگھ چوکس ہو کر بیٹھا ہوا تھا----!

اس کا ماتھا تو اس وقت ٹھنکا جب اس نے پولیس کی ایک جیپ سے چار مسلح سکھوں کو اترتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے اپنا حلیہ تو خالصتانی سکھوں جیسا بنا رکھا تھا لیکن پولیس کی جیپ سے ان کا اترنا مشکوک تھا۔ ممکن ہے وہ یہ سوچتا کہ انہوں نے حفاظت کے لئے پولیس کی جیپ استعمال کی ہے لیکن جیپ کے ڈرائیور نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی اور جس طرح لاپرواہی سے یہ لوگ اس طرف آئے تھے اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ غلط لوگ ہیں۔

"کوئی سرکاری چال----؟"

اس کے ذہن میں آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وسن کو اس سے آگاہ کر دے لیکن کس طرح؟ نہ تو وہ یہاں سے اٹھ کر جا سکتا تھا۔ اس طرح وہ ان لوگوں کی نظر میں آ جاتا کیونکہ اس درخت کے پیچھے اس نے پناہ لے رکھی تھی' اس کے نزدیک ہی وہ لوگ موجود تھے---- اور اگر وہ یہاں سے نکل بھی جاتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ راستے میں وسن سنگھ سے ملاقات ہو جائے؟ یہاں چپے چپے پر پولیس اور ہوم گارڈ موجود تھے اور ان کی موجودگی میں گلے میں کلاشنکوف لٹکا کر وہ سفر کر سکتا تھا؟ یہ لوگ تو رات کے وقت اکا دکا نوجوان سکھ دیوں دیکھ کر ہی گولی مار دیتے تھے۔

جاگیر سنگھ نے وہیں چھپ کر حالات سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا عین ممکن ہے اس طرح وہ وسن سنگھ کی جان ہی بچا سکے۔

جلد ہی اس کو وسن سنگھ نمبردار بھی نظر آ گیا جس نے سردی سے بچاؤ کے لئے کمبل اٹھ رکھا تھا اور اب وہ اس چھوٹی سی خانقاہ کے نزدیک کھڑا تھا جو نہر کنارے بنی ہوئی تھی---- اس جگہ ان لوگوں نے وسن سنگھ کو کھڑے ہونے کی تاکید کی تھی----!

جاگیر سنگھ نے اپنے نزدیک سے دو مسلح سکھوں کو اس کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسے یہاں سے ان لوگوں کی گفتگو تو سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے سکتا تھا۔

ان کے دو ساتھی اس کے قریب ہی چھپے ہوئے تھے۔ جاگیر سنگھ ان کی پوزیشن کا اندازہ لگا سکتا تھا کیونکہ اس کے اور ان لوگوں کے درمیان سرکنڈے حائل تھے۔ اس نے وسن

سنگھ نمبردار کو کمبل ہٹا کر ایک تھیلا نکالتے دیکھا تھا' غالباً" وہ کرنسی نوٹ ان کے حوالے کر رہا تھا۔

رقم دے کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں "فتح" بلائی اور واپس مڑا۔ بمشکل وہ چند قدم ہی چل پایا تھا جب اچانک ہی جاگیر سنگھ کو زبردست ذہنی دھچکا لگا۔ اس نے دونوں لٹیروں کے ہاتھوں میں موجود پستولوں سے شعلے نکلتے دیکھے تھے۔

ooo

اس کے ساتھ ہی وسن سنگھ نمبردار زمین پر گر پڑا۔ دونوں دیوانہ وار اس پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ کوئی جنونی قاتل دکھائی دے رہے تھے۔ جاگیر سنگھ کا خون کھول اٹھا۔

اس نے نزدیکی سرکنڈوں سے ان کے دو ساتھیوں کو نکل کر وسن سنگھ کی لاش کی طرف بڑھتے دیکھا۔ دونوں قہقہے لگاتے اس طرف جا رہے تھے۔

جاگیر سنگھ نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ دیں۔ اس نے اپنی گن سیدھی کی اور ٹریگر پر انگلی کا وزن بڑھا دیا۔

دو لاشیں یکے بعد دیگرے وسن سنگھ نمبردار کی لاش کے نزدیک گری تھیں۔ یہ دونوں وہی تھے جو قہقہے لگاتے ادھر کو بھاگے تھے۔ باقی دونوں زمین پر لیٹ گئے۔ غالباً" ان کے پاس پستول ہی تھے جو فی الوقت جاگیر سنگھ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

اچانک جاگیر سنگھ کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے نزدیک ہی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ یہ شاید پولیس کے وہ لوگ تھے جو اس علاقے میں ان لٹیروں کی حفاظت کے لئے موجود تھے۔ اب وہ ہوائی فائرنگ کر کے ڈرامے کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے تھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور نہر کی طرف بھاگ نکلا۔

نہر کنارے ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے کچھ سوچا' پھر کینوس کے تھیلے میں گن کو مضبوطی سے باندھ کر اسے اپنی کمر کے ساتھ باندھا اور نہر کے پانی میں اتر گیا۔

اس کے عقب میں فائرنگ کی آوازیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور وہ دیوانہ وار نہر کے پانی کو چیرتا دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس طرف پولیس نے ناکہ نہیں لگایا تھا ورنہ شاید وہ کبھی "سری ہرگوبندر پور" نہ پہنچ پاتا جہاں ایک گوردوارے میں گزشتہ تین روز سے جھیدار ماہل سنگھ نے پناہ لے رکھی تھی۔

صبح طلوع ہو رہی تھی جب وہ ماہل سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس نے ماہل سنگھ کو تمام

صورت سے آگاہ کیا۔

"تیاری کرو سنگھیو!" ماہل نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ بڑی بڑی گرم چادروں میں اپنا اسلحہ چھپائے نزدیکی کھیتوں کی طرف جا رہے تھے' گاؤں میں زندگی بیدار ہونے لگی تھی----!

اکا دکا لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ان کے راستے میں آنے والا ہر مرد یا عورت ہاتھ اٹھا کر انہیں دور ہی سے فتح بلاتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اول تو کوئی ان کی اصلیت ہی جاننے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ اگر کوئی جان بھی لیتا تو تعرض نہ کرتا۔

یہ لوگ اپنے "سورماؤں" کی عزت کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔

کھیتوں کے سلسلے کا آغاز ہونے پر ایک ٹرالی نظر آئی جس میں تازہ کٹا ہوا چارہ موجود تھا۔ ماہل نے اپنا اسلحہ چارے کے اس ڈھیر میں چھپا دیا۔ احتیاطاً" ایک دو پستول اور ہینڈ گرنیڈ انہوں نے ابھی تک اپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھے۔

جاگیر سنگھ کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹریکٹر وہاں پہنچ گیا۔ ماہل سنگھ کے ساتھیوں نے ٹرالی کے ساتھ ٹریکٹر لگایا اور ٹریکٹر ڈرائیور نے بغیر کوئی بات پوچھے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

چارے کے اس ڈھیر پر آلتی پالتی مارے وہ گنے چوس رہے تھے۔ یہ سب کچھ معمول کی زندگی کا حصہ تھا۔ راستے میں دو جگہ انہیں پولیس کی جیپیں بھی نظر آئیں لیکن کسی نے ان سے تعرض نہ کیا کیونکہ درجنوں ٹرالیاں جن پر لوگ تازہ چارے کے ساتھ بیٹھے گنے چوس رہے تھے' وہاں سے گزرتی دکھائی دیتی تھیں۔

ooo

اس سفر کا اختتام دریا کے کنارے موجود کھیتوں کے سلسلے پر ہوا۔ انہیں وہاں اتار کر ٹریکٹر والے نے ٹرالی آگے بڑھا لی۔ ان لوگوں نے اپنا اسلحہ دوبارہ بڑی بڑی چادروں میں چھپا لیا تھا اور اب منہ ہی منہ میں کچھ اشلوک پڑھتے ایک دوسرے کے تعاقب میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے----

وہ دریا کے کنارے چلتے چلتے کافی دور نکل آئے تھے۔

یہاں کنارے پر ایک کشتی موجود تھی۔ ماہل سنگھ کے ساتھی تو آگے بڑھ گئے جب کہ جھیدار ماہل سنگھ کشتی میں بیٹھ گئے۔ چپو ماہل سنگھ نے خود سنبھالے تھے اور وہ اب دریا کی لہروں پر کشتی چلاتا دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔

دریا کا پاٹ یہاں سے ساٹھ ستر گز چوڑا تھا---- ماہل سنگھ کے ہاتھ مشینی انداز میں

چل رہے تھے۔

اس مرتبہ جہاں ان کی کشتی کنارے پر لگی' وہاں ایک سکھ پہلے ہی سے موجود تھا۔ جاگیر سنگھ نے اس کے گھٹنوں کے نزدیک رکھی کلاشنکوف دیکھ لی تھی۔ اس نے ماہل سنگھ کو پہچانتے ہی زوردار آواز سے فتح بلائی۔ جاگیر سنگھ بھی "فتح" بلا کر اس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ کشتی ان لوگوں نے وریا کے ایک کٹاؤ میں اس طرح چھپا دی تھی کہ اگر آسمان سے بھی دیکھا جاتا تو بڑی بڑی وریائی گھاس میں چھپی یہ کشتی مشکل سے ہی نظر آتی۔

وہ نوجوان یہیں رہ گیا۔ ماہل سنگھ اور جاگیر سنگھ آگے بڑھ آئے۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اب وریائی گھاس میں گھس کر آگے بڑھ رہے تھے۔ گھاس کا یہ سلسلہ گہرا ہی گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

قریباً" دو فرلانگ تک پیدل چلنے کے بعد ماہل سنگھ رک کر دائیں طرف گھوم گیا جہاں گھاس ان کے قد سے بھی اونچی دکھائی دے رہی تھی۔ جاگیر سنگھ نے محسوس کیا یہاں گھاس بچھا کر پیدل چلنے کے لئے راستہ پہلے ہی سے بنایا گیا ہے۔

اچانک ہی اس نے خود کو ایک جھونپڑی کے آگے کھڑے پایا۔ جاگیر سنگھ تو دم بخود رہ گیا۔ یہ جھونپڑی اس جنگلی گھاس سے بڑے مشاق ہاتھوں نے تیار کی تھی اور بہت غور کرنے پر بھی اس جنگل کا حصہ دکھائی دیتی تھی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

جاگیر سنگھ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے اردگرد کچھ لوگ بڑے نامحسوس انداز میں ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

"ویر جی----!" اندر داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے ماہل سنگھ کے ساتھ ہی فتح بلائی۔ ان کے سامنے کیپٹن امریک سنگھ موجود تھا----!

امریک سنگھ زمین پر چٹائی بچھائے ایک ایل ایم جی کی مرمت میں مصروف تھا جو ان لوگوں نے ایک ایکشن کے دوران بھارتی سی آر پی سے حال ہی میں چھینی تھی۔

ماہل سنگھ نے سب سے پہلے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کرتے ہوئے جاگیر سنگھ کی ساری کہانی دہرانے کو کہا۔ جاگیر سنگھ نے تمام واقعات سے اسے آگاہ کر دیا۔ دوران گفتگو امریک سنگھ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔" جنھیدار ماہل سنگھ نے کہا۔

"ہاں' لیکن صورت حال بڑی تشویشناک ہے' جلد کچھ کرنا ہو گا۔" امریک سنگھ نے کہا۔

"افسوس وسن سنگھ بھی مارا گیا۔ بڑا جی دار بندہ تھا' بڑے کام کا بندہ تھا۔ ہم نے تو ان

لے میں شاید ہی کوئی ایکشن اس کی مدد کے بغیر کیا ہو گا---- بڑا نڈر آدمی تھا کیپٹن ب!" ماہل سنگھ کو وسن کی موت نے بڑا دکھی کر دیا تھا۔

"ہاں جنھیدار جی! میں جانتا ہوں---- لیکن چھوڑوں گا نہیں انہیں' بدلہ لیں گے۔ ن کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لیں گے۔ ایک ایک قطرے کے بدلے بدلے ایک دشمن" ماریں گے۔ شوراج بڑی جلدی کر رہا ہے۔ کوئی بات نہیں ہم بھی باقی کام چھوڑ کر پہلے اس کا حساب چکا لیں---- بڑا قرض چڑھا دیا ہے بانیے نے ہمارے سر---- شوراج بری موت براہمن واد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی موت ہو گی---- تو نے بڑے ظلم کئے ہیں' شوراج----!" وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

اپنی نفرت چھپانے کے لئے اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

وہ خط ابھی تک جاگیر سنگھ کے پاس محفوظ تھا۔ خط اس نے امریک سنگھ کے حوالے کر دیا۔ امریک سنگھ نے خط کی ایک ایک سطر کا جائزہ لینے کے بعد اس کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"تم اب گاؤں واپس نہ جانا۔" اس نے جاگیر سنگھ کو ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے ویر جی!" جاگیر سنگھ نے سرہلاتے ہوئے اس کے فیصلے پر صاد کیا۔

"آؤ لنگر پانی کر لیں۔" کہتے ہوئے وہ باہر نکل آیا۔

جھونپڑی کے ایک فاصلے پر ایک ایسی ہی جھونپڑی میں ان کے لئے پہلے سے تیار شدہ کھانا موجود تھا۔ امریک سنگھ کے علاوہ وہاں موجود باقی لوگوں نے بھی کھانا کھایا۔ اس دوران وہ اگلا پروگرام طے کرتے رہے۔

اس روز کے بھارتی اخبارات میں یہ خبر موجود تھی: "وہشت گردوں کے دو گروہوں کی آپس میں لڑائی' تین وہشت گرد مارے گئے جن میں سے صرف ایک کی شناخت ہو سکی ہے۔ اس کا نام وسن سنگھ نمبردار ہے اور وہ فتوال کا رہنے والا ہے۔"

ooo

پہلے ہی مرحلہ پر "بندہ بہادر فورس" کے دو جیالے مارے گئے تھے' گو کہ ان کی جگہ لینے کے لئے بہت سے اشتہاری ملزم موجود تھے لیکن پہلی ہی مہم میں دو آدمیوں کا اس طرح مارے جانا پولیس اور انٹیلی جنس کے لئے پریشانی ہی نہیں حیرانگی کی بات بھی تھی۔ انہیں یہ شک تھا کہ ان کی صفوں میں کوئی غدار موجود ہے جس نے اتنے خفیہ منصوبے کی اطلاع بھی پہنچا دی ہے۔

اس کے برعکس میجر گپتا کا یہ خیال تھا کہ یہ محض اتفاقات کا کھیل ہے اور دونوں آوی بھی بے خبری میں مارے گئے ہیں۔ اس نے شوراج کے ذہن میں بھی یہ بات ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن شوراج اپنی قائم کردہ رائے کو بدلنا کبھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔

"بندہ بہادر فورس" کے کارناموں کی خبریں بھارتی اخبارات میں آئے روز چھپنے لگی تھیں۔ دوسرے تیسرے روز ان کے حوالے سے کسی نہ کسی کارنامے کی اطلاع بھارتی عوام کو مل جاتی تھی۔ خبروں کی نشرو اشاعت کی ذمہ داری میجر گپتا نے براہ راست سنبھال لی تھی اور اخبارات میں موجود اپنے کارندوں کے ذریعے وہ یہ کام بخوبی انجام دے رہا تھا۔

"فورس" کی لوٹ مار کی کارروائیوں سے مقامی آبادی تنگ آ چکی تھی۔ یہ لوگ کسی کو بھی دھمکی آمیز خط لکھ کر اس سے رقم ہتھیا لیتے اور جو بے چارہ ڈر کے مارے ان کو رقم بہم پہنچاتا' اس کو اگلے ہی روز پولیس اغوا کر کے لے جاتی۔ اس پر---- یہی الزام لگایا جاتا کہ اس نے "دہشت گردوں" کی مالی مدد کی ہے۔

لوگ اس دوہری مصیبت سے تنگ آ چکے تھے----!

وہ جاننے لگے تھے کہ ایسے گھٹیا کام "حریت پسند" نہیں کرتے۔ حریت پسندوں کی مختلف تنظیموں کی طرف سے اس ضمن میں بھارتی اخبارات کو بیانات بھی جاری کئے جا رہے تھے جن میں لوٹ مار کرنے والوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے انہیں "خطرناک انجام" کی دھمکی دی گئی تھی۔

لیکن----!

ان کی خبروں کو دبا دیا جاتا تھا----!!

انٹیلی جنس کی طرف سے اخبار مالکان کو خصوصی درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس قسم کی کوئی خبر شائع نہ کریں۔ یوں بھی پنجاب میں سنسر کی پابندیوں کی وجہ سے حکومت کی اجازت کے بغیر ایسی خبریں شائع ہی نہیں ہو سکتی تھیں۔

○○○

میجر گپتا اس روز اپنے آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا جب فون کی گھنٹی بجنے لگی----!

"ہیلو----!" اس نے مستعد ہو کر جواب دیا۔ اس وقت کسی آفیسر کا فون بھی ہو سکتا تھا۔

"گھبرا نہ جانا گپتا۔ شاید یہ جان کر تیرے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں کہ میں کوئی "ٹاؤٹ" نہیں بلکہ خالصتان کمانڈو فورس کا ایریا کمانڈر ہوں۔"

گپتا نے دوسرے ہی لمحے میز کے کونے پر لگے پش بٹن کو دبا دیا۔ ایک باوردی جوان اندر داخل ہوا تو اس نے مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا اس کال کی لوکیشن کا پتہ لگایا جائے۔

"کیا نام ہے تمہارا اور یہ نمبر تمہیں کہاں سے ملا؟" گپتا نے کہا۔

"تم گدھے ہو گپتا۔ ایک دم گدھے۔ معلوم ہوتا ہے شوراج کی دوستی نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے ورنہ ایسے سوالات نہ کرتے نہ ہی لمبی گفتگو کرنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ ہے۔"

"شٹ اپ----!" گپتا نے اسے ڈانٹنا چاہا۔

"اور زور سے چلاؤ گپتا لیکن یاد رکھنا میں تمہاری تیار کردہ اس "فورس" کو شوراج اور تمہارے سمیت جہنم رسید کرنے والا ہوں۔ اس کھیل کا آغاز تم نے کیا ہے گپتا' اس کا انجام بھی تم پر ہی ہو گا----" دوسری طرف سے بات کرنے والا خاصے مضبوط اعصاب کا آدمی لگتا تھا۔

"کیا بک رہے ہو----" گپتا زور سے دھاڑا۔

"اور ہاں میں گاندھی چوک والے ٹیلی فون بوتھ سے کال کر رہا ہوں' اپنے کتوں سے کہو مجھے گرفتار کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

○○○

گپتا ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ آج اسے پہلی مرتبہ اتنی شدت سے غصہ آیا تھا۔ اس کے خفیہ فون کا نمبر دہشت گردوں تک کیسے پہنچ گیا----؟ یہ اس کے لئے بہت پریشان کن بات تھی۔

لیکن----!

اس سوال کا جواب تو اسے مل چکا تھا۔ فون کرنے والے نے شوراج کی طرف اشارہ تو کیا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ شوراج کی بے وقوفی کی وجہ سے ہی ایسا ہوا تھا۔

شوراج اس کے لئے بہت مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اس شخص کے ہوتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا اگر جلدی اس کا کچھ نہ ہوا تو شاید اس کا اپنا سروس ریکارڈ بھی تباہ نہ ہو جائے۔ وہ تو جلدی کرنل کے عہدے پر ترقی پانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور شوراج اسے میجر ہی ریٹائر کروانے پر تلا ہوا تھا۔

"اس کا کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ انٹرکام پر کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔

"یس سر!"

"کالیا کو لے آؤ۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد کالیا اس کے پاس موجود تھا۔ شراب کی بدبو کے بھبھوکے ابھی تک اس کے منہ سے اٹھ رہے تھے۔

"کالیا میں نے تمہیں الگ سے ایک کام سونپا تھا۔" اس نے کالیا کو دوسرے خالی کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا۔

دونوں یہاں اکیلے تھے اور اس کمرے میں میجر گپتا کی اجازت کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

"یاد ہے مہاراج! پہلے کی طرح آپ کے اس حکم کی بھی تعمیل ہو گی۔"

"کب ہو گی تعمیل؟" گپتا کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

"مہاراج دراصل آج کل....."

"کالیا! میں نے تمہیں موت کے منہ سے نکال کر نیا جنم دیا ہے۔ اپنے جنم داتا کا حکم نہیں مانو گے تو کتے کی موت مار دیئے جاؤ گے۔ کل تک یہ کام ہر صورت ہو جانا چاہیے---- سمجھے!" اس نے کالیا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا مہاراج' ہو جائے گا۔" کالیا نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"آج شام کسی وقت یہاں سے نکل جانا اور ہر بات پر منہ اٹھا کر نہ چلے آیا کرو۔ اپنا کام کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر میں ٹک جانا۔" اس نے کالیا کو سمجھایا۔

"جو حکم مہاراج۔" کالیا ابھی تک ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"جاؤ اب!" اس نے حکم دیا۔

جو گارڈ کالیا کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا' وہی اسے لے کر باہر واپس چلا گیا۔

ooo

امریک سنگھ کے فون نے گپتا کی نیند حرام کر دی تھی----!!

وہ انتہائی "حساس ادارے" کا رکن تھا اور اس کا نمبر دہشت گردوں کے پاس آ جانے کا مطلب یہی تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر بھی یہ لوگ نظر رکھتے ہیں---- اس نے اگلے ہی روز ایک اور خالی کوٹھی تلاش کر لی تھی جہاں ایک پرائیویٹ کمپنی کے نام پر دفتر حاصل کر

لیا تھا۔ اب ان لوگوں کو یہاں سے منتقل ہو جانا تھا۔

یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ لانس نائیک اس کا "بٹ مین" کسی اور کا بھی "بٹ مین" ہو سکتا ہے۔ دفتر منتقلی کا علم امریک سنگھ کو اگلے روز ہی ہو گیا تھا۔ وہ بھی سائے کی طرح ان لوگوں کے پیچھے تھا۔

ooo

شوراج کا مکان پولیس لائنز میں تھا اور اس نے اپنے مکان کو قلعے کی شکل دے رکھی تھی۔ یہاں مسلح پولیس کا ایک دستہ ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ رات کے اوقات میں پولیس لائنز میں پولیس کی گشت مزید بڑھا دی جاتی تھی۔ اس بات کا شوراج نے خصوصی اہتمام کیا تھا تاکہ اس کے ذاتی حفاظتی عملے میں کوئی سکھ موجود نہ ہو۔

شوراج کے بچوں کو سکول کالج تک لانے اور لے جانے کے لئے بھی پولیس کی خصوصی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔

آج بھی اس کی بڑی بیٹی انیتا راج معمول کے مطابق کالج جا رہی تھی' اسے پولیس سے سخت چڑ تھی۔ وہ آزاد خیال لڑکی تھی اور اس کا باپ پولیس کی صورت پہرے دار ہر وقت اس پر مسلط رکھتا تھا۔

"ڈیڈی میں تنگ آ گئی ہوں آپ کی اس پولیس سے۔" اس نے آج پہلی مرتبہ مکمل بغاوت کر ڈالی تھی۔

"بیٹا اس میں حرج ہی کیا ہے؟" شوراج نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"جہنم میں جائے سب کچھ' مجھے کوئی نہیں کھا جاتا۔ آج مجھے کوئی نہ لینے آئے۔ میں اپنی گاڑی لے کر جاؤں گی----!" اپنا فیصلہ سنا کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

شوراج بیٹی کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

اس نے یہی سوچا کہ شاید وہ پابندیوں سے تنگ آ گئی ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے وہ اپنی بیٹی کی "آزاد خیالی" سے متعلق کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ جانتا تھا جس ماحول میں اس کے بچوں کی پرورش ہوئی ہے' وہاں رہ کر وہ کیا گل کھلا سکتے ہیں۔ اس کا بیٹا تو باپ کو کبھی منہ لگانا ہی پسند نہیں کرتا تھا----!!

ooo

انیتا راج نے پورچ میں کھڑی گاڑی کی چابی ڈرائیور سے لی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے

کار سٹارٹ کر کے باہر نکل آئی۔ باہر نکل آنے سے پہلے وہ گیٹ پر موجود پہرے دار
کہہ گئی تھی اگر کسی پولیس والے نے اس کے نزدیک آنے کی کوشش کی تو وہ اس پر گا
چڑھا دے گی۔ اس کی گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے' وہ کر گزرے گی۔
پولیس لائنز میں واقع سپر سٹور سے اس نے اپنے بوائے فرینڈ نکھل کو فون کیا اور
کو مقامی ریسٹورینٹ میں ملنے کا وقت دے دیا!

کالج میں اپنی شکل دکھا کر وہ ریسٹورینٹ کی طرف جا رہی تھی جہاں نکھل نے آنے
وعدہ کیا تھا۔ ابھی وہ نہرو پارک والا موڑ مڑی ہی تھی کہ اچانک ایک جیپ اس کی کار
سامنے آ گئی۔ انیتا کے بریک لگاتے لگاتے اس کی کار جیپ سے ٹکرا گئی۔

جیپ والے کی اس حرکت سے اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے بالکل
سائیڈ سے جیپ نکال کر اس کے سامنے لا کھڑی کی تھی۔ غصے سے کھولتی ہوئی وہ کار سے
نکلی اور جیپ والے کو تقریباً" گالیاں دیتی ہوئی اس طرف بڑھی۔ جیسے ہی وہ جیپ کے نزد
پہنچی' اچانک ہی ڈرائیور نے اسے دبوچ لیا۔

اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ انیتا ڈھنگ سے پھڑپھڑا بھی نہ سکی۔ دو طاقت
ہاتھوں نے اسے گڑیا کی طرح اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیا جہاں پہلے سے موجود ایک
کٹے بدمعاش نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز قابو میں کر لی۔ دوسرے ہاتھ
تڑپتی ہوئی انیتا کے جسم کو قابو کر لیا۔

بمشکل دو تین منٹ کی مزاحمت نے ہی انیتا کا دم خم توڑ دیا۔ یہ سڑک ایک ماڈرن آ
میں سے گزر رہی تھی۔ اس طرف ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ جیپ ڈرائیور نے
اسی آبادی کی ایک گلی میں موڑ دی۔ دو تین گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک کوٹھی
گھس گیا جس کا دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ جیپ کے مڈگارڈ سے ٹکرا کر دروازہ کھلتا چلا گیا

ابھی ان لوگوں نے انیتا سے کوئی بات کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔
ڈرائیور نے گاڑی اندر کھڑی کی۔ پچھلی سیٹ والا آدمی انیتا سمیت باہر آ گیا۔ اس نے
کھلونے کی طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ ابھی تک اس کا ایک ہاتھ انیتا کے منہ
سے جما تھا۔

"تم جاؤ!" اس نے ڈرائیور کو مختصر سا حکم دیا اور وہ گیٹ سے باہر نکل گیا۔

ooo

بے بس اور بے کس انیتا نے ایک کمرے سے تین چار سکھ نوجوانوں کو باہر نکلتے

ن کی سکھ ہونے کی صرف ایک ہی نشانی تھی کہ انہوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ان
ں سے کسی نے مین گیٹ بند کر کے اندر سے تالا لگا دیا تھا۔

جیپ سوار اسے اٹھا کر اندر لے آیا پھر اس نے انیتا راج کو ایک فوم کے بیڈ پر پھینک
یا۔

"کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے خوف سے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم سکھ ہیں اور تمہارے باپ کا حساب چکانے کے لئے تمہیں یہاں لے کر آئے
ہیں۔"

دوسرے دروازے سے تین نوجوان سکھ اندر آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے جواب
یا۔

اب معاملہ انیتا کی سمجھ میں آیا۔ اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے' ان سے التجا کی
کہ اسے جانے دیں لیکن اس کی کسی التجا پر یہاں کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔

چاروں دیکھتے ہی دیکھتے شیطان بن گئے۔ انیتا پر غشی طاری ہونے لگی لیکن ان درندوں کی
دہشت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ انہوں نے انیتا راج کو بے پناہ اذیت سے دوچار کیا۔

"ہمارا تعلق "خالصتان کمانڈو فورس" سے ہے اور اپنے باپ کو ہمارا پیغام پہنچا دینا کہ اگر
ں نے ایک ہفتے تک اس شہر سے تبادلہ نہ کروالیا تو ہم تمہاری دونوں بہنوں اور ماں کا بھی
یا حشر کریں گے۔"

یہ وہ آخری الفاظ تھے جو انیتا کی سماعت میں محفوظ رہ گئے۔ اس کے نیم مردہ جسم کو
ب سے پہلے ایک صحافی نے دریافت کیا۔ یہاں سے نزدیک ہی ایک اخبار کے مقامی دفتر کو
کسی نے فون کر کے اس کوٹھی کا نمبر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں ایک بڑی خبر ان لوگوں کی
منتظر ہے۔۔۔۔!!

ooo

اخبار کا مقامی رپورٹر اور فوٹو گرافر یہاں پہنچے تو کوٹھی کا دروازہ کھلا تھا۔ کوٹھی بالکل خالی
تھی۔ اس کے ایک کمرے میں جسے "ماسٹر بیڈ روم" کہا جاتا تھا' ایس پی شوراج کی بیٹی۔۔۔۔
انیتا بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی۔

اخبار کے فوٹو گرافر نے فوراً" اپنا کام شروع کر دیا اور وہ دھڑا دھڑ انیتا راج کے مختلف
زاویئے بناتا رہا۔ رپورٹر نے ساتھ والے گھر سے فون کر کے پولیس کو مطلع کیا تھا کہ وہ ایس پی
شوراجزادی کو یہاں سے وصول کر لیں۔

پولیس کی آمد سے پہلے یہ خبر ساری کالونی میں پھیل چکی تھی----!!

انیتا راج نے پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ وہ ایس پی شوراج کی بیٹی ہے۔ کچھ غنڈے اسے اغوا کر کے یہاں لے آئے تھے اور انہوں نے ہی اس کا یہ حال کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے رونا شروع کر دیا۔

شوراج کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ماتحت انیتا کو ہسپتال منتقل کر چکے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر کہیں شوراج کو ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے----!

فوٹو گرافر بھی شوراج پر کبھی کا ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ یوں بھی ایس پی صاحب پریس والوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور شاید ماضی قریب میں انہوں نے اس فوٹو گرافر کو ناراض کر دیا تھا۔

صبح باقی اخبارات میں تو صرف ایس پی شوراج کی بیٹی کی غنڈوں کے ہاتھوں آبروریزی کی خبریں ہی شائع ہوئی تھیں لیکن "ویر ملاپ" اخبار نے تصاویر بھی شائع کر دی تھیں۔

شوراج کو مرنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنی بیٹی کا سامنا نہیں کر پایا تھا۔

کوٹھی کے باہر موجود پہرے دار کو اس نے دیوانوں کی طرح اپنے بید سے پیٹا تھا۔ جس کے سامنے اس کی بیٹی گاڑی لے کر نکل گئی تھی۔ وہ بے چارہ بے بسی سے پٹتا اور معافی مانگتا رہا----!

شام کو جب انیتا کی حالت قدرے سنبھل گئی اور اسے گھر منتقل کر دیا گیا تو شوراج اپنی بیٹی سے ملا۔ بیٹی نے روتے ہوئے وحشیوں کا پیغام اپنے باپ تک پہنچا دیا۔ شوراج کی گردن لٹک گئی۔ وہ خود میں بیٹی سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی ہمت بھی نہیں پا رہا تھا۔

○○○

دوسرے دن اخبارات نے اس حادثے پر اپنی اپنی الگ الگ رائے قائم کی تھی۔ کسی نے اشارتاً" انیتا راج کی "سوشل سرگرمیوں" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے کسی جلے عاشق کو اس حرکت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور کسی نے شوراج کے کسی دشمن کی کارستانی گردانا تھا۔

لیکن----!!

اخبار "ہندو نگر" کی ایک شہ سرخی نے تو میجر گپتا کے قدموں تلے سے زمین ہی

نکال دی تھی۔

اخبار "بندہ بہادر فورس" کے لیٹر ہیڈ سمیت پریس ریلیز شائع کی تھی۔ جس میں فورس نے اس حرکت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے اس طرح شوراج سے انتقام لیا ہے----!

غصے سے تلملاتے ہوئے میجر گپتا نے ایڈیٹر کا نمبر ملایا۔ یہ تو ان لوگوں کا خاص اخبار تھا جس میں اکثر "بندہ بہادر فورس" کی خبریں چھپا کرتی تھیں۔

"یہ کس حرامی کی حرکت ہے؟" اس نے دھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں میجر صاحب!" دوسری طرف سے ایڈیٹر نے کہا۔

"فوراً" میرے آفس پہنچو!" کہہ کر گپتا نے فون بند کر دیا۔

وہ بری طرح پریشان ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایڈیٹر کے جواب سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی اس کے ساتھ بھی ہاتھ کر گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد "ہندو نگر" کے ایڈیٹر کی گاڑی اس کے دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے میجر صاحب! آپ کو آج کیا ہو گیا ہے؟" ایڈیٹر خاصے برہم دکھائی دے رہے تھے۔

"لالہ جی آپ نے کیا غضب کر دیا۔ آپ کو کس گدھے نے کہا تھا کہ اس حرکت کی ذمہ دار بھی "بندہ بہادر فورس" ہے۔" گپتا نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ میجر صاحب میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی فوجی عقل مند بھی ہو گا ہے۔" لالہ کی بات نے ایک مرتبہ پھر گپتا کو چونکا دیا ---- "یہ خبر آپ کی طرف سے باوردی فوجی ہمیں دے کر گیا تھا۔ وہ شخص خاص طور سے مجھے ملا اور اس نے تاکید کی تھی کہ یہ خبر اشاعت سے پہلے کسی اور کے علم میں نہ آئے۔ یہ آپ کی خاص ہدایت تھی۔ آپ کمال کرتے ہیں' آپ کے حکم کی پالنا کرنے کے لئے میں نے اس عمر میں آدھی رات کر گزاری ہے اور آخری کاپی اپنے ہاتھوں پریس بھیج کر آیا۔ میں نے آپ کے حکم پر احتیاط رکھی کہ خبر کا علم کسی اور ایڈیٹر کو نہ ہونے پائے۔ الٹا آپ مجھ سے الٹی سیدھی بات کر رہے ہیں۔"

لالہ کی بات نے میجر گپتا کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ اس کے نادیدہ دشمن نے وار کیا تھا کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ کسی نے اس کی سازش بڑی کامیابی سے اس کے منہ پر ماری تھی۔ اب اسے ساری بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے لالہ جی سے معذرت کی

اور انہیں احساس ہی نہ ہونے دیا کہ اس پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ انہیں اس نصیحت کے ساتھ رخصت کیا کہ آئندہ وہ ایسی کسی بھی خبر کی براہ راست اس سے تصدیق کر لیا کریں۔

جیسے ہی لالہ کمرے سے باہر نکلا' فون ٹرانے لگا----!

"ہیلو----!" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا میجر گپتا' کیا گلا بیٹھ گیا ہے تمہارا؟" آواز اس کی جانی پہچانی تھی۔ میجر گپتا ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔

"کون ہو تم؟ کیا بک رہے ہو؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بمشکل کہا۔

"نام میں کیا رکھا ہے گپتا' بہرحال جلد ہی تمہیں میرے نام کا علم بھی ہو جائے گا۔ فی الوقت تو میں نے یہ جاننے کے لئے ٹیلی فون کیا ہے کہ تمہیں ہمارا کام پسند آیا یا نہیں۔ ہے گپتا تمہاری ذلیل سازش کی ابھی پہلی قسط ہی لوٹائی ہے۔ دوسری قسط تمہیں بہت جلد دی جائے گی۔ تمہارا واسطہ ابھی تک سیدھے سادے سکھوں سے رہا ہے۔ تم نہیں جانتے سکھ ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ تم نے جو ذلیل حرکت اپنے دوست کی دشمنی میں کی تھی اور اسے ہمارے کھاتے میں ڈالنا چاہا تھا' وہ تمہارے گلے کا ہار بن گیا ہے۔ گپتا فی الحال تم اپنے گلے میں پڑا یہ ڈھول بجاؤ' اگلا تحفہ تمہیں جلد ہی پہنچا دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا----!

میجر گپتا کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا واسطہ بڑے بڑے دہشت گردوں سے رہا تھا لیکن ایسا خطرناک اور بھیانک کھیل کسی نے اس کے ساتھ نہیں کھیلا تھا۔

فی الوقت تو وہ شوراج کو مطمئن کر سکتا تھا کہ خالصتان کمانڈو فورس والوں نے یہ حرکت کرنے کے بعد انہیں مزید ذہنی اذیت سے دوچار کرنے کے لئے ان کی قائم کردہ نام نہاد "بندہ بہادر فورس" کے کھاتے میں سب کچھ ڈال دیا ہے۔

لیکن----!

اس نے فون پر کہا تھا ابھی وہ ایک اور تحفہ بھی اس کے لئے روانہ کرنے والا ہے۔ نہ جانے کس مرتبہ وہ نہ جانے کیا کر گزرے----؟

اور----!

سب سے بڑھ کر تشویشناک بات تو یہ تھی کہ اسے نئے آفس اور فون نمبر کا بھی علم ہو گیا ہے---- ضرور کوئی گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے----!!

اس نے سوچا اور یہ شک اس کے ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اتنا بے بس کیوں ہو گیا ہے۔

اس نے فی الوقت تمام کام پس پشت ڈال کر "را" کے مقامی دفتر میں موجود اس آستین کے سانپ کو ڈھونڈنے کی ٹھان لی تھی جو دہشت گردوں کا ساتھی اور بھارت سرکار کا تنخواہ دار بھی تھا----!

○○○

کالیا نے میجر گپتا کے حکم کی تعمیل کر دی تھی۔

اب اسے ہدایت ملی تھی کہ وہ فی الوقت کسی دوسرے شہر کی طرف نکل جائے اور وہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد واپس آ جائے۔ کالیا کے پاس خصوصی سیکورٹی کارڈ تھا۔ اس کارڈ کی موجودگی میں کوئی سرکاری اہلکار کم از کم اس کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لانس نائیک گیان سنگھ نے اپنی جان پر کھیل کر کالیا اور اس کے ساتھیوں کی تصاویر امریک سنگھ تک پہنچائی تھیں۔ ان لوگوں کو علم ہو گیا تھا کہ نام نہاد "بندہ بہادر فورس" کا سربراہ "کالیا" کون ہے؟

اور "را" کی پلاننگ میں وہ کہاں فٹ بیٹھتا ہے----!

گورسیوک سنگھ کے ساتھیوں نے امریک سنگھ کی ہدایت پر جالندھر میں ان تمام اڈوں پر نظر رکھی ہوئی تھی جو ماضی میں کالیا کے ٹھکانے رہے تھے۔

کالیا کے ماضی کے ایک قریبی ساتھی سے رابطہ کرنے کے بعد سکھ حریت پسندوں کو علم ہو گیا تھا کہ اس کے تعلقات لدھیانہ کی مشہور طوائف چندو بائی سے رہے ہیں اور وہ جیل میں بھی کالیا سے ملنے جایا کرتی تھی----!

سکھ حریت پسندوں نے لدھیانہ کے "لچا بازار" پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ انیتا راج کے حادثے کے دوسرے ہی دن کیپٹن امریک سنگھ کو اطلاع ملی کہ کالیا اس بازار میں دیکھا گیا ہے۔

امریک سنگھ نے ایک منصوبہ طے کر لیا تھا۔

وہ "را" کے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کرنا چاہتا تھا کہ اسے کسی حد تک ہی سہی' اپنی کم مائگی کا احساس ضرور ہو----!

ooo

میجر گپتا نے کالیا کو کم از کم تین چار روز کے لئے غائب ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اثناء میں اسے امید تھی کہ شوراج اپنا تبادلہ جلدی یہاں سے کروا لے گا یا پھر چھٹی پر چلا جائے گا---- اس نے اپنی دانست میں شوراج کے اس علاقے میں موجود رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں چھوڑا تھا۔

اس کے اندازے کے عین مطابق اگلے ہی روز شوراج نے دو ماہ کی چھٹی کی درخواست اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دی تھی۔ ابھی اس کی بچی زیر علاج تھی لیکن امید کی جا رہی تھی جیسے ہی وہ ٹھیک ہو گی' شوراج فی الوقت یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔

حالات نے اسے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

ایک مقامی ڈی ایس پی کو قائم مقام ایس پی کے فرائض سونپ دیئے گئے تھے اور میجر گپتا اس ڈی ایس پی کی ذاتی اہلیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کوئی آفیسر اب علاقے میں نہیں رہا جو "را" کے سامنے دم مارنے کی ہمت بھی رکھتا ہو۔

ooo

کالیا شراب کے نشے میں دھت تھا۔

رات کے دوسرے پہر میں بازار کی رونق مانند پڑنے لگی تھی اور گشت کرنے والی پولیس کے سپاہی بھی تھک ہار کر اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ رہے تھے---- جب لدھیانہ کے لچا بازار کی چندو بائی کے گھر کے باہر پولیس کی ایک جیپ آ کر ٹھہری۔

اس میں سے ایک انسپکٹر اور چار پولیس کانسٹیبل باہر آئے اور چندو بائی کے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ کمرے میں اس وقت سوائے نیم برہنہ چندو بائی کے اور کالیا کے اور کوئی موجود نہیں تھا۔

"ہم کالیا کو لینے آئے ہیں----!" انسپکٹر نے پستول ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا۔

"ابے جا تیری کیا مجال جو کالیا کو ہاتھ بھی لگا سکے۔" چندو بائی نے جھومتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ نے اسے صوفے پر ڈھیر کر دیا۔

"کالیا تمہیں اسی وقت میجر گپتا نے یاد کیا ہے۔" انسپکٹر نے کالیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن انہوں نے تو....." کالیا کا نشہ ہرن ہونے لگا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"وہ پرانی بات ہے۔ میں تمہیں دس منٹ پہلے کا حکم سنا رہا ہوں۔" انسپکٹر نے اس

کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب! ہم چلتا ہے----!" کالیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

چندو بائی اس دوران پھٹی پھٹی نظروں سے ان لوگوں کا جائزہ لیتی رہی۔

"تم بے فکر رہنا' چندو بائی میں جلدی آتا ہوں۔ کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو گا----!" نے جانے سے پہلے چندو بائی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائی تو کالیا نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا۔

"بے وقوف مت بنو---- جیپ میں ہم ہتھکڑی اتار دیں گے۔ یہاں کسی کو تمہارے فق شک نہیں ہونا چاہیے۔" انسپکٹر نے اس کو سمجھانے کے انداز میں کہا اور کالیا نے پنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔

جیپ تک کا فاصلہ اس نے قریباً" لڑکھڑاتے ہوئے طے کیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے ملزم طرح پیچھے بٹھایا اور چل دیئے۔ یہاں کے مکینوں کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ۔ ایسا تو یہاں روزانہ کا معمول تھا' کسی نے اس طرف توجہ دینا ہی مناسب نہ سمجھا۔

جیپ جب شہر کی حدود سے باہر نکلی تو کالیا کا نشہ بھی ہرن ہونے لگا۔ اسے انسپکٹر نے بتایا تھا کہ میجر گپتا لدھیانہ میں ہی اس سے ملنے آیا ہے لیکن یہ لوگ تو لدھیانہ سے باہر نکل آئے تھے اور اب جگراؤں کی طرف جا رہے تھے۔

"تم تو کہتے تھے....."

"شٹ اپ----!" اس نے کچھ کہنا چاہا تو انسپکٹر نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

"کون ہو تم----؟" کالیا اب مکمل ہوش میں آ چکا تھا۔

"کیا شراب کے نشے میں اندھے ہو گئے ہو؟ نظر نہیں آ رہا ہم پولیس والے ہیں۔" اب ملا۔

کالیا نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن سپاہیوں نے اس کی دھنائی کر کے رکھ دی۔ جلد ہی وہ حوصلہ ہار گیا اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ان لوگوں نے ایسا بہترین وقت اس کے اغوا کے لئے منتخب کیا تھا جب پولیس اور سی آر پی کی گشت تقریباً" ختم ہو چکی تھی۔ جیپ اب ملاں پور کے نزدیک پہنچ گئی تھی جہاں سے انہوں نے جیپ کچے میں اتار لی۔ تھوڑی دور جا کر انہیں ایک پرائیویٹ ویگن دکھائی دی جس میں میاں ماہل سنگھ پہلے سے ہی موجود تھا۔

ooo

تمام لوگ کالیا سمیت ویگن میں منتقل ہو گئے جب کہ جیپ کو ایک سپاہی چلاتا ہوا واپس لے گیا۔ کالیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہ گیا۔

ماہل سنگھ مشاق ڈرائیور کی طرح ویگن کو بھگا رہا تھا۔ جلد ہی ان کے سفر کا اختتام کھیتوں کے ایک سلسلے میں ہو گیا جہاں انسپکٹر اور تین سپاہی کالیا کو دھکے مارتے ہوئے آگے لے گئے اور ماہل سنگھ ویگن واپس لے گیا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ ان لوگوں نے دو تین فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا۔ یہاں میلوں دور تک کماد کی بڑی بڑی اور اونچی اونچی فصلیں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ فصلوں کے اس سلسلے ہی میں وہ چھوٹی سی حویلی تھی جہاں کالیا کو ہتھکڑی سمیت منتقل کر دیا گیا تھا۔

اس منتقلی کے بمشکل دو منٹ بعد ہی ان لوگوں نے کالیا سے اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا تھا۔ لمبی قید نے کالیا کے جسم میں وہ دم خم نہیں رہنے دیا تھا جس کے بل بوتے پر وہ پولیس کی تفتیش کاٹتا رہا تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہی اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے نہ صرف سارا منصوبہ افشا کیا اور "بندہ بہادر فورس" کی اصلیت بتا دی بلکہ میجر گپتا کے کہنے پر انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کی بھی پوری تفصیلات اس جرم میں شامل ساتھیوں سمیت بیان کر دیں۔

امریک سنگھ جو کیپٹن کے روپ میں اس مہم کی کمان کر رہا تھا' کے ہاتھوں میں موجود ویڈیو کیمرے نے کالیا کے جرائم کی تفصیلات کو سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کر لیا تھا۔

اب وہ ایک نئے اور خطرناک کھیل کا آغاز کرنے جا رہے تھے۔۔۔۔!

گورسیوک سنگھ کے ساتھیوں نے ۲۴ گھنٹے کے اندر ان تینوں کو بھی قابو کر لیا تھا جو اس گھناؤنے کھیل میں میجر گپتا کے ساتھی رہے تھے۔

ooo

شوراج کے لئے آج کا دن بڑا چونکا دینے والا تھا۔

علی الصباح ہی اسے فون کال موصول ہوئی تھی کہ اس کی بیٹی کے ساتھ "بلاتکار" کے مجرم گرفتار کر لئے گئے ہیں لیکن انہیں پولیس نے نہیں بلکہ خالصتان کمانڈو فورس نے گرفتار کیا ہے۔ فون کرنے والے نے کہا تھا کہ انہوں نے سکھوں کے ایک مقدس نام کو رسوا کرنے کی کوشش کی اور حالات سے بے خبر عوام کو محض "را" اور پولیس کے کہنے پر لوٹا اور گولیوں کا نشانہ بنایا۔

ان لوگوں نے شوراج سے کہا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مجرموں کی شناخت کے لئے فلاں جگہ پر پہنچ جائے۔ یہ بات اس کے لئے تکلیف دہ تو ہو گی لیکن اپنی بیٹی کو ضرور ساتھ لے جائے' کیونکہ اس کے ذہن میں مجرموں کی شکلیں ضرور محفوظ رہ گئی ہوں گی۔

فون کرنے والے نے کمال ہوشیاری سے میجر گپتا کا ذکر نہیں آنے دیا تھا۔ شاید یہ لوگ اپنا کارڈ کسی بہتر موقعے کے لئے سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے۔

شوراج اور اس کی بیٹی پولیس کے جلوس کے ساتھ بیان کردہ موقعے پر پہنچے تو یہاں چار لاشیں ان کی منتظر تھیں۔

ابتا راج نے لاشوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے اپنے باپ کو تصدیق کر دی تھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ "بلاتکار" کیا ہے۔۔۔۔ اس نے کالیا کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص اسے اغوا کر کے لایا تھا۔

ایس پی شوراج کو زمین نہیں مل رہی تھی کہ پھٹتی اور اس کا وجود نگل لیتی۔ اس نے بندہ بہادر فورس کو گھناؤنے مقاصد کے لئے قائم کیا تھا' اس نے شوراج کے اپنے ہی گھرانے کو ہدف بٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ بیٹی کے ساتھ چپ چاپ گھر لوٹ آیا۔ اگلے روز شوراج اور اس کے بچے چھٹیاں گزارنے پہاڑ پر چلے گئے۔ اس نے اس دوران محکمے کو اپنے تبادلے کی درخواست کر دی تھی۔

ooo

"را" کا مقامی سپائی ماسٹر میجر شونندن گپتا دو دن کے لئے ایک پل کے لئے آنکھ بھی نہیں جھپک سکا تھا۔

لدھیانہ سے کالیا کے اچانک غائب ہو جانے کی خبر نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کالیا خود روپوش ہو گیا ہے یا پھر ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے جو اس کی تلاش میں کو آ گئے تھے۔۔۔۔؟

کالیا کے پاس اچھی خاصی رقم ہر وقت موجود رہتی تھی۔ عین ممکن ہے اس نے "را" کے شکنجے سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا ہو کیونکہ شوراج کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کا خمیازہ اگر زندگی کے کسی مرحلے پر بھی پھوٹ جاتا تو کالیا کو شوراج کتے کی موت مروا دیتا۔

میجر گپتا نے سوچا عین ممکن ہے اس خوف نے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا ہو۔

لیکن----!

جب وہ دوسرے پہلو پر غور کرتا تو لرز کر ہی رہ جاتا۔ جن لوگوں کو "بندہ بہادر فورس" کی اصلیت اور اس کے فون نمبروں اور نقل و حرکت تک کی خبر رہتی تھی' وہ یقیناً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس جرم کے پس پردہ کالیا موجود ہے----!

اگر کالیا ان کے ہتھے چڑھ گیا تو----!

یہ تصور ہی اتنا اذیت ناک تھا کہ اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی----!!

آج جب ڈاک کے ذریعے اس کے نام ایک پیکٹ موصول ہوا تو اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے----!

پہلے تو اس نے بم ڈسپوزل سکواڈ کے ذریعے پیکٹ کو اچھی طرح چیک کروایا پھر پیکٹ اپنے کمرے میں لے آیا۔ کھلنے پر اس سے ایک ویڈیو کیسٹ اور اس کے ساتھ چھوٹی سی سلپ موصول ہوئی تھی جس پر لکھا تھا۔

"را" کے مقامی ماسٹر کے لئے دوسرا تحفہ----!

ویڈیو پر لکھا تھا "ماسٹر کاپی محفوظ ہے۔"

کپکپاتے ہاتھوں سے میجر گپتا نے ویڈیو ریکارڈر میں کیسٹ داخل کی۔ اب جو فلم وہاں چل رہی تھی اس کو دیکھ کر گپتا کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ کالیا کے انکشافات کی کہانی تھی۔ اس نے "بندہ بہادر فورس" کی اصلیت کے ساتھ ساتھ میجر گپتا کی ہدایت پر انجام دینے والے اپنے تازہ کارنامے کی مکمل تفصیلات بھی بیان کر دی تھیں۔

گپتا نڈھال سا ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گیا----!

اماں ملی تو کہاں ملی

بخشی کی جان بڑے عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اخبار میں ایک خبر کی اشاعت پر تو اس نے اب تک نجانے کتنی مرتبہ دیوی کے چرنوں میں ماتھا ٹیک کر شکر ادا کیا تھا کہ اس کا نام یا ایڈریس اس فہرست میں شامل نہیں تھا جو درشن کمار نے مرنے سے پہلے ریکارڈ کروائی تھی لیکن خبر کی اشاعت کے تیسرے ہی روز جب اسے مہتہ کا پیغام ملا کہ وہ ہائی کمیشن پہنچ کر اس سے ملاقات کرے تو بخشی کا ماتھا ٹھنکا----! اس گھمبیر صورت حال میں مہتہ کو میری کیا ضرورت پیش آ گئی۔ یوں بھی جب حالات ایسے ہوں تو وہ لوگ ایک دوسرے سے وقتی طور پر رابطہ ختم کر دیتے تھے لیکن یہ اچانک مہتہ کو کیا سوجھی؟

کچھ بھی ہو اس نے سوچا: "جانا تو بہرحال ضرور ہو گا----!"

بخشی جانتا تھا کہ آج کل بھارتی سفارت کاروں پر سکاٹ لینڈیارڈ اور برٹش انٹیلی جنس نے گہری نظر رکھی ہوئی ہے اور ان سے ملنے والا کوئی بھی شخص برٹش انٹیلی جنس کی نظروں میں بھی آ سکتا ہے لیکن اس کے لئے حکم کی سرتابی ممکن نہیں تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد بخشی نے اپنی بیگم کے ساتھ ہائی کمیشن جانے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی آج بھارت کا یوم جمہوریہ تھا اور اس موقعے پر ہائی کمیشن جانے کا رواج تھا---- آج بھارت کا یوم جمہوریہ تھا اور اس موقعے پر ہائی کمیشن میں ہونے والی تقریب میں بھارتیوں کی بھی تعداد موجود رہتی تھی۔ اس طرح عام لوگوں میں گھل مل کر وہ سیکورٹی کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا----!!

ہائی کمیشن میں کافی رونق تھی لیکن وہاں موجود قریباً" سب ہی لوگ حال ہی میں برطانوی اخبارات میں درشن کمار کی موت کے حوالے سے چھپنے والی خبر پر بحث کر رہے تھے۔

کرنل مہتہ نے ہال کے ایک کونے میں کھڑے بخشی پر نظر ڈالی اور بالکل نامحسوس انداز سے چلتا ہوا اس کے نزدیک آ گیا۔

ایک مودب ویٹر نے اس اثناء میں شراب کا جام بخشی کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

"ادھر چلے آؤ' کچھ بات کرنی ہے۔" کرنل مہتہ نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسی طرح نامحسوس انداز سے بھیڑ کے بیچوں بیچ راستہ بناتا ہوا آگے چلنے لگا۔

یہاں موجود بیشتر چہرے بخشی کے شناسا تھے۔ جو کوئی اس کی طرف دیکھتا' مسکرا کر اسے ہیلو کہتا۔ بخشی بھی اس کے جواب میں مسکراتا۔ اس سفر کا اختتام بغلی دروازے سے داخل ہونے کے بعد ایک کمرے میں ہوا۔

"ویل ڈن بخشی----!" کمرے میں داخل ہوتے ہی کرنل مہتہ نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں----!" بخشی نے تلخ گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اب ایسی بھی کیا بات ہے بخشی جو تم سمجھ ہی نہ سکو۔" مہتہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

"کرنل مجھے پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ میں واقعی تمہاری بات نہیں سمجھ پا رہا----!" بخشی کے چہرے پر الجھن کے آثار نمایاں تھے۔

"تم بہت چالاک آدمی ہو بخشی۔ مجھے اس سے انکار نہیں لیکن ابھی تم اتنے چاتر بھی نہیں بنے کہ میری آنکھوں میں دھول جھونک سکو۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔"

بخشی گڑبڑا کر رہ گیا۔

اس نے پہلے تو یہی سوچا کہ کرنل مہتہ ابھی تک درشن کمار والے صدمے سے نہیں سنبھل پایا اور اس نے یوں بھی ضرورت سے زیادہ ہی پی لی ہے لیکن کوئی ایسی غلط فہمی ضرور اس کے دل میں بخشی کے لئے جڑ پکڑ چکی تھی جس کا ازالہ ضروری ہے ورنہ کرنل مہتہ اس کے لئے سنگین مسائل پیدا کر سکتا ہے۔

"دیکھو کرنل! اگر تم کوئی سرپرائز دینا چاہتے ہو تو بھگوان کے لئے مجھے اور پریشان نہ کرو اور صاف صاف بتا دو کہ آخر بات کیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی----!" اس نے واقعی زچ ہونے کے بعد کہا۔

"کمال کے اداکار ہو بخشی! تم نے تو بڑے غلط میدان کا انتخاب کیا۔ کہیں فلمی دنیا میں....."

"پلیز شٹ اپ----!" بخشی پھٹ پڑا۔ اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ "اوہ مائی گاڈ! ایکسکیوزمی! کرنل میں اب مزید سسپنس ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے اگر تم میرے منہ سے سننا ہی چاہتے ہو تو مجھے صرف ایک سوال کا جواب دو کہ درشن کمار نے ہمارے جن "سیف ہاؤس" کا انکشاف کیا ہے اس میں تمہارا نام و ایڈریس کیوں شامل نہیں----؟" کرنل مہتہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

اب بخشی کا ماتھا ٹھنکا اور اسے ساری بات کی سمجھ آ گئی۔

"دیکھو کرنل! اصولی طور سے درشن کمار کے معاملے میں مجھے ہائی کمان سے تمہاری بات کرنی چاہیے تھی کیونکہ تم نے مجھے ڈبل کراس کیا---- تم نے اس شخص کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جو اس ملک میں تمہارا سب سے زیادہ وفادار اور جانثار ساتھی ہے---- لیکن خود تمہیں اتنی بڑی چوٹ لگی ہے کہ میں نے گلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تم..... الٹا مجھ پر دھونس جما رہے ہو۔" بخشی نے کاٹ کھانے والے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"یہ میرے سوال کا جواب ہے مسٹر بخشی؟" مہتہ کا لہجہ نارمل تھا۔

"میں تمہارے بے ہودہ سوالات کے جوابات دینے کا پابند نہیں ہوں لیکن ایک بات میں ضرور سمجھا دوں کہ اگر تم پہلے کی طرح کوئی اور گندا کھیل کھیل رہے ہو تو اس میں بھی تمہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کرنل---- تمہارے جیسے درجنوں گدھے میرے جوتے چاٹتے ہیں۔" بخشی کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔

"بخشی تم نے درشن کمار کو قتل کروا کے جس طرح ہمارے "نیٹ" کو اس ملک میں بند کرنا چاہا ہے تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی---- میں نہیں جانتا تھا کہ تم دہشت گردوں سے مل چکے ہو اور اب ہمیں ڈبل کراس کر رہے ہو۔" کرنل مہتہ نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ کرنل----!" بخشی کو چکر سا آ گیا۔

"اپنا گلہ نہ پھاڑو بخشی۔ میرے پاس تمام ثبوت موجود ہیں۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"کیسا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" بخشی نے اچانک سنبھلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بخشی یا تو تم پاگل ہو چکے ہو یا پھر پاگل ہو جاؤ گے۔ تم خود کو اتنا سمارٹ کب سے سمجھنے لگے۔ کیا یہی ایک ثبوت کافی نہیں کہ تمہاری بیٹی نے مشہور دہشت گرد خورشید کے ساتھ بھارت میں رنگ رلیاں منائی ہیں۔ کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟"

"کیا بک رہے ہو کرنل!"

بخشی اگر کرسی کا سہارا نہ لیتا تو لڑکھڑا کر گر پڑتا۔

"تم خوش قسمت ہو بخشی کہ خورشید کے بھارت سے نکل جانے کے بعد اس کی شناخت ہو سکی۔ تمہاری بیٹی کا بوائے فرینڈ ہونے کی وجہ سے کسی نے اسے کاؤنٹر نہیں کیا۔ وہ تو ہمارے یہاں کے ایک "سورس" نے اس کی آمد کے بعد انکشاف کیا کہ جو شخص بخشی کی بیٹی نیلما کے ساتھ گلچھرے اڑا کر اور بھارتی سرکار کی مہمان نوازی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر لوٹا ہے وہ خورشید فاروق کوئی اور نہیں بلکہ لبریشن فرنٹ کا دہشت گرد ہے جس نے سفارت کار ساٹھے کے قتل میں بھی حصہ لیا تھا اور جو اس ملک میں کریم خان کا دست راست ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو کرنل! ناکامی کے صدمے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم نے یہاں میری حیثیت کو صفر کر کے اپنا کھیل رچانا چاہا تھا جس میں تمہیں منہ کی کھانی پڑی۔ اب جھنجھلا کر تم مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو لیکن تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔"

"بخشی یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ سزا سے کون نہیں بچ سکتا لیکن تم اتنا یاد رکھو کہ دیش سے غداری کی تمہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

کرنل مہتہ اس کا جواب سنے بغیر باہر نکل گیا۔

○○○

بخشی کو اس انکشاف نے ایک مرتبہ تو لرزا دیا تھا کہ اس کی بیٹی کا بوائے فرینڈ کشمیری دہشت گرد خورشید ہے اور اس کے ساتھ نیلما نے لندن سے سفر کیا تھا' وہاں بھارت میں بھی دونوں نے اکٹھے وقت گزارا ہے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر قدرے مطمئن ہو رہا کہ عین ممکن ہے کرنل مہتہ نے اپنی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے اس کے خلاف یہ جال بچھایا ہو----!

اس کی اطلاع کے مطابق تو نیلما نے سفر ہی اکیلے کیا تھا---- مسز بخشی خود اسے ہیتھرو پر "سی آف" کر کے آئی تھی اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو نیلما ان سے کیوں چھپاتی۔ وہ آخر ایک آزاد خیال لڑکی تھی اور دونوں نے کبھی اس پر دوستوں کے سلسلے میں کوئی قدغن نہیں لگائی تھی۔

لیکن----!

درشن کمار والی کیسٹ میں واقعی اس کا نام کیوں شامل نہیں۔

اس سوال کا جواب اس کے لئے حد درجہ اذیت ناک تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ کرنل مہتہ کیا سوچ رہا ہے۔

بادی النظر میں واقعی کوئی اور بھی ہوتا تو یہی سمجھتا کہ اس سازش میں اس کا ہاتھ ہے اور جن لوگوں نے بھی یہ کام کیا ہے انہوں نے اسے "اپنا آدمی" سمجھ کر چھپائے رکھا----!

لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ دشمن نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہوں۔ ایک طرف تو انہوں نے "را" کے مقامی ایجنٹ بے نقاب کر دیئے اور دوسری طرف بخشی کا نام چھپا کر اسے "را" کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تاکہ ان لوگوں کی آپس میں ٹھن جائے۔

"لیکن اس کی بات مانے گا کون----؟"

کیسے سمجھا پائے گا یہ سب کچھ؟ کون اعتبار کرے گا اس رام کہانی پر؟ بھگوان کس طرح پھنس گیا ہوں میں بھی----! اس نے اپنے گھر کی طرف سفر کرتے ہوئے سوچا۔

○○○

مہتہ کی روانگی کے بعد وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے اپنی بیوی سمیت یہاں سے چلا آیا تھا۔ نیلما آج گھر پر نہیں تھی ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی آتی۔ اب اسے نیلما سے ان الزامات کی تصدیق طلب کرنا تھی----!

ایک بات تو طے شدہ تھی کہ اگر امر واقعہ یہی ہے جو کرنل مہتہ نے بتایا تو بھی اس کی بیٹی بے گناہ تھی۔ کسی نے اسے لاعلم رکھ کر استعمال کر لیا تھا۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نیلما دہشت گردوں کی ساتھی ہو سکتی ہے۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔

نیلما ابھی تک واپس نہیں آئی تھی---- اس کی واپسی بخشی کی آمد کے دو گھنٹے بعد ہوئی۔ یہ دو گھنٹے بخشی نے دو صدیوں کی طرح گزارے تھے۔ اس دوران اس نے اپنے خلاف پیش آمدہ قریباً" ہر امکان پر غور کر لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسز بخشی کو بھی اپنی پریشانی میں حصہ دار بنائے۔

"نیلما! دیکھو بیٹا! میں نے تم سے آج تک تمہاری ذاتی زندگی کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا لیکن اب معاملہ ایسا آن پڑا ہے کہ میں مجبوراً" تم سے کچھ باتیں جاننا چاہوں گا کیونکہ بات بہت دور نکل گئی ہے---- اس نے بڑے پر شفقت لہجے میں اپنی بگڑی ہوئی مغرب زدہ صاحبزادی کے سامنے تمہید باندھی۔

"ڈیڈی یہ آپ نے کیا لیکچر شروع کر دیا۔ جو بھی بات ہے آپ پوچھیں۔"

نیلما کے لئے واقعی یہ عجیب بات تھی کہ اس کا باپ اس کی ذاتی زندگی کے متعلق کوئی

سوال کرے۔

"تم بھارت کس کے ساتھ گئی تھی؟"

"کسی کے ساتھ نہیں----!" نیلما نے بے دھڑک جواب دیا۔

"کیا خورشید تمہارا ہم سفر نہیں تھا----؟" بخشی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے اسے باخبر کیا۔

"جی ہاں تھا لیکن ہم سفر ہونا اور بات ہے اور کسی کے ساتھ سفر کرنا اور بات!" نیلما نے بے باکی سے جواب دیا۔

"مجھے فلسفہ نہ پڑھاؤ بیٹی اور یہ بتاؤ کہ تم خورشید کے متعلق کیا کچھ جانتی ہو؟"

"اوہ ڈیڈی! یہ آپ آج کس طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ وہ میرا دوست ہے' اچھا دوست' شریف انسان اور بس----!" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس نہیں بیٹے بات اس سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ اسی شریف انسان کے ہاتھ ایک بھارتی ڈپلومیٹ کے خون سے بھی رنگے ہوئے ہیں اور وہ بھارتی انٹیلی جنس کی فائلوں میں ایک وحشت گرد کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"اوہ نو----!" نیلما کے لئے یہ چونکا دینے والی باتیں تھیں۔

"اوہ یس----!" اس کے باپ کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

"نہیں ڈیڈی میں آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ میرا دل نہیں مانتا' ایسا سیدھا سادا انسان کوئی دہشت گرد ہو گا۔ اگر اس کا ہاتھ ساٹھے کے قتل میں ثابت ہو جاتا تو یہاں کی پولیس اسے کبھی نہ چھوڑتی۔ کم از کم یہ لوگ ہم ہندوستانیوں سے زیادہ لائق اور ایماندار ہیں۔ رہی بھارتی انٹیلی جنس کی فائلوں والی بات تو یہ ضروری نہیں کہ ان کا ہر اندازہ صحیح ثابت ہو۔ یوں بھی تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں حکومتی حلقوں سے اختلاف رائے رکھنے والے یا انسانی آزادی کا نعرہ لگانے والوں کو وہاں کی انٹیلی جنس عموماً" باغی ہی سمجھا کرتی ہے۔ یہ الگ بات کہ پھر یہی باغی اور دہشت گرد حاکم بن جاتے ہیں اور اپنے محکوموں کو انہی القابات سے نوازنے لگتے ہیں----!" نیلما ابھی کچھ اور کہتی لیکن بخشی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو گویا بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"معلوم نہیں آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔" نیلما نے لاپرواہی سے کہا۔

"بیٹی مجھے صرف اس بات کا اطمینان دلا دو کہ تم نے اس کے ساتھ کسی غلط کام میں

حصہ تو نہیں لیا؟" بخشی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اوہ ڈیڈی! آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ آئی تھنک یو آر ناٹ نارمل دس ٹائم!" اس کا پارہ چڑھ گیا اور اگلی کوئی بات سنے بغیر وہ باہر نکل آئی۔

بخشی کے لئے اپنی بیٹی کا یہ رویہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ عام حالات میں شاید وہ کبھی اپنی بیٹی سے ایسی باتیں پوچھنے کی ہمت نہ کرتا لیکن حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ کرنل مہتہ کی باتوں کی تصدیق کر لے۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی کا "معصومانہ استعمال" ہو چکا ہے اور اب "را" اسے آکٹوپس کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لے گی۔

ooo

جس روز بخشی کا علم ہوا کہ کرنل مہتہ اور گنگانی دونوں یہاں سے جا چکے ہیں تو اس نے قدرے سکھ کا سانس لیا۔ اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ شاید بات ابھی تک آگے نہیں بڑھی یا پھر وہ لوگ اس کی دیرینہ خدمات کے عوض اس کی بیٹی کی اس بھول کو نظرانداز کر دیں گے۔

لیکن ایسا وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔

کرنل مہتہ کے بھارتی ہائی کمیشن سے رخصت ہونے کے پانچویں روز ہی لندن سے ایک شخصیت اس کی ملاقات کو یہاں موجود تھی۔

"میرا نام پشپا ہے۔ میں بھارتی سفارت خانے میں ایڈمن آفیسر ہوں----" اس نے بخشی سے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"ایڈمن آفیسر" کا لفظ بخشی کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ بظاہر خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی کتنی خطرناک اور زہریلی ناگن کا روپ دھار سکتی ہے۔ یہاں ایڈمن آفیسر "را" کے خصوصی تربیت یافتہ گروپ کے لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر----!" بخشی نے اپنی سیکرٹری کو فون پر کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"مسز بخشی میں آپ سے نیلما کے متعلق کچھ بات کرنے آئی ہوں----!" اس نے بخشی کے چہرے پر ٹکٹکی لگاتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے بخشی کا دل زور سے دھڑکا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔

"کہیے----!"

"نیلما بھارت سرکار کو پٹھانکوٹ بم دھماکے کی تفتیش کے لئے درکار ہے۔"

پشپا کی پہلی بات ہی بم کی طرح بخشی کے سر پر پھٹی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" بخشی گھبرا سا گیا۔

"انگریزی آپ کے لئے اگر اجنبی زبان ہے تو ہم ہندی میں بات کر لیتے ہیں۔" پشپا کے ہونٹوں پر اب سفاک مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔

"کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گی؟"

"ضرور۔۔۔۔!" پشپا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرا۔

"نیلما نے کے ایل ایف کے دہشت گرد خورشید کے ساتھ بھارت میں قیام کیا ہے۔ خورشید ایک خاص مشن پر بھارت گیا تھا۔ اس نے نیلما کی مدد سے کشمیر میں دہشت گردوں کو منظم کیا' ان کے روابط پنجاب کے دہشت گردوں سے قائم کرائے اور بھارت سرکار کو شک ہے کہ سامبا کے نزدیک جو سپیشل فوجی ٹرین دہشت گردوں نے دھماکے سے اڑائی تھی اس میں بھی خورشید کا ہاتھ تھا۔ آپ کی بیٹی کی سفارش پر بھارتی انٹیلی جنس نے خورشید کو امرتسر دربار صاحب میں بحفاظت پہنچانے کا بندوبست بھی کیا جہاں اس نے بیرخالصہ کے گوروسیوک سنگھ سے ملاقات کی تھی.....!"

"لیکن اس سارے گھن چکر میں نیلما کو آپ کہاں سے گھسیٹ لائے۔۔۔۔؟" بخشی نے بڑی اذیت ناک مسکراہٹ اپنے منہ پر بظاہر نارمل نظر آنے کے لئے جمائی تھی۔

"آپ کو شاید میری باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔۔۔۔" پشپا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بخشی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مس پشپا! شاید آپ کا میرے ساتھ مکمل تعارف نہیں' میں گزشتہ پندرہ سال سے اس ملک میں....."

"بھارتی حکومت کے لئے کام کر رہے ہیں۔۔۔۔" پشپا نے اس کی بات درمیان سے کاٹ کر فقرہ خود ہی مکمل کر دیا۔۔۔۔ "ہمیں آپ کی خدمات کا اعتراف ہے مسٹر آنند بخشی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کے متعلق جو آخری رپورٹ کرنل مہتہ نے بھیجی' اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ایسا کچھ آپ کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر ہی کیا گیا حالانکہ اس بات کی کافی گنجائش ہے کہ آپ پر یہاں موجود دہشت گردوں کے ساتھ رابطہ کرنے اور بھارت سرکار کو ڈبل کراس کرنے کا شک کیا جائے۔۔۔۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔۔۔۔ اور اب بھی مسٹر بخشی بات آپ کی نہیں' آپ کی بیٹی نیلما کی ہو رہی ہے۔۔۔۔!" پشپا بدستور مسکرا رہی تھی۔

اس نوجوان سی چھوکری نے بخشی جیسے گرگ جہاں دیدہ کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ کچھ بھی ڈھنگ سے سوجھ نہیں رہا تھا۔

"مس پشپا پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس امکان پر ہی بات کرنے کو تیار نہیں کہ نیلما نے آپ کے عائد کردہ الزامات میں سے کوئی بھی کام جانتے اور بوجھتے ہوئے کیا ہو گا۔ اسے انتظامی میں استعمال کیا گیا ہے۔ شاید ان لوگوں کو میرے دہلی میں اعلیٰ افسروں سے روابط کا علم ہو گیا ہو گا اور انہوں نے اسی بنیاد پر اپنا منصوبہ ترتیب دے لیا۔۔۔۔!" بخشی نے رک رک کے نکلتے ہوئے کہا۔

"مسٹر بخشی! کیا آپ کے خیال میں مجرم کی معاونت کرنا خواہ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو' بجائے خود ایک جرم نہیں ہے؟ کیا دنیا کی کوئی بھی عدالت محض اس بنیاد پر تمہاری بیٹی کو بے قصور قرار دے دے گی کہ اس نے بقائمی ہوش و حواس محض عاشقی معشوقی کے چکر میں ایک فوجی ٹرین کو بم سے اڑانے میں معاونت کی اور ایک ایسے شخص کے لئے ڈھال بنی رہی جس نے کشمیر کی بغاوت کو از سر نو منظم کیا اور باغیوں کے رابطے پنجاب میں دہشت گردوں سے بھی قائم کر دیئے۔۔۔۔!" پشپا کا لہجہ پہلی مرتبہ سنجیدہ ہوا تھا۔

"مس پشپا وہ برطانوی شہری ہے۔ شاید آپ کو اس بات کا علم ہو گا۔۔۔۔" بخشی نے اپنی ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔

"اور شاید آپ کو بھی اس بات کا علم ہو گا کہ بھارت اور برطانیہ سرکار کے درمیان خطرناک مجرموں کے تبادلے کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اتنی بڑی دہشت گردی میں ملوث لڑکی کو برطانوی حکومت محض اس لئے بھارت سرکار کے حوالے نہ کرے کہ وہ ان کی شہری ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

پشپا کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ نیزے کی انی کی طرح بخشی کے دل میں اتر رہا تھا۔۔۔۔!

اس نے جوس کا لمبا گھونٹ اپنے گلے میں انڈیل کر اور سگار سلگا کر بظاہر اپنے خیالات سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"تعاون۔۔۔۔!" پشپا نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہ تو میں پہلے سے ہی کر رہا ہوں۔"

"اب اس کی نوعیت مختلف ہو گی۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"مسٹر بخشی آپ کو اپنی بیٹی نیلما کو دہشت گردوں میں باقاعدہ داخل ہو کر ہمارے لئے کام کرنے پر رضامند کرنا ہو گا۔" پشپا نے بڑی آسانی سے بہت مشکل بات کہہ دی۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" بخشی نے قریباً اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

----صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس بات سے اسے زبردست ذہنی دھچکا لگا ہے۔

"کوئی غلط بات نہیں کی میں نے مسٹر بخشی۔ معمول کی بات ہے۔ تعاون جاری رہے گا۔ صرف آپ کی بیٹی کو آپ کی جگہ لینی ہو گی۔ آپ بھی تو ہمارے لئے طویل عرصے سے یہی کچھ کر رہے ہیں' اس میں اچنبھے والی کیا بات ہے۔ یوں بھی اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

پشپا نے اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کا ذرہ برابر بھی اثر قبول نہیں کیا تھا۔

"اگر ایسا نہ ہو سکا تو؟" نہ چاہتے ہوئے بھی بخشی نے پوچھ لیا۔

"تو ہمیں مجبوراً" برطانیہ سے درخواست کر کے آپ کی بیٹی کو شامل تفتیش کرنے کے لئے دہلی لے جانا ہو گا۔"

پشپا نے فوراً" سے کہہ دیا۔

"آپ مجھے بلیک میل کر رہے ہیں---- مجھے آنند بخشی کو۔ جس نے اس ملک میں بھارتی سیکورٹی کا جال بچھا دیا۔ اسی کو آج ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔" بخشی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ کچھ بھی سمجھ لیں' یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے----!" پشپا نے نیا سگریٹ سلگایا۔

"مجھے کچھ مہلت ملنی چاہیے' یہ معمولی کام نہیں----!" بالآخر بخشی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"..... کتنی مہلت؟"

"ایک ہفتہ تو کم از کم.....!"

"نہیں مسٹر بخشی آپ کو اگلے تین روز میں یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ آپ کیا چاہتے ہیں' ایک ذلت آمیز موت یا تجدید تعلقات..... میں ویک اینڈ کے بعد آپ سے رابطہ کروں گی---- اچھا مجھے اب جانا ہو گا۔"

پشپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جس طرح ٹھک ٹھک کرتی وہ آئی تھی اسی طرح---- لوٹ گئی۔

ooo

بخشی بری طرح پھنس گیا تھا----!

ساری زندگی کی عیاشیوں اور بداعمالیوں کا حساب چکانے کا وقت آخر آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس موضوع پر اپنی بیٹی سے بات کرنے کی وہ کبھی ہمت نہیں کر سکتا---- لیکن اس کے ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا----! اس دنیا میں اگر اس کی کوئی کمزوری تھی تو یہی نیلما---- وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر نیلما پر آنچ بھی آ جاتی تو وہ خود جل کر راکھ ہو جاتا۔

بخشی کے لئے اگر مر کر بھی اس گناہ سے پراشچت کی کوئی راہ نکلتی تو وہ اپنی جان سے گزر جاتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی موت بھی کفارہ نہیں بن سکے گی۔ "را" کے درندے اس کی بیٹی کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

بخشی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟

آج دوسرا دن تھا اور سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی تھیں پھر اچانک ہی جیسے ایک کوندا لپکا۔ اس کے ذہن نے بڑی عجیب راہ سجھائی تھی۔ اس نے سوچا "کیوں نہ فرخ رشید کو اعتماد میں لیا جائے!" یہ فیصلہ اس نے انتہائی مجبوری کے عالم میں کیا تھا اور کوئی متبادل راہ نہ پانے پر ہی یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔ اس نے زندگی تجربات کی نذر کر دی تھی اور جانتا تھا کہ یہ "دہشت گرد مسلمان" بہرحال "امن پسند ہندو" سے زیادہ قابل اعتبار ثابت ہوتے ہیں۔

بخشی نے زندگی کو ہمیشہ دوسروں کی عینک سے دیکھا تھا۔

اور یہی تھا اس کی کامیابی کا راز----!

جب وہ اس ملک میں آیا تو ایک مزدور کی حیثیت سے آیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہزاروں لاکھوں ایشیائی باشندے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے یہاں آیا کرتے تھے۔

اس نے لندن کی کہر آلود راتوں میں برف سے ڈھکی سڑکوں پر زندگی کا بوجھ گھسیٹنے کا تجربہ حاصل کیا تھا۔

وہ جانتا تھا زندگی کو صرف اپنے نقطہ نظر سے سوچنے والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اس نے لندن میں قدم رکھنے کے بعد ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آگے نکلے گا اور پھر وہ

اتنی تیزی سے آگے نکلا کہ اب زندگی اس کے قدموں تلے مختصر ہونے لگی تھی۔

آج سے بیس سال پہلے اس کی ملاقات اچانک ہی ایک تقریب میں بھارتی ہائی کمیشن سے ہو گئی تھی۔

یہ ہائی کمیشن اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے بخشی کو امارت اور عزت حاصل کرنے کا ایک سستا سا نسخہ بتا دیا تھا اور جب سے یہ نسخہ اس کے ہاتھ لگا' اس نے کبھی اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔

ابتدا ہی سے وہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے ان مسلمان نوجوانوں کی جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا جن کو بھارتی حکومت اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھی۔ اس دوران اسے یہ ادراک حاصل ہوا کہ یہ دہشت گرد بہرحال اپنوں سے اچھے ہیں۔

○○○

اس نے خورشید سے بھی خود ملنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب قدرے مطمئن ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ ملازم نے کسی شانتا رام کشمیری کی آمد کا پیغام دیا۔ نووارد نے خود کو کشمیری شالوں کا تاجر بتا کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے بخشی نے اسے اندر بلا لیا۔

بخشی سر جھکائے شاید کسی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا جب شانتا رام کشمیری اندر داخل ہوا۔ اس نے آہٹ پر سر اٹھایا تو وہ چونک اٹھا۔ اس کے سامنے کریم خان کھڑا تھا۔

"تم----؟" اس نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں بخشی میں! مجھے افسوس ہے کہ مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا لیکن ایسا ضروری تھا۔ عین ممکن ہے تمہارے ان وفادار کتوں میں جو تمہارے دروازے کے باہر پہرا دے رہے ہیں' بھارتی انٹیلی جنس کا بھی کوئی زیادہ وفادار کتا موجود ہو۔ میری یہاں آمد کی خبر اگر سفارت خانے کو ہو گئی تو تمہارے لئے اور مسائل پیدا ہو سکتے تھے---- یہ احتیاط میں نے صرف تمہارے لئے اختیار کی تھی۔"

بخشی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا----!

اسے کریم خان کی کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی حالانکہ عام حالات میں شاید وہ اس کا وجود ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کرتا۔

"مسٹر بخشی کتنے دکھ کی بات ہے کہ ساری زندگی جن لوگوں کے لئے تم نے ہر غلط کام کیا اور اپنے ضمیر' ایمان اور غیرت کو داؤ پر لگائے رکھا۔ آج وہی لوگ تمہاری جان کو آ گئے ہیں۔ بخشی تم کیسے تاجر ہو۔ زندگی میں ایک بڑا سودا کیا اور وہ بھی اتنے گھاٹے کا۔" کریم

کی باتیں روز روشن کی طرح سچ دکھائی دے رہی تھیں۔

"لیکن میری اس مصیبت کا سبب بھی تو تم لوگ ہی ہو۔" اسے شاید کہنے کے لئے اور کچھ نہ سوجھا۔

یہ بات تو وہ جان ہی گیا تھا کہ کریم خان یہاں اس سے ہمدردی جتانے تو آیا نہیں' ظاہر ہے وہ بھی کسی چکر میں ہی آیا ہو گا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ ہماری وجہ سے ہوا ہے تو بھی باعث شرم ہے۔ ساری زندگی تم ہمارے خلاف ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ ہمیں اپنا دشمن بنائے رکھا اور آج اسی وجہ سے ہی تم ان کے نزدیک معتوب ہو گئے۔" کریم خان کے طنز کی کاٹ بڑی گہری تھی۔

"پشپا کی تمہارے ہاں آمد کوئی نیک شگون نہیں بخشی صاحب۔ تم بری طرح پھنس چکے ہو۔"

"کیا تم یہاں میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے آئے ہو؟ ایک تو میری بے گناہ بچی کو اغوا کروایا اور اب میرا تمسخر اڑا رہے ہو----!" بخشی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کر دی۔

"نہیں بخشی! میں تمہارا تمسخر اڑانے نہیں بلکہ احساس دلانے آیا ہوں کہ تم نے کتنے غلط دوستوں کا انتخاب کیا تھا اور ہاں جہاں تک تمہاری بیٹی کا معاملہ ہے' مطمئن رہنا کہ اس نے بھارت کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ جن کے لئے دنیا کا کوئی ضابطہ اخلاق کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا' انہوں نے تمہیں بلیک میل کرنے کے لئے جانے کیا کچھ گھڑ لیا ہو گا۔ اس کے باوجود اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہماری وجہ سے تمہاری بچی پر کوئی آنچ آئے تو یاد رکھنا ہمارے جیتے جی ایسا نہیں ہو گا۔ مسٹر بخشی! تم نے ہماری زندگی ہم سے دشمنی کی' آج میں تمہیں دوستی کی پیش کش کرنے آیا ہوں---- اپنے دوستوں کا تو تم نے اندازہ کر ہی لیا ہو گا۔"

کریم خان کی بات ابھی نامکمل ہی تھی کہ بخشی نے اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گھٹنوں کو اتنی تیزی سے چھوا کہ کریم خان دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کریم خان! میں اگلے بھی کسی جنم میں شاید تمہارے ان احسانات کا بدلہ نہ اتار سکوں۔ میری دیوی ماں نے مجھ پر رحم کھایا ہے جو تم یہاں چلے آئے ہو۔ حالانکہ میں خود ہی تم لوگوں کے پاس مدد کے لئے آنے کا فیصلہ کر چکا تھا---- کریم خان میرے گناہ ناقابل معافی ہیں لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میرے گناہوں کی سزا میری بچی کو ملے---- بھگوان کے

لئے میری بچی کو بچا لو۔ میں اس کے عوض منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں' خواہ مجھے اپنی جان ہی سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔۔۔۔!" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بخشی اسے پشپا کی آمد اور گفتگو کی کہانی سنا رہا تھا۔ کریم خان نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ پشپا کی پیش کش قبول کر لے۔ فی الوقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس نے بخشی کو اطمینان دلایا کہ برطانیہ میں کم از کم وہ لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس ذرا معاملات سے سوچ سمجھ کر عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے۔

دونوں نے اگلا لائحہ عمل طے کر لیا تھا اور اس کے بعد بخشی خاصا پرسکون ہو گیا تھا۔۔۔ اسے کم از کم یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ اب وہ اس لڑائی کا اکیلا فریق نہیں رہا۔

ooo

میجر شونندن گپتا ابھی جیپ سے اتر کر بمشکل اپنے دفتر کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اس نے اپنے حوالدار کو تیزی سے اس سمت آتے دیکھا۔

"سر ایک زبردست اطلاع ہے۔۔۔۔!" اس نے ایڑیاں بجاتے ہوئے کہا۔

"اندر بھیج دو۔۔۔۔!" کہتے ہوئے گپتا چق اٹھا کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مخبر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کمال کی بات تو یہ تھی کہ مخبر اس کے لئے اجنبی تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"چرن سنگھ' مہاراج۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"رتو وال کا۔"

"یہ ایڈریس کس نے بتایا ہے تمہیں؟"

"میں یہاں بہت عرصہ وکان کرتا رہا ہوں مہاراج جی۔ دو سال پہلے یہاں کیپٹن شرما صاحب کا دفتر تھا۔ میں تو یہی سمجھ کر آیا ہوں کہ اب بھی وہی یہاں ہوں گے۔ میں ان کے لئے کام کرتا رہا ہوں۔۔۔۔!" اس نے اپنا مکمل تعارف کروایا۔

واقعی دو سال پہلے یہاں کیپٹن شرما کی پوسٹنگ ہوئی تھی جو تین ماہ بعد ہی واپس آرمی میں چلا گیا تھا۔ گپتا نے سوچا یہ شخص شرما کا کوئی "سورس" رہا ہو گا۔

"کیا خبر ہے۔۔۔۔؟"

"جناب میں کوئی اس طرح کا مخبر ٹائپ آدمی نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا

ہوں۔ ہماری یہاں شہر میں بھی زمین ہے۔ معاملہ دشمنی کا ہے اس لئے اطلاع دے رہا ہوں۔" اس نے گپتا سے کہا۔

"شکریہ تمہارا' یوں بھی دیش کی سیوا کرنا ہم سب کا دھرم ہونا چاہیے۔۔۔۔!" گپتا نے بات کی وضاحت سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گاؤں میں مفرور کیپٹن امریک سنگھ کے آنے کی اطلاع ملی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔؟" واقعی یہ خبر گپتا کے لئے چونکا دینے والی تھی۔ "وہ ادھر سے ادھر کیسے آ گیا؟"

"میجر صاحب رتو وال سمرن سنگھ کا گاؤں ہے۔ آج رات اس نے اپنی ماں سے ملنے آنا ہے اور آج رات ہی امریک سنگھ اس سے ملنے اس کے گھر آئے گا۔ دونوں نے مل کر کام کرنا ہے۔"

"تمہیں اس بات کی خبر کہاں سے ملی؟" گپتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہماری سمرن سنگھ سے دشمنی ہے جناب اور اپنے دشمن کی پل پل کی خبر ہم رکھتے ہیں۔ میرے دو جوان بھائی اس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ میجر صاحب اب اس کے پاس جدید ہتھیار آ گئے ہیں۔ میں عام رائفل سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا' اسی لئے پولیس کی مدد لے رہا ہوں ورنہ آپ کو تکلیف ہی نہ دیتا۔" چرن سنگھ نے کہا۔

"اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر یہ کوئی چکر ہوا تو میں تمہارے جسم کی ایک ایک بوٹی الگ کر دوں گا۔۔۔۔!" گپتا کا لہجہ بڑا بھیانک تھا۔

"آپ مائی باپ ہیں مہاراج۔ جو چاہے کہہ لیں' جو بات تھی میں نے بتا دی۔"

"ٹھیک ہے تم ہماری حراست میں رہو گے۔ اگر تمہاری اطلاع صحیح نکلی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سرکار سے تمہیں بڑا انعام دلواؤں گا۔۔۔ دوسری صورت میں....." گپتا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ٹھیک ہے مائی باپ۔" چرن سنگھ نے کہا۔

گپتا نے گھنٹی بجا کر حوالدار کو اندر بلایا۔

"چرن سنگھ ہمارا مہمان رہے گا۔" اس نے حوالدار کی طرف دیکھے بغیر کہا اور وہ ایڑیاں بجا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ooo

تھوڑی دیر کے بعد چرن سنگھ میجر گپتا کو رتووال میں سمرن سنگھ کی حویلی کا نقشہ سمجھا رہا

تھا۔ اس نے دہشت گردوں کے ممکنہ ٹھکانے اور آمد کے راستے کی نشاندہی کر دی تھی۔

میجر گپتا نے اسے حوالدار کے حوالے کیا اور خود جیپ پر وہ سٹی کوتوالی کی طرف نکل گیا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور مخبر نے آج رات ہی ان لوگوں کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ گپتا اس موقعے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں خطرناک دہشت گردوں کی گرفتاری یا موت کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈالنے کے لئے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ڈی ایس پی شرما کے کمرے میں موجود تھا۔ ایک بڑے کاغذ پر لکیریں لگا کر اس نے شرما کی دہشت گردوں کے ٹھکانے اور اپنی پلاننگ سے آگاہ کرتے ہوئے ہوشیار رہنے کی تلقین کی۔ اس نے شرما کو بتایا کہ دونوں دہشت گرد بے حد خطرناک ہیں اور ان میں سے ایک تو تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہے۔ اس نے شرما سے کہا کہ اگر اس نے میدان مار لیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ایس پی بننے سے نہیں روک سکے گی اور سرکاری انعام اس کے علاوہ ملے گا----!

شرما کے پاس وقت بہت کم تھا۔ گپتا نے وہیں بیٹھ کر تھانے میں ہی اپنا آپریشن روم بنا لیا۔ اس نے عملاً" اس آپریشن کی کمان خود سنبھالی تھی اور شرما کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ جہاں بھی وہ کوئی مشکل محسوس کرے' گپتا سے ہدایت ضرور لے---- اس نے خاص طور سے کیپٹن امریک سنگھ سے خبردار رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس شخص پر قابو پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

شرما کی چونکہ یہاں نئی نئی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ابھی فوج والوں سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا جا رہا تھا' حالانکہ دل ہی دل میں وہ غصے سے کھول رہا تھا کہ اس کی ساری محنت کا پھل یہ کمبخت میجر کھا جائے گا۔

اس نے ایسے کئی دہشت گرد دیکھے تھے اور وہ جانتا تھا کہ محض اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے میجر گپتا ان لوگوں کی ہوا باندھ رہا ہے۔

شرما نے تین جیپیں اس آپریشن کے لئے تیار کی تھیں۔ اب جوانوں کو وقت سے پہلے گاؤں میں چھپانے کا وقت نہیں رہا تھا اور اس وقت اگر وہ لوگ نکلتے تو خواہ مخواہ کسی کو شک ہو جاتا۔

ooo

ان لوگوں نے رات ٹھیک بارہ بجے اچانک ایکشن کر کے دہشت گردوں پر قابو پانے کا

منصوبہ بنا لیا تھا۔

پرتو وال دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

گاؤں تک پہنچنے کے لئے نہر کا ایک چھوٹا سا لکڑی کا پل عبور کرنا پڑتا تھا جس کے بعد ہی بڑی جنگلی گھاس میں چھپ کر وہ لوگ باآسانی گاؤں تک پہنچ سکتے تھے۔

میجر گپتا نے اس جنگلی گھاس سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے اچانک گاؤں پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس نے شرما کو خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ وہ لوگ نہر سے بہت پہلے ہی جیپوں سے اتر جائیں اور اگلا سفر پیدل ہی طے کریں۔

تھانے میں تو شرما میجر گپتا کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا لیکن دل ہی دل میں اس نے نجانے اسے کیا کچھ کہہ ڈالا تھا۔ آخر اس کا دماغ تو خراب نہیں ہوا تھا کہ نہر سے میل ڈیڑھ میل پہلے ہی جیپوں سے اتر کر اپنے جوانوں کو پیدل گاؤں تک لے جائے۔

تھانے کے اندر ہی گپتا نے ان لوگوں کو سارا منصوبہ سمجھا دیا تھا---- جیپیں مطلوبہ جگہ پہنچ کر رک گئیں تو ڈی ایس پی شرما جیپ سے اتر کر باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اگلی جیپ کے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سر یہی جگہ ہے جہاں سے پیدل آگے جانا ہے۔"

"شٹ اپ! تم لوگ بھی اس گدھے فوجی کی باتوں میں آ گئے۔ جیپیں گاؤں تک جائیں گی۔ وہ تو سالا پاگل ہے۔ ہم یہاں جیپیں کھڑی کر جائیں اور پیچھے کوئی واردات ہو جائے تو اس کی فوج کو بلاتے رہیں گے۔" اس نے اگلی جیپ میں موجود تھانے دار کو ڈانٹ دیا۔

"جناب عالی! میں تو پہلے ہی حیران ہو رہا تھا کہ آپ نے یہ بات کیسے مان لی۔ بھلا جیپوں کے بغیر ہم ان لوگوں پر کیسے قابو پا سکتے ہیں۔ اگر ان کے پاس کوئی اور سواری ہوئی تو انہیں پکڑیں گے کیسے----؟" دوسری جیپ میں موجود ایس ایچ او نے چاپلوسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سب سے آگے بھگت رام والی جیپ جائے گی۔ اس کے پیچھے نصیب مل اور آخر میں میری جیپ۔ سب جوان پل کراس کرتے ہی گھاس میں پھیل جائیں گے' اس کے بعد کا ایکشن سابقہ پلان کے مطابق ہو گا۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ان لوگوں کو مزید ہدایات دیں اور جیپیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگیں۔

کچا راستہ اور شدید سردی کے موسم میں دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی

نہیں دے رہا تھا۔ صرف گاؤں کے باہر ٹیوب ویل پر ایک بلب جلتا نظر آ رہا تھا ورنہ تو سارا گاؤں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

○○○

تھانے دار بھگت رام کی جیپ نے طے شدہ منصوبے کے مطابق سب سے پہلے چھوٹا سا لکڑی کا پل عبور کیا۔ اس کے دوسرے کنارے پر بخیر و عافیت پہنچ جانے کے بعد نصیب مل کی جیپ نے بھی پل عبور کر لیا۔ ایک وقت میں اس پل سے دو لوگ ایک سے زیادہ جیپ گزارنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔

چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں شرما نے دونوں جیپوں کو جنگلی گھاس کے اندر داخل ہوتے دیکھا اور اپنے ڈرائیور کو جیپ آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

جیسے ہی شرما کی جیپ پل کے درمیان پہنچی' ایک زوردار دھماکے سے فضا لرز اٹھی۔

یہ ریموٹ بم کا دھماکہ تھا----!

جیپ کے اپنے سواروں سمیت پرخچے اڑ گئے تھے۔ بھگت رام اور نصیب مل کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہیں اب سمجھ آئی کہ میجر گپتا نے پیدل اس طرف جانے کی ہدایت کیوں کی تھی----!

اس سے پہلے کہ وہ لوگ صورت حال کو سمجھ پائیں' اچانک ہی ان کے سروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کی جیپوں پر دستی بموں کی بارش برسنے لگی تھی۔ پولیس کے جوانوں نے دیوانہ وار چیختے چلاتے ہوئے باہر چھلانگیں لگائیں تو کلاشنکوف کی گولیوں نے انہیں چاٹنا شروع کر دیا۔

موت کے خوف اور اچانک حملے نے ان کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گولیاں کس طرف سے آ رہی ہیں۔ صرف بھگت رام اتنا اندازہ کر پایا کہ فائرنگ بہت نزدیک سے کی جا رہی ہے۔

شاید حملہ آوروں نے یہاں گھاس میں پہلے ہی سے ان کے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ان لوگوں کے لئے سوائے زمین پر لیٹ کر دیوی ماتا کے حضور جان بخشی کی التجائیں کرنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔

حملہ آوروں نے آدھ گھنٹہ تک جی بھر کر پولیس کا شکار کھیلا----!

تھانے دار بھگت رام کے پاس ایسا کوئی ذریعہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنی مدد

کے لئے پیغام بھیج سکتا کیونکہ دستی بموں نے جیپوں کے سواروں سمیت پرخچے اڑا دیئے تھے اور خود بھگت رام کو اپنے نزدیک زمین میں سر دیئے صرف آٹھ دس زخمی ہی زندہ دکھائی دے رہے تھے۔ باقی لوگ ایک گولی فائر کئے بغیر اپنے بھیانک انجام کو پہنچ گئے تھے۔

پولیس کے جوان ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ فائرنگ کرنے والے کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ ان پر زمین آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ بھگت رام کو تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میجر گپتا نے پولیس سے کسی پرانی دشمنی کا بدلہ چکایا ہو۔"

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ نہر کے دوسرے کنارے پر موجود "ہوم گارڈز" نے فائرنگ کی آواز سن لی اور نزدیکی سی آر پی پوسٹ کو مطلع کر دیا جہاں سے سی آر پی کی ہنگامی مدد ان کے لئے روانہ ہو گئی۔

سی آر پی والوں نے اپنی مدد کا اعلان ہوائی فائرنگ سے کیا جس سے حملہ آور فرار ہو گئے اور بھگت رام اپنے آٹھ ساتھیوں سمیت زندہ بچ گیا----!

سی آر پی والے جب رتووال کے اس جنگلی گھاس والے علاقے میں پہنچے تو وہاں لاشوں' لاشوں اور تباہ شدہ جیپوں نے ان کا استقبال کیا۔

یہ سارا کارنامہ کیپٹن امریک سنگھ نے اپنے تین تربیت یافتہ ساتھیوں کے ساتھ انجام دیا تھا۔ اس نے اپنے منصوبے کی "ٹائمنگ" ایسی شاندار رکھی تھی کہ پولیس کا اس کے چنگل سے بچ نکلنا ناگزیر ہو چکا تھا۔

ان لوگوں نے ایک خاص وقت پر چرن سنگھ کے ذریعے میجر گپتا کو مطلع کیا اور اتنی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ پولیس کو ان کے خلاف کسی بڑی کارروائی کا موقع مل جاتا۔

امریک سنگھ جانتا تھا کہ میجر گپتا اس اطلاع پر بھڑک اٹھے گا اور وہ بہرصورت یہ کارنامہ اپنے سر لینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لئے ظاہر ہے وہ ڈی ایس پی شرما پر انحصار کرتا۔ کیپٹن امریک سنگھ نے پنجاب پولیس کے ہاتھ دیکھ رکھے تھے اور اسے اندازہ تھا کہ یہ کس حد تک جا سکتے ہیں۔

پنجاب پولیس سے کسی کارنامے کی توقع دیوانے کے خواب والی بات تھی اور میجر گپتا کا بھیانک انجام سمیت اس کے سامنے موجود تھا۔

کوتوالی میں اس وقت انسپکٹر بھگت رام اپنی خون آلود وردی اور اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ اسے پولیس پر ٹوٹنے والی قیامت کی کہانی سنا رہا تھا۔

ابھی تک اس کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے۔ کسی ایکشن میں پولیس کے بارہ آدمیوں کا مارے جانا اس کی زندگی کا پہلا بڑا واقعہ تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ ممکن کیسے ہو گیا۔

"سر! وہ بہت تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں۔ انہوں نے تو کسی فوج کی طرح ہی گھیر کر مار ڈالا۔ وہ تو....."

"شٹ اپ----!" گپتا نے اتنی زور سے چیخ کر اس کو ڈانٹا تھا کہ کمرے کے باہر موجود پولیس فورس کے جوانوں کے دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگے تھے۔

"بزدلو! تم پولیس آفیسر نہیں' کوئی گدھے کے بچے ہو۔ تم لوگوں نے اپنی بزدلی سے خطرناک دہشت گردوں کو اپنا کھیل رچا کر زندہ بچ جانے کا موقعہ دیا ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

گپتا پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا----!

لیکن----!

جلد ہی اس نے خود کو نارمل کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ انکوائری کمیشن اگر اس حادثے کی تحقیقات کے لئے بٹھا دیا گیا تو اس پر بھی غیر ذمہ داری کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ اس نے بھی تو اعلیٰ حکام کے علم میں لائے بغیر خود ہی اس کارنامے کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کے لئے پولیس کے بارہ جوان مروا ڈالے تھے۔

اس کے ذہن نے ایک ہی فیصلہ دیا تھا کہ اسے "ٹریپ" کیا گیا ہے اور دہشت گردوں نے اتنی دیدہ دلیری سے یہ کام کیا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

مقامی انٹیلی جنس آفیسر اور سیکورٹی انچارج کی حیثیت سے وہ فوراً" ہی اپنی جیپ پر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے پل کی تباہی سے اندازہ لگا لیا کہ ملزموں نے یہاں ریموٹ کے ذریعے دھماکہ کیا ہے۔ ڈی ایس پی شرما ان کا خصوصی نشانہ تھا۔ غالباً" ان لوگوں کا منصوبہ ہی یہی تھا کہ وہ پولیس کے آخری وہیکل کو دھماکے سے تباہ کریں گے اور باقیوں نے انہوں نے پہلے ہی سے گھات لگا رکھی تھی۔ یہ شرما کی بدقسمتی تھی کہ وہ آخری جیپ میں سوار تھا۔

ممکن ہے پہلی یا دوسری جیپ میں ہونے کی وجہ سے وہ بچ جاتا۔

ooo

گپتا وہاں زیادہ دیر نہیں رکا تھا اور اپنا کام مکمل کر کے رات بارہ بجے تک اپنے دفتر لوٹ آیا تھا۔ اس نے چرن سنگھ سے جو ابھی تک ان لوگوں کے قبضے میں تھا' اپنی ناکامی کا انتقام لینے کا بھیانک منصوبہ سوچ لیا تھا۔ گپتا نے ذہنی طور پر اسے گولی مار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس شخص نے اسے اپنے کیریئر کے سب سے بڑے دھوکے سے دوچار کیا تھا۔ اس نے صبح ہونے سے پہلے چرن سنگھ کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میجر گپتا کو اپنے کمرے میں داخل ہوئے ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ فون گھنٹی بجنے لگی۔ گپتا نے بڑی پھرتی سے ریسیور اٹھایا۔ اس کے خیال میں یہ کال اعلیٰ حکام کی طرف سے ہی ہو سکتی تھی۔

"ہیلو----!" دوسری طرف سے جواب ملنے پر گپتا کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہوئی----!

یہ تو وہی آواز تھی۔

"گپتا میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ رات کے اس پہر بڑی مشکل سے فون کرنے کا بندوبست کیا ہے---- میجر گپتا ہماری ایک امانت تمہارے پاس ہے اور تمہاری ایک امانت ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ اعلیٰ حکام تک چرن سنگھ کی خبر پہنچے تم اسے فوراً" رہا کر دو۔ امید ہے ابھی تک تم نے کسی سے مخبر کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کا تذکرہ نہیں کیا ہو گا کیونکہ تم اتنے بیوقوف نہیں۔ یوں بھی تم سے کوئی اس خبر کا "سورس" نہیں دریافت کرے گا۔

"اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو----؟" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"تم اتنے بیوقوف نہیں گپتا کہ کالیا کے انکشافات والی فلم اعلیٰ حکام تک پہنچنے کا خطرہ مول لے سکو---- گپتا تمہیں تو شوراج ہی مار ڈالے گا۔ اس کے علاوہ جو ذلت اٹھانی پڑے گی اس کا تم تصور نہیں کر سکتے---- تمہاری ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔ خودکشی کرنا شاید تم ابھی پسند نہ کرو----" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ٹھیک ہے میں چرن سنگھ کو چھوڑتا ہوں لیکن تمہیں فلم مجھے واپس کرنا ہو گی۔" گپتا آخری داؤ کھیلنا چاہا۔

"تم واقعی بیوقوف ہو میجر گپتا یا صرف اداکاری کر رہے ہو---- تم نے یہ اندازہ کیسے

لگا لیا کہ ہمارے پاس ان کی کاپیاں محفوظ نہیں ہو گی۔"

"جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

گپتا نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری طرف سے اس دھمکی کے ساتھ ٹیلی فون بند ہو گیا کہ:

"اگر صبح تک چرن سنگھ یہاں رہا تو وہ لوگ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔"

وہ سوچنے لگا۔ ایسے دہشت گردوں سے قسمت نے اس کا واسطہ ڈالا تھا کہ اس کے لئے واقعی خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ بچا تھا۔ اس نے انٹیلی جنس کے کئی خصوصی کورس پاس کئے تھے لیکن جس جال میں وہ اب اس وقت پھنس گیا تھا' اس سے نکلنے کے لئے کوئی تربیت اس کے کام نہیں آ رہی تھی۔

اس نے کالیا کے ذریعے جو کچھ کیا' وہ معمول کی بات تھی لیکن یہ تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کالیا ان لوگوں کے ہتھے چڑھ کر مرنے سے پہلے اس کی ذلت آمیز موت کی راہ ہموار کر جائے گا۔

آدھی رات گزرنے کو تھی جب اس نے چرن سنگھ کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اسے اسی وقت رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

"اس بے چارے نے تو صحیح اطلاع دی تھی لیکن نالائق پولیس والے کچھ کر ہی نہ سکے۔ جوان آئندہ بھی کوئی خبر ہو تو سیدھے یہیں آنا۔" اس نے چرن سنگھ اور اپنے حوالدار سے اکٹھے ہی خطاب کیا۔

حوالدار چرن سنگھ کو جیپ میں بٹھا کر اس کی مطلوبہ جگہ تک خود چھوڑ کر آیا تھا۔ اس تک اسے یہ علم نہیں تھا کہ پولیس والوں پر کیا گزری ہے۔

اب گپتا کی ایک ہی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو' وہ فوراً اپنا تبادلہ یہاں سے کروا لے۔ اس نے آج تک بلیک میل ہونے کے بعد جو جرم سرزد ہوا تھا اس پر گپتا کا ضمیر اسے زبردست ملامت کر رہا تھا۔

صبح تک ایک پل کے لئے بھی اس نے آنکھ نہیں جھپکی تھی۔

صبح اس نے اعلیٰ حکام کے ساتھ ایک اجلاس میں شرکت کی اور وہاں تمام واقعات کو اس انداز سے تصویر کشی کی کہ کسی کا خیال ہی دوسری طرف نہ جا سکا۔

گپتا نے اس تباہی کا ذمہ وار ڈی ایس پی شرما کو قرار دیا جس نے اس سے مشورے کے خلاف اپنی مرضی سے منصوبے میں تبدیلی کی اور اپنے نمبر بنانے کے چکر میں اتنا نقصا

رایا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے انسپکٹر بھگت رام وہاں موجود تھا جس کو ترقی اور م کا لالچ گپتا پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس نے بھگت رام کو دھمکی بھی دے ڈالی تھی کہ:

ر اس نے زیادہ چالاکی دکھائی تو "را" والے دوسری طرح بھی نمٹ لیں گے۔"

انکوائری مکمل ہونے کے دوسرے ہی روز میجر شونندن گپتا پندرہ روز کی رخصت لے کر بار اپنے گھر چلا گیا--- اس نے ذہنی طور پر اس علاقے میں واپس نہ آنے کا فیصلہ کر لیا

شاہین اور گرگس

وہ چاروں ہی کریم خان کے گھر اکٹھے پہنچے تھے---! سب سے پہلے خورشید نے ان کا
ارف کروایا۔ ان کے نام جانے پہچانے تھے لیکن آج پہلی مرتبہ کریم خان نے انہیں نزدیک
ے دیکھا تھا۔ باری باری وہ لوگ آپس میں بغلگیر ہو رہے تھے۔ خورشید کے ہمراہ آنے
الے تینوں نوجوان سری نگر سے لندن آئے تھے لیکن ان تینوں نے الگ الگ سفر کیا تھا۔
ن میں سے ایک پیرس کے راستے یہاں پہنچا تھا اور دوسرا اوسلو سے ہوتا ہوا آیا تھا۔

"سفر کیسا رہا بشیر---؟" کریم خان نے ان میں سے ایک نوجوان کو مخاطب کیا۔

"خدا کا شکر رہا۔ میں نے نیپال سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے
کہ میں ابھی تک بمبئی ہی میں ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہو۔ کیا خبر ہے ان لوگوں کی---؟" کریم خان نے اگلا
وال کیا۔

"مجھے کچھ شک ہوا تھا پہلے پہل لیکن اب سب دوست متفق ہیں کہ معاملات صحیح رخ
جا رہے ہیں۔" بشیر شاہ بولا۔

"تم نے کیا طریق کار اختیار کیا ہے؟" کریم خان کا اگلا سوال تھا۔

"لالہ ہم نے اپنا بندہ مکینک کے روپ میں اندر داخل کر دیا ہے۔ اس مرتبہ جس
وائی اڈے کا انتخاب ہم نے کیا ہے' ابھی کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی۔ چھوٹا ایئرپورٹ
ہے--- لیکن یہاں بوئنگ کی صرف دو پروازیں ہی آتی ہیں۔" ان میں سے ایک نے
ضاحت کی۔

"اگر مجھے اپنی رائے دینے کا حق ہے لالہ تو میں یہی کہوں گا کہ سوائے جان گنوانے کے
ور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" خورشید نے ان کی باتوں میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو خورشید لیکن اب شاید ہم پیچھے نہ ہٹ سکیں۔" دونوں میں سے ایک
نے کہا۔

"وحید! دیکھ لینا اس سے پہلے والا کوئی تجربہ کامیاب نہیں رہا۔ اگر تم لوگ حکومت پاکستان سے کوئی امید رکھتے ہو تو یہ تمہاری بیوقوفی ہے۔ ان حالات میں وہ کیسے اتنا بڑا خطرہ مول لیں گے۔ میں نہیں جان سکتا کہ بھارت میں رہ کر تم لوگ آخر حالات سے اتنے بے خبر کیوں رہتے ہو۔" کریم خان نے اسی نوجوان کو مخاطب کیا تھا۔

"لالہ! اس مرتبہ ہم نے اپنا پروگرام بالکل بدل دیا ہے۔ ان دنوں دہلی میں غیر وابستہ ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی ہو گی۔ ہم جہاز کو دہلی اتاریں گے اور تیسری دنیا کے سربراہوں کے سامنے بھارت کی تنگی جارحیت کو بے نقاب کریں گے۔ اس کے بعد جہاز کو اگلی منزل پر لے جائیں گے اور یہ پاکستان نہیں ہو گی----!" وحید نے ان کے خدشات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

"ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو اس کو بدلنا فی الوقت ممکن نہیں۔ اس طرح جوانوں کا مورال متاثر ہو گا اور میں نہیں چاہتا کہ اس سٹیج پر تحریک پھر بہت پیچھے چلی جائے۔ بشیر شاہ تم جانتے ہو تمہارا باپ میرا ساتھی تھا۔ ہم دونوں نے اکٹھے اس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس پودے کو ہزاروں شہیدوں کے خون سے آبیاری حاصل ہوئی ہے۔ اب اگر اس کی شاخوں نے سر نکالنا شروع کیا ہے تو محض جذبات کی رو میں بہہ کر ہم کوئی غلط کام کرنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے---- میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا دل اس منصوبے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں ہماری صفوں میں "را" کے لوگ گھس آئے ہیں اور "را" والے کس حد تک جا سکتے ہیں' اس کا اندازہ شاید اس ملک میں بیٹھ کر بھی تم لوگ نہ کر سکو۔" کریم خان نے انہیں بے لاگ رائے پیش کر دی۔

"لالہ! یہ فیصلہ سری نگر میں سب نے مل کر کیا ہے۔ اس مرحلے پر اگر آپ لوگوں نے مخالفت کی تو عین ممکن ہے کہ آپ کو اتحاد ہی سے نکلنا پڑے۔ ہم پر پہلے ہی الزام ہے کہ ہم نے تحریک کی رفتار کو جان بوجھ کر سست کر رکھا ہے۔" بشیر شاہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو ہم تیار ہیں۔ یہاں کا کام بہرحال منصوبے کے مطابق ہو گا----!" خورشید نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

چائے آ گئی تھی----!

کشمیری چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وحید نے خورشید اور کریم خان کے سامنے جہاز کے اغوا کے منصوبے کی تفصیلات پیش کیں۔ ان لوگوں نے اودھم پور کے ہوائی اڈے سے جہاز

اغوا کر کے دہلی لے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان دنوں تیسری دنیا کے بہت سے لیڈر غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس کے سلسلے میں جمع ہو رہے تھے۔ اغوا کا مقصد مسئلہ کشمیر کو اس کی پوری شدت کے ساتھ دنیا کے سامنے لانا تھا۔ یہ تجویز وحید نے سری نگر کے ایک خفیہ اجلاس میں رکھی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ادھم پور میں موجود ایئر انڈیا کے ایک مکینک نے ایک لاکھ روپے کے عوض ایک ہینڈ گرنیڈ اور پستول جہاز کے اندر پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

وحید نے کچھ اس انداز سے منصوبہ بیان کیا تھا کہ ان لوگوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ کچھ لوگ منصوبے کے حق میں تھے لیکن زیادہ تر اس کے خلاف تھے۔ محض اس ڈر سے مخالفت نہیں کی جا رہی تھی کہ کشمیر کی مختلف تنظیموں کے درمیان جو ایک اتحاد قائم ہوا ہے' اس کو زک نہ پہنچے۔

وحید کو بشیر شاہ اور امجد کے ساتھ اس منصوبے پر لندن کشمیری حریت پسند جماعتوں کی منظوری حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اور یہاں بھی صورت حال ایسی ہی تھی کہ لالہ کریم خان اور خورشید نے محض اس ڈر سے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی کہ ان لوگوں کا اتحاد برقرار رہے حالانکہ اس منصوبے میں کئی تکنیکی خامیاں وہ زیر بحث لا سکتے تھے۔

رات گئے وہ دو گروپوں میں گھر سے باہر آئے تھے۔ خورشید اور امجد ایک گاڑی میں چلے گئے جب کہ کریم خان نے وحید اور بشیر شاہ کو اپنی کار میں ہوٹل تک پہنچایا تھا۔ بشیر شاہ اور وحید ایک ہوٹل میں مقیم تھے اور امجد نے خورشید کے ایک دوست کے گھر قیام کیا ہوا تھا۔

○○○

"شکر ہے خدایا ان لوگوں کے ذہنوں پر جمی برف کچھ تو پگھلی۔ لندن کی سردی نے تو ان کی سوچیں بھی منجمد کر دی تھیں۔ بشیر شاہ! دنیا نے سچ اور جھوٹ کے اپنے اپنے پیمانے بنا رکھے ہیں۔ فلسطینیوں کی ہی مثال لے لو۔ آدھی دنیا انہیں حریت پسند اور آدھی دنیا انہیں دہشت گرد کہتی ہے۔ افغان مجاہدین کی مثال بھی تمہارے سامنے ہے۔ میرے خیال سے جب تک ہم دنیا کو نہیں بتائیں گے کہ بھارت نے کیا اندھیر' وادی میں مچا رکھا ہے' کل کے پاس فرصت ہے کہ ہمارے پمفلٹ پڑھ کر ہمارے حال پر آنسو بہاتا رہے۔"

کمرے میں پہنچ کر وحید نے اپنا اوور کوٹ اتار کر سامنے ہینگر پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

وحید حال ہی میں ان لوگوں میں شامل ہوا تھا۔ اپنی شمولیت کے محض تین ماہ بعد ہی یہ

منصوبہ ان کے سامنے رکھا تھا اور بشیر شاہ کا ماتھا اسی روز ٹھنکا تھا۔ اس کا دل مطمئن نہیں تھا لیکن چونکہ ابھی تک وہ وحید کے خلاف اپنی ذاتی تفتیش کے باوجود کوئی وجہ شک تلاش نہیں کر سکا تھا اس لئے وہ دل کی بات کبھی زبان پر نہ لا سکا۔

لیکن۔۔۔۔!

اس کا دل کبھی مطمئن نہ رہا تھا۔ وحید کا تعلق چونکہ دوسرے حریت پسند گروپ سے تھا اور بشیر شاہ کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے موجودہ اتحاد کو بہرصورت برقرار رکھنا ہو گا' خواہ اس کے لئے کچھ ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

وحید شاید باتھ روم میں چلا گیا تھا۔۔۔۔!

اچانک ہی بشیر شاہ کی چھٹی حس جاگی۔ کہیں یہ "را" کا آدمی تو نہیں؟ یہ سوال اس کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا لیکن آج اچانک ہی اس کو نجانے کیوں دل کی یہ بات سچی لگی۔

بشیر شاہ نے کسی لاشعوری عمل کے تحت ہی اپنے قدم لکڑی کی اس الماری کی طرف بڑھا دیئے جس میں لگے ہینگر پر وحید کا بڑا سا اوورکوٹ لٹکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تک وحید ٹائیلٹ میں موجود تھا۔ وہ گزشتہ دو روز سے پیٹ کی خرابی کے مرض میں مبتلا تھا۔ آج شاید اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔

بشیر شاہ کا ہاتھ کسی نادیدہ قوت نے کوٹ کی لمبی جیب میں داخل کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ لرز کر رہ گیا۔

ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر وہاں موجود تھا۔ بشیر شاہ کی انگلیوں نے اس سے منسلک ایک تار کا تعاقب جیب کے اندر سے بازو کی آستین تک کیا۔

"ٹریپ۔۔۔۔!" اس کا ذہن چیخا۔

اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر باہر نکالا اور اس میں موجود کیسٹ پھرتی سے نکال کر اپنی جیب میں منتقل کر لی۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا' اس نے نزدیکی میز پر دھری کیسٹوں میں سے ایک کیسٹ متبادل بنا کر ریکارڈر میں ڈال دی اور ٹیپ کو اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔

بشیر شاہ کا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر کسی بھی لمحے باہر نکل پڑنے کو بے چین ہوا جاتا تھا۔

وہ آتشدان کے سامنے دھری کرسی پر ڈھیر ہو کر لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جب وحید باہر آ گیا۔

"یار میری طبیعت تو کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر سے دوا لیتا ہوں۔" ں نے بشیر شاہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔۔۔۔!" بشیر شاہ نے بمشکل خود کو نارمل کیا۔

"سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ تم کہاں میرے ساتھ مارے مارے پھرتے پھرو گے۔ میں بلا ہی جاتا ہوں۔" وحید نے تجویز بھی خود ہی پیش کر دی۔

"ہاں یار! یوں بھی ہمیں اب الگ ہو جانا چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ میں ذرا وہمی قسم کا دی ہوں۔" بشیر شاہ بولا۔

"یار! تم لوگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی احتیاط پسند نہیں ہو گئے کیا؟" وحید نے قہقہہ لگایا۔

"یہ احتیاط پسندی ہی ہماری بقاء کا راز ہے دوست! ورنہ تو آستین کے سانپ ہمیں قدم قدم پر ڈسنے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

بشیر شاہ کی اس بات سے وحید کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا لیکن فوراً ہی وہ نارمل ہو گیا۔

"اچھا یار میں تو چلا' اب کل ملاقات ہو گی۔" وحید نے کہا۔

"خدا حافظ وحید!"

"خدا حافظ!"

وحید کوٹ اوڑھ کر باہر نکل گیا۔ پروگرام کے مطابق بھی ان دونوں کو آج ہوٹل سے الگ ہو جانا تھا۔

وحید نے اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھا لیا تھا۔ اس نے بشیر شاہ کو بتایا تھا کہ نئے ہوٹل میں شفٹ ہوتے ہی وہ اسے فون کر کے آگاہ کر دے گا۔

○○○

وحید کے کمرے سے باہر نکلتے ہی بشیر شاہ نے دروازہ لاک کر دیا اور وہاں رکھے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ چلا کر سننے لگا۔ جوں جوں کیسٹ چل رہی تھی اس کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ اس گفتگو کی ریکارڈنگ تھی جو لالہ کریم کے گھران کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے کچھ سوچا پھر کیسٹ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔

ہوٹل کی لابی سے اس نے کریم خان کو فون کیا اور اسے فوری طور پر ملاقات کرنے کے

لئے کہا۔ اشارتاً" اس نے صورت حال کی سنگینی کی نشاندہی کر دی تھی لیکن تفصیلات نہیں بتائی تھیں۔

کریم خان نے اسے فوراً" ہوٹل چھوڑ کر باہر آنے کی ہدایت کی تھی چونکہ بشیر شاہ اس علاقے سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ کریم خان نے اسے ہوٹل کے لان میں موجود کسی بھی ٹیکسی سے نزویکی سٹیشن پکاڈلی پر پہنچنے کو کہا تھا۔ اس نے بشیر شاہ کو سمجھا دیا تھا کہ پکاڈلی سٹیشن پر ٹیکسی والا اسے کہاں اتارے گا۔ وہاں نزویک ہی ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے بشیر شاہ کو انتظار کرنے کو کہا تھا۔

بشیر شاہ نے اٹیچی کیس میں بڑی افراتفری کے عالم میں اپنا سامان سمیٹا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہوٹل سے "چیک آؤٹ" کر گیا۔ ہوٹل کے پارکنگ میں ایک کونے پر موجود ٹیکسی کے ذریعے وہ پکاڈلی کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ قدرت کو شاید ان کی حالت پر رحم آ گیا ہے ورنہ وہ اس تائید غیبی سے محروم رہتے۔ اگر یہ کیسٹ "را" تک پہنچ جاتا تو جہاز اغوا ہوتا یا نہ ہوتا' وہ لوگ ان کی زندگی اجیرن کر دیتے---- بین الاقوامی سطح پر جو رسوائی ملتی' وہ اس سے سوا تھی۔

پکاڈلی سٹیشن کے ٹیکسی سٹینڈ پر اتر کر بشیر شاہ سیدھا انکوائری والی کھڑکی کی طرف گیا تھا۔ کریم خان کی نشان زدہ جگہ پر کھڑے ہوئے ابھی اسے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے جب اس نے سرخ پگڑی باندھے ایک نوجوان سکھ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

ooo

"ست سری اکال جی!" اس نے بشیر کے نزویک پہنچ کر فتح بلائی۔

"آداب عرض!" بشیر شاہ اور کیا کہتا۔

"ویر جی! آپ مجھے نہیں پہچانتے لیکن گھبرایئے نہیں۔ لالہ کریم نے مجھے آپ کو لینے کے لئے بھیجا ہے۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے یہ بات کہی تھی۔ اگر کوئی تیسرا شخص ان پر نظر رکھے ہوئے بھی ہوتا تو کبھی یہ اندازہ نہ کر پاتا کہ یہ لوگ آپس میں اجنبی ہیں اور پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔

بشیر شاہ کے چہرے سے شش و پنج عیاں تھا۔

"بے فکر رہیے۔ آپ بشیر شاہ ہی ہیں ناں اور اس وقت شیراٹن سے آ رہے ہیں۔ لالہ جی نے ہی آپ کو یہاں پہنچ کر انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔" سکھ نے اسے اطمینان دلانا چاہا۔

"لیکن وہ خود کیوں نہیں آئے؟" بشیر شاہ ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"وہی آئے ہیں ویر جی! آپ اگر میرے ساتھ نہیں چلیں گے تو وہ آ جائیں گے لیکن یہاں ان کا آنا ٹھیک نہیں۔"

سکھ کا گفتگو کرنے کا انداز بڑا مہذب تھا۔

"چلئے----!" بشیر شاہ نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان سکھ نے اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود اس کا اٹیچی کیس خود اٹھا لیا تھا۔ وہ وگ سٹیشن کے سامنے والی سڑک عبور کر کے قریباً" دس منٹ کے پیدل سفر کے بعد ایک گلی کے کونے پر کھڑی کار تک پہنچ گئے۔

کار کی اگلی سیٹ پر بشیر شاہ نے کریم خان کو ایک اور درمیانی عمر کے سکھ کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔

"اب تو ٹھیک ہے ناں شاہ جی!" سکھ نے اس کو مطمئن دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"شکریہ دوست!"

کریم خان نے بشیر شاہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کے ہمراہی نے اٹیچی کیس ڈکی میں رکھ دیا۔ اب ڈرائیونگ سیٹ اس نے خود سنبھالی تھی اور کریم خان بشیر شاہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کریم خان کے متفکر چہرے پر نظر ڈالی اور گردن جھکا لی۔ چونکہ کریم خان نے ابھی تک اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی اس لئے بشیر شاہ نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اس سفر کا اختتام کیپٹن ستنام سنگھ کے گھر پر ہوا۔ کریم خان نے اس درمیان اس سے دونوں سکھوں کا تعارف کروا دیا تھا۔ جو نوجوان اس کو لے کر آیا تھا وہ نشان سنگھ تھا۔

نشان سنگھ نے اس کا اٹیچی کیس دوبارہ اندر پہنچایا۔ پھر وہ گاڑی میں آگے بڑھ گیا۔ ستنام سنگھ کے گھر کے خصوصی کمرے میں خورشید اور امجد پہلے سے ان کے منتظر تھے۔ امجد بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"خیریت بشیر شاہ!" اس نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے دریافت کیا تھا۔

"بیٹھو بھائی بات کرتے ہیں۔ انشاء اللہ خیریت ہی رہے گی' حوصلہ رکھو۔"

خورشید نے امجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مطمئن کرنے کے انداز میں کہا۔

کمرے میں موجود ٹیپ ریکارڈر پر تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ اپنے سامنے کافی کے مگ

رکھے وہ کیسٹ سن رہے تھے جو بشیر شاہ نے وحید کے کوٹ کی جیب سے برآمد کیا تھا۔

ستنام سنگھ نے کیسٹ کے خاتمے پر وحید سے کیسٹ کی برآمدگی کے تمام واقعات دوبارہ پوچھے۔ دراصل وہ اس چھوٹے ٹیپ ریکارڈر کی ساخت کے متعلق سوالات کر کے کچھ اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

"کریم خان! صرف یہی ایک ثبوت تھا۔ میرے خیال سے ان لوگوں نے بگینگ نہیں کی۔ انہیں شاید وحید پر خاصا اعتماد تھا اور یہ تھا بھی صحیح۔ وہ تو کمبخت اپنا کام کر گیا تھا۔ یہ تو مہاراج سچے بادشاہ نے کرم کیا کہ بشیر شاہ کو اچانک یہ خیال آ گیا۔" ستنام نے کہا۔

"کپتان صاحب مجھے پہلے ہی اطمینان نہیں تھا۔ خدا جانے اس بات کی طرف میرا دھیان کیوں نہ گیا۔ خیر جو ہو گیا سو گیا۔ اب ہمیں آگے دیکھنا ہو گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" کریم خان بولا۔

"میں نے ابتدا ہی سے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ مجھے شروع ہی سے اس شخص پر شک تھا لیکن افسوس اس سے پہلے میں کوئی ثبوت تلاش نہ کر سکا اور ثبوت کے بغیر بات کرنے کا مطلب تھا کہ ہمارا اتحاد ایک مرتبہ پھر پارہ پارہ ہو جائے۔" بشیر شاہ نے کہا۔

"ہم گزشتہ چالیس سال مصلحتوں کا شکار رہے ہیں۔ بشیر شاہ! ہم نے اپنی غلامی کی رات کو اپنی انہی مصلحتوں اور کمزوریوں کے سبب اپنے اوپر اتنا طویل کیا ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کی ناراضی کا خطرہ مول لینے سے خوفزدہ رہے۔ ہم نے اپنی اپنی انا کا بھرم رکھنے کے لئے اپنی تاریخ کے سنہری اوراق سیاہ کر لئے۔ کاش ہم اتنے کمزور نہ ہوتے۔ کاش ہم اپنی صفوں میں گھس آنے والے منافقوں اور غداروں کو بہت پہلے ختم کر چکے ہوتے۔" امجد کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں دوست تم نے سچ کہا لیکن بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ اس سچ کا احساس اور ادراک رکھنے کے باوجود ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" بشیر شاہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"امجد تم ابھی واپس نہیں جاؤ گے۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا ہو گا۔ بشیر شاہ تم جس روٹ سے آئے ہو' اسی سے واپس بھارت پہنچو کیونکہ پاسپورٹ پر تمہاری شناخت مختلف ہے۔ سری نگر میں معاملات سنبھالو۔ ہم یہاں صورت حال کو سنبھالتے ہیں۔ آؤ ستنام سنگھ----!" کریم خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کریم خان اور ستنام سنگھ گھر سے باہر آ گئے۔ خورشید دونوں کے ساتھ وہیں رہا۔ ستنام

کی معیت میں وہ اس علاقے کی ایک اور گلی میں واقع مکان کے دروازے پر تھوڑی دیر دستک دے رہا تھا۔ دروازے کی جھری سے ایک آنکھ نے باہر کھڑے دونوں متفکر حریت پسندوں کو پہچانا اور دوسرے ہی لمحے ایک نوجوان لڑکی "فتح" بلاتی ہوئی ان کا استقبال کر رہی تھی۔

کریم خان نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے والد کا نام لے کر اس کے متعلق دریافت کیا۔

"پاپو گھر پر نہیں' وہ تو کسی کام سے ڈربی گئے ہیں۔" نوجوان سکھ لڑکی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے فون سیٹ کر دو!"

ooo

ستنام سنگھ کی ہدایت پر لڑکی انہیں لونگ روم میں لے آئی۔ اس نے فون کی تار سے ملک ایک چھوٹی سی ڈبیا کھولی اور اس میں ایک چھوٹا سا پرزہ نصب کر کے ان کے لئے چائے بنانے چلی گئی۔ اب اس فون کو دنیا کی کوئی انٹیلی جنس "ٹیگ" نہیں کر سکتی تھی۔ حریت پسندوں کے انجینئرز ساتھیوں نے یہ کارنامہ حال ہی میں انجام دیا تھا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ اور برٹش انٹیلی جنس کے ساتھ ان کی تکنیکی لڑائی کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری تھا وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے۔

فون کے ذریعے ستنام سنگھ نے بھارتی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں کسی کو ہدایات دیں جن کے مطابق اس شخص نے سری نگر میں کریم خان کے ساتھیوں کو حالات سے آگاہ کر کے ایک گھنٹے سے پہلے اپنے تمام ٹھکانے تبدیل کرنے اور روپوش ہو جانے کے لئے کہا تھا۔ اس فون کے ذریعے سری نگر کے جانبازوں کو یہ پیغام مل گیا تھا کہ جہاز اغوا کرنے کا منصوبہ "را" کے عیار ذہنوں نے انہیں دنیا کی نظروں میں رسوا کرنے کے لئے تیار کیا تھا اور وحید دراصل "را" کا "Mole" تھا جسے یہ اہم مشن دے کر ان میں داخل کیا گیا تھا۔ خدا کا شکر رہا کہ ان کی منصوبے کی ریکارڈنگ لندن میں "را" تک نہیں پہنچی ورنہ وہ لوگ لندن میں موجود حریت پسندوں کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ چھوڑتے اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھی ایک کو کچل کر رکھ دیتے۔

لدھیانہ میں موصول ہونے کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی یہ پیغام سری نگر کے متعلقہ افراد تک بذریعہ ٹیلی فون پہنچ چکا تھا اور "را" کے خونخوار شکاری کتوں کے ان تک پہنچنے سے پہلے وہ زیر زمین محفوظ ٹھکانوں پر منتقل ہو چکے تھے۔

ooo

وحید کا پشپا نے خود استقبال کیا تھا--- اس نے ہوٹل سے باہر آکر فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ہمیشہ کی طرح پشپا نے اس مرتبہ بھی اپنے جسم کا سارا بوجھ وحید پر منتقل کرتے ہوئے خاصی گرمجوشی سے معانقہ کیا تھا۔ پشپا کار خود چلا رہی تھی۔ وحید نے کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کیسٹ سمیت اس تک منتقل کیا تھا۔

"کیسا رہا---؟" پشپا نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔

"ایک دم شاندار مس--- ایک دم شاندار!" وحید اپنی کامیابی کا مژدہ سنا رہا تھا۔

"ونڈر فل!"

پشپا نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک کیسٹ شاپ کے سامنے روکی کیونکہ وحید پیٹ کی خرابی کی شکایت دو تین مرتبہ کر چکا تھا۔ یہاں موجود ایک ہندو کیسٹ نے اسے پہچان کر نمسکار کیا۔ پشپا نے اپنے "مہمان دوست" کی تکالیف اسے بتائیں اور تھوڑی ہی دیر بعد دوائی تیار ہو کر ان کے پاس پہنچ گئی۔

دوائی لے کر پشپا خود اسے نزدیکی ہوٹل تک لائی تھی۔ ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں اس نے ایک لفافہ اپنے پرس سے نکال کر کار میں وحید کے ساتھ ایک بیہودہ حرکت کرنے کے بعد اسے تھما دیا۔ اس لفافے میں دو ہزار پاؤنڈ موجود تھے۔

"کمرہ نمبر ۱۷ تمہارے نام ریزرو ہے۔ ہوٹل کا بل ہم خود دیں گے۔ تم سے کوئی بل طلب نہیں کرے گا۔ جتنے دن چاہو یہاں عیش کرو۔ تمہاری ساتھی تمہارا خیال رکھنے کے لئے تھوڑی دیر بعد پہنچ رہی ہے۔" پشپا نے اسے رخصت ہونے سے پہلے سرکاری لے کر آگاہ کیا۔

وحید کو ہوٹل چھوڑ کر وہ برق رفتاری سے کار چلاتی بھارتی سفارت خانے تک پہنچی تھی جہاں ایک کمرے میں کرنل واڈیا بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ کرنل واڈیا یوں تو یہاں سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا لیکن سفارت خانے کے لوگ جانتے تھے کہ سفیر کو بھی اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ واڈیا کو یہاں کرنل مہتہ کی جگہ سنبھالنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کرنل واڈیا اور پشپا ریکارڈر پلیئر کے سامنے بیٹھے تھے۔ پشپا نے کیسٹ پلیئر میں داخل کی اور سوئچ آن کر دیا۔ بشیر شاہ نے جو کیسٹ وہاں رکھ دی تھی وہ کسی پاکستانی گلوکارہ کے گانوں پر مشتمل تھا۔ ریکارڈر پلیئر سے

جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا

آواز بلند ہو رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے کرنل نے کیسٹ پلیئر آف کر دیا۔ پشپا نے دو تین مرتبہ آگے پیچھے کر کے کیسٹ سنا لیکن سوائے گانوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ کرنل واڈیا نے غصے سے کھولتے ہوئے اسے ایک سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں۔

ooo

پشپا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے' کدھر جائے؟

اگر زمین اس کے کہنے پر پھٹ سکتی تو کبھی کی اس میں سما جاتی۔ اس نے اپنی دانست میں بڑا معرکہ سر کیا تھا۔

آج تک کسی مہم میں ناکامی کا چہرہ اس نے نہیں دیکھا تھا--- لیکن بازی اس طرح پلٹ بھی جاتی ہے---! ایسا تلخ تجربہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا---!

"سر! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ شاید....." اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن واڈیا نے درمیان ہی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یا تو یہ شخص جس پر تم اتنا اعتماد کر رہی ہو بالکل گدھا ہے یا پھر مجھے تمہاری عقل پر شبہ کرنا ہو گا۔ پشپا رانی ایک بات کا خیال رکھنا اگر یہ کیس تمہاری وجہ سے بگڑ گیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں سزا سے نہیں بچا سکے گی۔ میں تو جاؤں گا ہی لیکن تم بھی بچ نہیں سکو گی۔ اف بھگوان! میں وہاں دہلی والوں کو کیا جواب دوں گا؟ کیا بتاؤں انہیں؟"

پائپ سلگا کر اس نے دھواں کمرے میں بکھیرا اور کچھ سوچنے لگا۔ پشپا اس دوران بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔

"تم جاؤ اور اس گدھے کو چیک کرو--- اور ہاں....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک طویل کش لے کر اس نے مسکراتے ہوئے پشپا کی طرف دیکھا اور کہا--- "اگر بل کراس ثابت ہو جائے تب بھی اگر نہ ہو تب بھی--- اب اسے ....."

اس سے آگے کچھ کہنے کی بجائے اس نے اپنے ہاتھ کو گردن پر چلا کر ایک مخصوص اشارہ کیا۔

پشپا تو لرز کر ہی رہ گئی---!

"یہ کارتوس اب چل چکا ہے پشپا۔ اب کیا کرو گی اس کا--- ہاں....." اس نے پشپا کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"او کے سر----!" پشپا کو مسکرانے کے لئے خود پر بہت جبر کرنا پڑا۔

"اب تم جاؤ۔ وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں----!" کہہ کر واڈیا کمرے سے باہر نکل گیا۔

پشپا جس تیز رفتاری سے یہاں آئی تھی اسی رفتار سے اب واپس ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی اس نے ہوٹل سے کچھ دور ہی پارک کر دی تھی اور اب پیدل ہی اس طرف جا رہی تھی---- کمرہ نمبر۱۷ پر اس نے آہستگی سے دستک دی۔ دروازہ وحید نے خود ہی کھولا تھا۔

"را" کی فاحشہ اس کے لئے شراب کا جام تیار کر رہی تھی۔ وحید خود کو آسمان پر تیرتا محسوس کر رہا تھا جب اچانک یہ مصیبت نازل ہو گئی۔

پشپا کو یہاں آ کر احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی۔ یہ وقت معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے قطعاً" مناسب نہیں تھا۔

"خیریت مس----؟" وحید اسے اچانک یہاں دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"کچھ نہیں---- پھر سہی!" پشپا پر اس سے زیادہ گھبراہٹ طاری تھی۔

وحید اس کے ساتھ ہی ہوٹل کے دروازے تک آیا تھا۔ وہ بار بار اس کی اچانک آمد کا سبب دریافت کر رہا تھا لیکن پشپا نے اسے اصل واقعے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

"ایک کام آن پڑا تھا تم سے۔ صبح جلدی رخصت کر دینا' پھر ملاقات ہو گی۔" اس نے ہوٹل کے دروازے پر پہنچ کر وحید کو کمرے میں موجود لڑکی سے متعلق ہدایات دیتے ہوئے وحید کو مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔

ساری رات وحید "را" کی فاحشہ سے اپنا حق الخدمت وصول کرتا رہا۔ صبح اس نے بادل نخواستہ ہی اسے رخصت کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق پشپا وہاں پہنچ گئی۔ اس مرتبہ کسی نے پشپا کو وحید کے کمرے کی طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وحید کو احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سانحہ گزر گیا ہے۔ وہ وحید سے کریم خان کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات دریافت کرتی رہی۔

"آپ کے لئے کافی منگواؤں؟" وحید نے اس سے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی! میں تو اکثر چائے اپنے ساتھ ہی لے کر چلتی ہوں۔ بھارتی چائے جیسا مزہ مجھے تو یہاں ابھی تک نہیں مل سکا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے نزدیک دھری ہوئی چھوٹی سی فلاسک کی طرف اشارہ کیا۔

"واقعی مجھے بھی اپنے دیش کی چائے جیسا مزہ نہیں مل سکا۔" وحید نے اس کی ہاں میں

ملاتے ہوئے دانت نکال دیئے۔

"تم سگریٹ کون سا پیتے ہو؟" پشپا نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

"جو بھی مل جائے۔ اس وقت تو یہ پی رہا ہوں۔" اس نے اپنے سرہانے رکھی ہوئی یٹ کی ڈبی دکھائی۔

"ذرا تکلیف کرو' میرے لئے نیچے جا کر کرسٹل کا پیکٹ لے آؤ۔ یہاں کمرے میں کسی کا آنا ٹھیک نہیں۔" اس نے بڑی اپنائیت سے وحید سے کہا۔

"او کے میڈم۔" وحید شاید اس کی خدمت گزاری کے لئے موقعہ ہی تلاش کر رہا تھا۔ جب وہ مطلوبہ سگریٹ لے کر واپس لوٹا تو پشپا اس کے لئے بھی اپنے پاس موجود ئی چائے کا ایک کپ تیار کر چکی تھی۔ ایک کپ اس نے اپنے لئے الگ سے بنا لیا تھا۔ اپنائیت سے اس نے چائے کا کپ وحید کو تھما دیا اور خود اس کے لائے ہوئے پیکٹ میں ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

ooo

"اپنے دیش کی چائے" کے پہلے گھونٹ نے ہی وحید کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ یوں لگا کہ جیسے کمرے میں موجود ہر شے نے گھومنا شروع کر دیا ہو۔ اپنی جگہ سے وہ ل ہی جنبش کر پایا تھا۔ جب اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ اس آرام دہ ا پر ڈھیر ہو گیا۔

پشپا نے ایک دو لمبے لمبے گھونٹ بھر کر اپنا کپ خالی کیا۔ پھر اس نے وحید کے ہاتھ گر جانے والا پیپر کپ بھی اٹھایا۔ چائے قالین میں جذب ہو چکی تھی۔ دونوں خالی کپ انے توڑ مروڑ کر اپنے بڑے سے بیگ میں رکھے۔ سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور جس طرح ا کی طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔ اس نے کمرے سے باہر آ کر ہاتھوں میں پہنے دستانے اپنے بیگ میں رکھ لئے تھے۔ یہ دستانے اس نے ایک لمحے کے اپنے ہاتھوں سے نہیں اتارے تھے۔

اپنے سر کو اس نے ایک سرخ رنگ کی اونی ٹوپی سے ڈھانپ لیا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ لگا لیا تھا اور گلے میں پہلے سے موجود مفلر کو اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ بہت غور سے پر بھی اس کی شکل دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔

کمرہ نمبر ۱۷ کے دروازے کے باہر اس نے "ڈونٹ ڈسٹرب" کا سٹکر لٹکا دیا تھا اور ہا دروازہ بھی لاک کرتی آئی تھی۔ یہاں اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جانے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہ اپنی کار کی طرف آئی جہاں کوئی ایشیائی فیملی کے لوگ اپنی ویڈیو فلم بنا رہے تھے۔ فلم بنانے والوں نے اس کی نقل و حرکت کار اور نمبر پلیٹ سمیت ایسے ہوشیاری سے سلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کی تھی کہ پشپا کے فرشتوں کو بھی اس کا گمان نہ گزرا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سفارت خانے میں موجود تھی۔

ooo

روز ہوٹل کا کمرہ نمبر ۱۷ دو روز سے بند تھا۔

ہوٹل کے منیجر نے ایک دن اور رات کو اخلاقاً" خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن اگلے روز دوپہر تک جب کمرے سے کسی نے کال تک نہ کی تو اسے فکر دامن گیر ہونے لگی۔ ہمت کر کے اس نے کمرے میں فون کیا اور خاصی دیر تک جب گھنٹی ہونے پر کسی نے جواب نہ دیا تو منیجر کا ماتھا ٹھنکا۔

اس نے احتیاطاً" نزدیکی پولیس سٹیشن کو فون کر کے اس صورت حال سے مطلع کیا اور پولیس والوں کی معیت میں کمرہ نمبر ۱۷ تک پہنچا جس کے باہر ابھی تک "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز" کا سٹکر لٹک رہا تھا۔ کافی دیر تک دستک دینے کے بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔

سامنے صوفے پر وحید کی لاش موجود تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ یہ اتنا کریہہ الصورت منظر تھا کہ منیجر نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ ایمبولینس منگوا کر پولیس نے لاش وہاں سے اٹھائی۔

سکاٹ لینڈ یارڈ نے دو گھنٹے ہی میں مرنے والے کی شناخت کا پتہ کر لیا تھا۔ اس کا نام وحید تھا اور آٹھ روز پہلے یہ شخص ایئر انڈیا کی فلائٹ سے لندن گٹ وگ ایئر پورٹ پر اترا تھا۔ اس کی آمدورفت کا کوئی باقاعدہ ریکارڈ تو تھا نہیں جب کہ یہ بات پولیس کے علم میں آ چکی تھی کہ وہ کسی اور ہوٹل سے یہاں منتقل ہوا تھا اور ایک ایشیائی خدوخال کی خاتون سے اس سے ملاقات کی تھی۔ متوفی نے رات جس عورت کے ساتھ بسر کی تھی اس کو تلاش کئے بغیر اس کی موت کے اسباب کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اسے سانپ کے الاثر زہر کے ذریعے موت کی نیند سلایا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کی خبروں میں برطانیہ کے مختلف ٹی وی چینل اس بھارتی کی پراسرار موت کی خبریں نشر کر رہے تھے۔ کریم خان' خورشید' امجد اور بشیر شاہ نے خبر اکٹھے ہی سنی تھی۔ امجد اور بشیر شاہ اس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ انہوں نے سفر اکٹھے

کیا۔

"ٹھیک ہے تم کل ہی مال مالکان تک پہنچا دو۔" کریم خان نے خورشید کی طرف معنی خیز راہٹ اچھالی۔

جیسے ہی کیسٹ ان تک پہنچی تھی اس نے خورشید کو وحید سے چپکا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا "را" کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ وہ ایسے شخص کو کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے جو ان کی جگ کا باعث بنے۔ یہ خورشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے جلد ہی اپنے "مقامی دوستوں" سے وحید کے ہوٹل کا پتہ لگا لیا تھا کیونکہ پاسپورٹ پر اس کا نام وحید ہی لکھا تھا اور وہ اسی نام سے کمرہ لے سکتا تھا۔

پشپا کو خورشید سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔۔۔۔!

اس کی پہلی آمد کو ہی اس نے وحید کے لئے برا شگون سمجھ لیا تھا۔ یوں تو اس سے پہلے اس نے متعدد مرتبہ ویڈیو کیمرے کا استعمال کیا تھا لیکن آج جس مہارات سے اس نے اسکے دو مرتبہ آنے جانے کے عمل کو فلمبند کیا تھا' اس پر وہ خود کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

ماسٹر پرنٹ سے ایک کاپی تیار کر کے ان لوگوں نے ماسٹر پرنٹ محفوظ کر لیا تھا۔ اس خبر کی اشاعت کے اگلے ہی روز وہ اپنے مشن پر نکل چکے تھے۔

ایک اور جھٹکا

سکاٹ لینڈ یارڈ کے مقامی آفس میں چیکنگ کے کئی مراحل سے گزرتی یہ ویڈیو فلم
وصول ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک خط میں فلم کے کرداروں کا تعارف تین روز پہلے لندن
کے روز ہوٹل میں ہونے والے قتل کے حوالے سے کروایا گیا تھا۔
سکاٹ لینڈ یارڈ اور وزارت خارجہ کے افسران فلم کو جگہ جگہ روک کر اس تسلی کے
ساتھ دیکھ رہے تھے کہ کہیں ہاتھ کی صفائی تو نہیں دکھائی گئی لیکن جلد ہی انہیں یقین ہو گیا
کہ فلم اصلی ہے۔ اس فلم میں بھارتی سفارت خانے کی ایڈمن آفیسر پشپا کو سفارت خانے
کی کار سے اترتے اور ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہاں پارکنگ کے لئے اس
وقت گاڑی کھڑی کی تھی۔ اس پارکنگ سٹینڈ پر نصب گھڑی کی سوئیاں ایک ایک پل کی کہانی
سنا رہی تھیں۔ فلم بنانے والے نے پشپا کو ہوٹل کے اندر داخل ہوتے اور برآمد ہوتے
وقت صفائی سے دکھایا تھا۔ اس دوران پارکنگ ایریا کے گرد مختلف کمپنیوں کے جو نیون سائن
لگے تھے ان پر چلنے والی الیکٹرونک گھڑیاں وقت کی مسلسل نشاندہی کرتی رہیں۔
پشپا کے اندر داخل ہونے اور واپسی پر چہرہ قریباً" چھپا کر باہر آنے کے منظر کو تو ایسی
مہارت اور نفاست سے فلمایا گیا تھا کہ شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی
تھی۔

فلم بھیجنے والوں نے منسلکہ خط میں لکھا تھا کہ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر بھارتی
سفارت خانے کے اس قتل میں ملوث ہونے کے ثبوت حاصل کئے ہیں۔ اگر اس معاملے کو
دبا دیا گیا تو یہی فلم قتل کی پس پردہ کہانی کے ساتھ دنیا کی تمام خبر رساں ایجنسیوں کے دفاتر میں
بھیج دی جائے گی۔ ان لوگوں نے خود کو برطانوی شہری ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ سکاٹ لینڈ
یارڈ کی مدد کے لئے ہی سب کچھ کر رہے ہیں۔
صورت حال ایسی پیچیدہ اور گھمبیر ہو گئی تھی کہ برطانوی حکومت کے لئے سوائے اس
کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا کہ وہ متعلقہ سفارت کار کو ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث

ہونے کی بنا پر ملک سے نکل جانے کا حکم دیں۔

اسی روز برطانوی دفتر خارجہ میں بھارتی سفیر کے ساتھ برطانوی حکام کی ایک اہم میٹنگ ہو رہی تھی جس میں بھارتی سفیر کو فلم دکھانے کے بعد صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا کر اس سے رائے طلب کی گئی تھی----!

بھارتی سفیر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اسے برطانوی وزیر خارجہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ ان کے ملک کے اقتدار اعلیٰ میں سراسر مداخلت ہے جو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ان لوگوں نے بھارتی سفیر کے ذریعے انڈیا گورنمنٹ کو یہ پیغام بھیج دیا تھا کہ اگر بھارت میں موجود برطانوی سفارت خانے کے ساتھ کوئی انتقامی کارروائی کی گئی تو حکومت برطانیہ کسی مزید سخت اقدام پر مجبور ہو جائے گی۔

اس کے ساتھ ہی بھارتی ہائی کمشنر کو سرکار برطانیہ کا ایک حکم تھما دیا گیا تھا جس کی رو سے ہائی کمیشن کے تھرڈ سیکرٹری کرنل واڈیا اور ایڈمن آفیسرز کو ناپسندیدہ عناصر قرار دیتے ہوئے اڑتالیس گھنٹے کے اندر برطانیہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

ooo

کرنل واڈیا کا نام فلم بھیجنے والوں کی خواہش پر شامل کیا گیا تھا۔ بھارتی حکومت کے لئے سوائے چپ چاپ ان احکامات پر عمل پیرا ہونے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصہ پہلے جس طرح درشن کمار کے ہاتھوں ان کی درگت بنی تھی' اب اگر کوئی ایسا سکینڈل اخبارات میں چھپ جاتا تو عین ممکن تھا کہ برطانوی دارالعوام میں اس کا بہت سخت نوٹس لیا جاتا۔ بین الاقوامی سطح پر جو رسوائی ہو چکی تھی اس کے بعد بھارتی حکومت کوئی مزید خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔

اپنی دانست میں فریقین نے بہت احتیاط برتی تھی اور برطانوی وزارت خارجہ کی طرف سے ایک مختصر سا پریس ریلیز ہوا تھا کہ دونوں سفارت کار ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے ہیں لیکن اخبارات بہت دور کی کوڑی لائے تھے اور ان کی طرف سے بھارتی سفارت کاروں کی بے دخلی کا سلسلہ ایک بھارتی باشندے کی لندن کے ایک ہوٹل میں موت سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس بات کا دونوں ممالک کو یقین تھا کہ یہ اخبارات کا اپنا اندازہ یا تحقیق تھی' فلم بنانے والوں نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔

کرنل واڈیا اور پشپا کی بھارت سے بے دخلی پر سب سے زیادہ خوشی بخشی کو ہوئی تھی

کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ فون کر کے کم از کم پشپا کو "مبارک باد" ضرور دے دے لیکن وہ چپکا ہو رہا۔

پشپا نے اس سے اگلے ہی ویک اینڈ پر ملاقات کر کے اس کا عندیہ دریافت کر لیا تھا اور جب اسے علم ہوا کہ بخشی کی بیٹی کشمیری حریت پسندوں کی جاسوسی کے لئے تیار ہے تو اس نے بخشی کے اس دانشورانہ فیصلے کو خاصا سراہا تھا۔

ooo

اگلی ملاقات سے پہلے ہی اس کو برطانیہ سے نکلنا پڑا تھا۔ بخشی سوچ رہا تھا کہ اس کے معاملات میں ابھی تک تو قدرت نے ایسے ہی حالات پیدا کئے رکھے ہیں کہ "را" کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اب نجانے یہ لوگ کون سی چال چلیں گے؟

ہندو ہونے اور ان لوگوں کے ساتھ ایک طویل رفاقت کے ناطے یہ بات تو اس کو اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی کہ یہ لوگ کبھی اس کی جان نہیں چھوڑیں گے اور جس دلدل میں اس نے آج سے پندرہ سال پہلے قدم رکھا تھا اس میں اب وہ اتنا گہرا دھنس چکا ہے کہ اس کے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچانک ہی اس کے ذہن نے بخشی کو نئی راہ سجھائی۔

اس نے سوچا کہ دشمن کے حملے کا انتظار کرتے رہنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ خود ہی اس پر حملہ آور ہو جائے۔ اس طرح ممکن ہے کہ جارحیت میں وہ اپنا دفاع زیادہ بہتر طریقے سے کر سکے۔

یہی سوچ کر اس نے کریم خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی---- اور دونوں اسی رات برمنگھم کے ایک ہوٹل میں ملاقات کر رہے تھے۔

"ان لوگوں کے کوئی اور چال چلنے سے پہلے میں پیش بندی کرنا چاہتا ہوں۔" آنند بخشی نے اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کریم خان سے کہا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے جس میں قدرے بہتری کے امکانات ہیں لیکن اس میں ایک خطرہ بھی پوشیدہ ہے----!" لالہ کریم نے کہا۔

"کیا----؟"

"بخشی! تم طویل عرصے سے ان لوگوں کے لئے کام کرتے رہے ہو اور ان کے اندر کی کئی باتیں تمہارے علم میں ہوں گی۔ اب تم ان پر وار کرنے جا رہے ہو۔ تلملائے ہوئے سانپ کے متعلق تم کچھ بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم جیسے کام کے آدمی سے ہاتھ دھونے کے

بعد وہ تمہارے خلاف کس حد تک جا سکتے ہیں۔" کریم خان نے اسے سمجھایا۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں کریم خان۔ میں ان لوگوں سے صاف کہہ دوں گا کہ اگر انہوں نے میری خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھایا میں تو مر جاؤں گا لیکن وہ بھی دنیا کے سامنے ننگے ہو جائیں گے کیونکہ میں نے اس وصیت کے ساتھ یہ راز محفوظ ہاتھوں تک پہنچا دیئے ہیں کہ میری موت کے متعلق اگر انہیں ذرا سا بھی گمان گزرے کہ اس میں "را" کا ہاتھ ہے تو وہ حقائق پریس میں دے دیں۔"

بخشی کی بات میں خاصا وزن تھا----!

"مجھے تمہاری ذہانت پر کوئی شک نہیں بخشی! لیکن دشمن کے متعلق کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ اس بات کا خیال رہے کہ تم اس طرح "را" کو چیلنج کرنے جا رہے ہو۔" کریم خان نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"دونوں صورتوں میں موت ہی میرا مقدر ہے کریم لالہ۔ ایک طرف اذیت ناک اور سسکا کر مارنے والی موت ہے اور دوسری طرف ایک پرسکون موت۔ میرے لئے کوئی تیسرا انتخاب ہی موجود نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ میں دوسرے راستے پر پہلے کو ترجیح دینے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔"

کریم خان نے آج پہلی مرتبہ بخشی کو اتنا مظلوم پایا تھا۔

"ٹھیک ہے کل تم مسٹر مائیکل سے مل لینا۔ وہ بڑا لائق وکیل ہے اور ہمارے ساتھ خاصی ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ میں آج اسے ایک کیس کے سلسلے میں مل رہا ہوں۔ میں بھی اس سے بات کر لوں گا۔" کریم خان نے کہا۔

بخشی قدرے مطمئن ہو کر لوٹا تھا۔

ooo

اگلے روز جب وہ شام کے بعد بیرسٹر مائیکل سے ملا تو اسے پہلی ہی ملاقات پر اندازہ ہو گیا کہ وہ صحیح جگہ پر پہنچا ہے۔

"میں تمہارا کیس اس طرح تیار کروں گا مسٹر بخشی----" بیرسٹر مائیکل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بیٹی کو کورٹ میں جا کر یہ بیان دینا ہو گا کہ وہ خورشید فاروق نامی برطانوی شہری کی دوست ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور مستقبل میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خورشید اور نیلما اکٹھے بھارت سیر کرنے گئے جہاں بخشی کے دوستوں کے وہ مہمان رہے ہیں۔ چونکہ ان کا شمار برمنگھم کے ممتاز شہریوں میں ہوتا ہے اور

ایک لمبے عرصے سے بھارتی ہائی کمیشن کے ہاں ہونے والی تقاریب میں بھی اہم کردار ادا رہا ہے۔ اس کے اسی اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے اب بھارتی انٹیلی جنس اسے اپنا آلہ بنانا چاہتی ہے۔" بیرسٹر مائیکل نے ایک لمحے کے لئے رک کر بخشی کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ وہ اپنے کلائنٹ کا ری ایکشن دیکھنا چاہتا تھا۔

بخشی پتھر کے مجسمے کی طرح چپ چاپ بیٹھا تھا----!

"مسٹر بخشی! تم کورٹ میں جا کر یہ کہو گے کہ بھارتی سفارت خانے کی حال ہی میں کینیا سے بے دخل ہونے والی ایڈمن آفیسر پشپا نے اس سے برمنگھم میں ملاقات کر کے اس سے کہا تھا کہ تم "را" کے ایجنٹ بن جاؤ۔ اس نے اپنا تعارف بھی "را" کی ایک آفیسر کے طور پر کروایا تھا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ تم مقامی کشمیریوں اور سکھوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھو اور اس سے بھارتی ہائی کمیشن کو آگاہ کرتے رہو۔

لیکن----!

مسٹر بخشی! تم نے ظاہر ہے اس گندے کھیل کو کھیلنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم اپنی پرامن سادی زندگی سے مطمئن ہو اور ایسے کسی دھندے میں الجھنا نہیں چاہتے۔ اس بات سے مشتعل ہو کر پشپا نے تمہیں دھمکی دی تھی کہ اگر تم ان لوگوں کے آلہ کار بننے کو تیار نہ ہوئے تو وہ تمہاری بیٹی اور اس کے دوست خورشید فاروق کو بھارت میں موجودگی کے دوران ہونے والے کسی دھماکے میں ملوث کر دیں گے کیونکہ خورشید فاروق کا تعلق ایک ایسی سیاسی جماعت سے ہے جو کشمیر میں استصواب رائے مانگتی ہے۔ اس لئے وہ بھارتی حکومت کی نظروں میں اچھا آدمی نہیں ہے۔"

اور پھر----!

خورشید نے بھارتی حکومت کے ویزے پر سفر کیا ہے۔ اگر وہ واقعی کوئی ایسا خطرناک دہشت گرد تھا تو اسے بھارتی حکومت نے اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت ہی کیوں دی؟ خیر---- یہ تو میرا مسئلہ ہے کہ میں کورٹ کو کیسے مطمئن کرتا ہوں۔ اب ہم اس بنیاد پر مقدمہ دائر کروانے جا رہے ہیں کہ تمہیں ان لوگوں کی طرف سے بلیک میلنگ کا خطرہ ہے۔ برطانوی شہری ہونے کے ناطے تمہارے حقوق شہریت کو بھی خطرات لاحق ہیں۔

برطانوی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک محفوظ اور خوشگوار زندگی بسر کرنے میں تمہاری ہر ممکن معاونت کرے!"

بیرسٹر مائیکل نے اپنی بات ختم کر لی تھی اور اب جواب طلب نظروں سے آنند بخشی کی

طرف دیکھ رہا تھا۔

"مسٹر مائیکل کیا نیلما کو خورشید کی منگیتر بتائے بغیر بات نہیں بنے گی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگ چاہے کتنے ہی ایڈوانس ہو جائیں لیکن اپنی روایات سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں بہرحال ایک ہندو ہوں اور میری بیٹی ایک ہندو کی بیٹی جب کہ وہ نوجوان خورشید وہ....."

"مسٹر بخشی! کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس مقدمے کی بنیاد پر ہم اپنے ہاتھوں سے کلہاڑا چلا کر اپنے ہی ہاتھ کاٹ ڈالیں؟ نو مسٹر بخشی---- ایسا قطعی ناممکن ہے۔ یہی تو ہمارے مقدمے کی بنیاد ہے جس پر ہم نے کیس دائر کرنا ہے۔ مسٹر بخشی! میں کوئی غلط بات کہہ کر اپنا کیریئر داؤ پر نہیں لگا سکتا---- مجھے افسوس ہے کہ دوسری صورت میں آپ کو کسی اور وکیل کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔"

بخشی مائیکل ایسے بیرسٹر کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بادل نخواستہ ہاں کر دی اور وکالت نامہ بھی سائن کر دیا۔ صرف ایک بات ہی خود کو کہہ کر مطمئن ہو سکتا تھا کہ: "اس ہندو معاشرے نے اور اس ہندو سرکار نے اس کو آج تک دیا ہی کیا ہے؟ ان لوگوں نے اس سے آج تک کچھ لیا ہی ہو گا۔"

پھر ایک آزاد معاشرے میں جہاں مختلف مذاہب کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے آئے روز شادیاں کرتے رہتے ہیں' کوئی اس پر کیوں انگلی اٹھائے گا؟ رہی بھارت میں موجود اس کے رشتہ داروں کی تو وہ بھارت جاتا ہی کب ہے----؟

اور اب وہ بھارت جانے کا خطرہ بھی کیسے مول لے سکتا ہے جب کہ وہ "را" کی نظروں میں تو مشکوک ہو چکا ہے۔"

گھر پہنچ کر اس نے نیلما کو تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد اس کی مرضی دریافت کی تھی اور پوچھا تھا کہ کیا وہ اس طرح کا بیان دینے پر تیار ہے؟

نیلما نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر ہاں کہہ دی تھی----!

بخشی نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی بھر کی چالوں کو تقدیر کی ایک چال نے ہی شہ مات دے دی ہے۔

خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دینے کے علاوہ اس کے پاس اور کیا باقی رہ گیا تھا۔

دوسرے روز کراؤن کورٹ میں نیلما بخشی اور آنند بخشی کی طرف سے بھارتی ہائی کمیشن

ے خلاف کیس دائر ہو چکا تھا۔ عدالت نے کارروائی شروع کرنے کے لئے بھارتی ہائی کمیشن ے جواب طلب کیا تھا۔ پندرہ روز بعد بھارتی ہائی کمیشن نے اپنی سرکار کی طرف سے عدالت ں بیان داخل کروایا کہ مسٹر آنند بخشی یا ان کی بیٹی نیلما بخشی یا خورشید فاروق نامی برطانوی ندے بھارتی حکومت کو کسی مقدمے میں درکار نہیں' نہ ہی ان کے خلاف کوئی کیس کسی رتی عدالت یا پولیس سٹیشن میں موجود ہے نہ ہی ان لوگوں سے بھارت سرکار کو مستقبل ں کوئی خطرات لاحق ہیں۔ پشپا نامی خاتون جو کچھ عرصہ پہلے تک بھارتی ہائی کمیشن میں ین آفیسر کے فرائض انجام دیتی رہی ہے' اس نے کبھی کسی سرکاری حیثیت میں مسٹر آنند شی سے ملاقات نہیں کی۔ نہ ہی بھارتی سفارت کاروں کو اس نوعیت کی ملاقاتوں کی اجازت ہے۔ چونکہ پشپا سفارت خانے کی سماجی تقریبات کی انچارج بھی تھیں' اس لئے ممکن ہے اروں بھارتی باشندوں کی طرح کبھی مسٹر آنند بخشی بھی اس سے ملے ہوں لیکن ان کا یہ ام بدنیتی پر مبنی ہے۔

اس بیان میں کہا گیا تھا کہ بھارت دشمن قوتیں دنیا کی بہت بڑی سیکولر جمہوری حکومت بین الاقوامی سطح پر بدنام کرنے کے لئے بھارت کے خلاف مہم چلا رہی ہیں۔ یہ مہم لندن ں بہت منظم طریقے سے چلائی جا رہی ہے جس میں بھارت کے ایک ہمسایہ ملک کا سفارت انہ اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

موجودہ مقدمہ اور اس سے پہلے اخبارات میں چھپنے والی کہانیاں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ سٹر آنند بخشی نے بھارت دشمن طاقتوں کے ہاتھ میں کھلونا بننے کے بعد ان کے ایجنٹ کا ردار ادا کرتے ہوئے یہ مقدمہ درج کروایا ہے جو سراسر بدنیتی پر مبنی ہے اور اس کا مقصد ب سیکولر جمہوری حکومت کو بدنام کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

عدالت سے درخواست کی گئی تھی کہ مدعا علیہان کے خلاف ایک جمہوری اور سیکولر ومت کو بدنام کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے اور ان کے اس الزام سے بھارت رکار کو بین الاقوامی سطح پر جو سبکی اٹھانا پڑی ہے' اس کے عوض مدعا علیہان سے دس کروڑ ڈ ہرجانہ طلب کیا جائے۔

سفارت خانے کی اس درخواست پر عدالت نے فریقین کے وکلا کے دلائل سننے کے بعد نا صوابدید پر یہ فیصلہ دیا تھا کہ اس مقدمے میں مدعی کی بدنیتی شامل نہیں' نہ ہی اس کا تمد کسی کی شہرت کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس لئے کورٹ اس مقدمے کو مدعی کے لئے کوئی ا تجویز کئے بغیر خارج کرتی ہے۔

ooo

سری نگر سٹی ایریا پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔

کبھی کبھی سڑک پر بکھری برف پر آرمی کی کوئی جیپ یا ٹرک اپنے ٹائروں کے نشان چھوڑتا وہاں سے گزرتا تو سناٹا لرز کر رہ جاتا۔ برفیلی اور یخ بستہ ہواؤں سے سانس منجمد ہوئے جاتے تھے۔ پہرہ دینے والے فوجیوں نے اپنے لمبے لمبے کوٹوں کے کالر کھڑے کئے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے وہ اپنی اپنی جگہ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ اپنے چہروں کو برفیلی ہوا سے بچائے رکھنے کے لئے انہوں نے اپنی ٹوپیاں ماتھے پر اتنی زیادہ جھکا رکھی تھیں کہ دور سے آنے والی کسی شے کو ڈھنگ سے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

رات ڈھل چکی تھی۔

رات کے گزرنے کا احساس انہیں مساجد کے لاؤڈ سپیکروں سے بلند ہونے والی اذان کی آوازوں نے دلایا تھا کیونکہ دھند اتنی زیادہ تھی کہ دن اور رات کی تمیز مشکل ہو رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دھند نے ہیڈ لائٹس کی روشنیاں بھی بے اثر کر دی تھیں اور آرمی کے مختلف کنوائے اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے تھے۔ انہیں فضا کے قدرے صاف ہونے کا انتظار تھا جس کے بعد ہی سڑکوں پر جمی برف پر گاڑیاں رینگ سکتی تھیں۔

عین ان لمحات میں جب سری نگر کے مکین گرم لحافوں میں منہ دیئے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے' سری نگر کے ایک قدیم محلے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ایک بوڑھی لیکن زندگی کی تمام تر شدت کے ساتھ روشن اور چمکدار آنکھ نے دروازے کے سوراخ سے جائزہ لیا اور دروازہ کھول دیا۔

"سلام چاچا!" نووارد نے کہا۔

"جیتے رہو----!" بوڑھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

دونوں جس کمرے میں پہنچے وہاں تین نوجوان پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے درمیان لالٹین جلا رکھی تھی۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے اور کمرے سے کوئلے سے اٹھنے والی گیس کا احساس نمایاں تھا۔

"امریک سنگھ ٹھیک پہنچ گئے ناں----؟" ان میں سے ایک نے نووارد پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"ہاں! مہاراج نے کرپا کر دی۔"

"ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔ دو دن پہلے کی اطلاع تھی۔ آج آخری دن ہم تمہارا انتظار

تے۔"

"کیا ہوا تھا----؟"

"سامان نہیں پہنچ رہا تھا۔ ادھر بانہال پر ان لوگوں نے بڑی سختی کی ہے۔ بس مہاراج ے بادشاہ نے مدد کرنی تھی۔ ایک سکھ ٹرک ڈرائیور کے ذریعے ہم لوگ بمشکل پہنچ پائے ۔ دو ٹکڑیوں میں بٹ کر پہنچے ہیں۔" امریک سنگھ نے وضاحت کی۔

"آئندہ کم از کم اطلاع پہنچا دیا کرو۔" اسی نوجوان نے کہا۔

"کیسے پہنچاتے۔ یہاں تو ٹیلی فون قطعاً" محفوظ نہیں---- ایک مرتبہ ایسا سوچا تھا---- ن پھر ارادہ بدل دیا۔ یوں بھی ابھی ایک چانس تو باقی تھا ہی۔" امریک سنگھ نے کہا۔

"تمہاری بات بچ نکلی اور وہ وحید کا بچہ---- وہ حرامی---- ان کا آدمی نکلا۔ اس نے ں مروا دیا تھا امریک سیہاں بس خدا نے ابھی کوئی اور کام لینا تھا کہ بچ گئے۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا اعظم کہ میرا تعارف ابھی ان سے نہ کروانا۔ تب تمہیں برا تو ہو گا لیکن بچ کڑوا ہونے کے باوجود بچ ہی ہوتا ہے۔" امریک سنگھ بولا۔

"ہاں بھائی واقعی تم نے صحیح کہا۔" اعظم نے جواب دیا۔

چاچا کشمیری جس نے امریک کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ اس مرتبہ کمرے میں آیا تو اس ایک سماوار اٹھا رکھا تھا جس سے خوشبودار بھاپ نکل رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پیالیوں ں سبز چائے انڈیل رہے تھے۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میرے خیال سے اس سے زیادہ مناسب وقت اور کوئی نہیں گا۔ دھند نے ان لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔" اعظم بولا۔

"ٹھیک ہے تم لوگ فوراً" تیار ہو جاؤ----!" کیپٹن امریک سنگھ نے کہا۔

وہاں موجود ہر نوجوان باری باری چاچا کشمیری کے ساتھ دوسرے کمرے میں جاتا اور ب لوٹتا تو اس کے بدن پر بھارتی فوج کی وردی موجود ہوتی۔ امریک سنگھ نے میجر کا روپ ار لیا تھا۔

آج ایک طویل مدت کے بعد جب یہ وردی دوبارہ اس نے اپنے بدن پر سجائی تو ایک ب سے احساس بے چارگی نے اسے جکڑ لیا۔

اس کا دل ایک لمحے کو بھی یہ سوانگ رچانے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اس نا سے گھن آتی تھی لیکن وہ مجبور تھا----!

نفرت کا وہ الاؤ جس کو اس نے اپنے اندر دبا رکھا تھا' جیسے ایک دم سے پھٹ پڑا۔ اس کا

جی چاہا کہ ابھی باہر نکلے اور راستے میں نظر آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ کبھی کبھی اس پر ایسی دیوانگی کا دورہ پڑتا تھا کہ وہ گھبرا اٹھتا۔۔۔۔!

دشمن کی کمینگی نے اس کے اندر انتقام کی ایسی آگ بھڑکا دی تھی کہ اب شاید اس کا لہو ہی اس آگ کو بجھا پاتا۔

مکان سے وہ ایک ایک کر کے باہر آ رہے تھے۔

مساجد میں اذانیں ہو چکی تھیں لیکن دور دور تک سوائے گہری دھند کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مشن کے لئے اسی وقت کا انتخاب کیا تھا اور اگلی ساری پلاننگ اسی حساب سے کی تھی۔

سب سے آگے اعظم چل رہا تھا جس نے حوالدار کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ امریک اور باقی تینوں اس کے تعاقب میں آ رہے تھے۔ انہوں نے بھارتی فوج کے زیر استعمال رہنے والی رائفلیں اپنے کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ اعظم کی کمر کے پیچھے بندھے ہوئے بیگ میں ڈیٹونیٹر موجود تھے۔ دوسرے ساتھیوں کے پاس خود ساختہ بم تھے جنہیں انہوں نے انتہائی ناگزیر حالات میں امریک کی ہدایت کے مطابق استعمال کرنا تھا۔

ان کے سفر کا اختتام پندرہ بیس منٹ بعد ہو گیا۔ اس درمیان راستے میں ان سے فوج کی ایک پٹرول پارٹی ٹکرائی لیکن دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ ہلا کر دور ہی سے "جے ہند" کہہ دیا تھا۔

کہر آلود موسم نے دوسری طرف سے آنے والوں کو راستہ کاٹ کر ان کے نزدیک جانے سے روکے رکھا۔

رومن اکھاڑہ

جہاں پہنچ کر وہ رک گئے تھے وہ ایک پرانی بیرک نما بلڈنگ تھی جس کی طرف جانے والے راستے پر ایک لکڑی کا گیٹ لگا ہوا تھا جس سے منسلک برآمدے میں انہیں ایک نیم روشن بلب کی روشنی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

امریک نے وہیں رک کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں مخصوص پوزیشنوں کی طرف روانہ کیا اور وہ خود اعظم کے ساتھ چھوٹا سا چکر کاٹ کر اس عمارت کی پشت پر آ گیا۔ یہ محفوظ جگہ پہنچتے ہی اعظم نے بیگ اتار کر زمین پر رکھ دیا۔

رگوں میں خون جما دینے والی اس سردی میں جب عام لوگوں کے لئے جسم کو جنبش دینا دشوار تھا، اعظم اور امریک کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ انہوں نے عمارت کے گرداگرد اتنی پھرتی سے ڈائنامیٹ لگایا تھا کہ عام حالات میں شاید پیشہ ور فوج بھی اتنی جلدی یہ کچھ نہ کر پاتی۔

کام ختم ہوتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مخصوص اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ اعظم اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ گیا۔ جب کہ امریک اپنے ہاتھ میں اس بارود کا کنٹرول لئے عمارت کی پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ جس عمارت میں داخل ہوئے وہ یہ بھارتی فوجی انٹیلی جنس کا تفتیشی مرکز تھا۔ یہاں سری نگر کے مختلف محلوں سے بے گناہ شہریوں کو اغوا کر کے لایا جاتا اور ان کی غیر قانونی تفتیش کی جاتی تھی۔

اس عمارت میں ایذا رسانی کے جدید آلات نصب تھے لیکن حوالات یہاں سے کچھ فاصلے پر چھوٹی پہاڑی کے پہلو میں بنائی گئی تھی جہاں سے ایک ایک گرفتار شدہ کو جیپ میں ڈال کر یہاں لایا جاتا اور کرنل مہرہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ کرنل مہرہ نے اپنے ساتھ کافی سا سٹاف رکھا ہوا تھا لیکن ان میں سے ہر شخص دوسرے سے بڑھ کر اذیت پسند تھا۔

یہ لوگ یہاں لائے جانے والے بے گناہوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچانے کے نئے انداز اختیار کرتے تھے۔ اذیت اور درد سے تڑپتے مظلوموں کی چیخ پکار ان نفسیاتی

مریضوں کو عجیب سا سکون فراہم کرتی تھی۔ یہاں لائے جانے والے بے کسوں کے جسم سے تیز دھار آلات کے ذریعے گوشت اتار لینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ اپنی بہیمیت کی داستانوں کی وجہ سے اس جگہ کو کشمیری "رومن اکھاڑہ" کہا کرتے تھے۔

رومن اکھاڑے میں چند دن گزارنے کے بعد کوئی شخص بھی اپنا مکمل جسم سلامت لے کر باہر نہیں آتا تھا۔ کرنل مہرہ اور اس کے خونخوار کتے درندوں کی طرح زیر تفتیش پر جھپٹتے اور اس کے جسم سے بوٹیاں نوچ ڈالتے تھے۔ یہاں ایک دن زیر تفتیش رہنے کے بعد کوئی شخص اپنے قدموں پر چل کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ رات گئے جب ان وحشی درندوں سے ملزم کی جان چھوٹتی تو اسے فوجی ٹرک میں پھینک کر نزدیکی حوالات میں پہنچا دیا جاتا۔

اس رومن اکھاڑے سے ملحقہ شاندار بنگلے میں کرنل مہرہ کا قیام تھا اور آج کل اس علاقے کا کمانڈر بریگیڈیئر پنڈت بھی یہیں قیام پذیر تھا۔ عمارت کے گرد پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق چکر کاٹ کر وہ بنگلے تک پہنچ چکے تھے اور اب بنگلے کی چھوٹی سی دیوار پھاند کر اس میں داخل ہو گئے تھے۔ برآمدے میں موجود پہریدار برآمدے سے ملحقہ گارڈ روم میں دھکتے آتش دانوں کے سامنے بیٹھے تھے جب اچانک ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

اعظم اور اس کے ساتھی کی رائفل سے نکلی گولیوں نے انہیں پلٹ کر موت کے ان پیامبروں کی شکلیں دیکھنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ان سے نمٹتے ہی امریک اور اعظم پھرتی سے اس کاریڈور میں پہنچ گئے جس کے اطراف میں موجود کمروں میں بریگیڈیئر پنڈت اور کرنل مہرہ شراب شباب کے نشے میں دھت پڑے تھے۔ دونوں نے ایک ایک کمرہ سنبھالا تھا جب کہ ان کے ساتھیوں نے بنگلے کے اطراف میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں کیونکہ فائرنگ کی آواز نزدیکی حوالات تک پہنچ چکی تھی اور وہاں سے کسی بھی لمحے کمک آ سکتی تھی۔

○○○

کرنل مہرہ اور بریگیڈیئر پنڈت نے فائرنگ کی آواز ضرور سنی تھی لیکن شراب نے انہیں اتنا مدہوش کر رکھا تھا کہ اگر وہ سنبھلنا بھی چاہتے تو نہ سنبھل سکتے۔ دونوں کی ساتھی عورتیں تو اس منظر کی تاب ہی نہیں لا سکی تھیں اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئیں۔ کرنل مہرہ اور بریگیڈیئر پنڈت کو اعظم اور امریک نے بندوق کی نوک پر ان کے شب خوابی کے لباس سے باہر لے آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بریگیڈیئر پنڈت پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا جب اعظم نے کرنل مہرہ کو اس شکنجے میں جکڑ دیا جس میں وہ زیر تفتیش بے گناہوں کو جکڑ کر ان پر ستم کے

ہاڈ توڑا کرتا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے چیختے چلاتے کرنل مہرہ کے جسم پر بجلی کے وہ ننگے تار لپیٹ دیئے کرنل مہرہ بے گناہوں کے جسم کو جھٹکے دینے کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔

"کرنل مہرہ! تم نے آج تک نجانے کتنے بے گناہوں کو اذیتیں دے دے کر مارا ہے۔ اپنے ہر شکار پر بجلی کے کرنٹ کا حربہ ضرور آزماتے تھے۔ تمہیں تڑپتے ہوئے بے گناہوں چیخوں سے بہت تسکین ملتی ہے۔ آج تم بھی بجلی کے اس شاک کا مزا چکھو---- اور رنل مہرہ! تمہاری جان بھی اسی شکنجے میں نکلے گی جو تم نے خاص طور پر بے گناہوں کو نیں دینے کے لئے تیار کروایا تھا۔" اعظم کی آنکھوں سے خون چھلک رہا تھا۔

"تم لوگ بہت برا کر رہے ہو اپنے ساتھ۔ یاد رکھو تم یہاں سے بچ کر نہیں جا پاؤ گے' ے جاؤ گے۔ یہ علاقہ آرمی کے مکمل کنٹرول میں ہے۔" بریگیڈیئر پنڈت نے ڈوبتے ئے کرنل مہرہ کے لئے اس دھمکی کو تنکے کا سہارا بنانا چاہا۔

"اچھا! بلا لو اپنی آرمی کو---- بلا لو۔ یہ تو کتے کی موت مرنے جا رہا ہے۔" امریک نے اعظم کے بجائے نفرت سے جواب دیا۔

اس کے لہجے میں جانے ایسا کیا چھپا تھا کہ بریگیڈیئر پنڈت نے مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی کی۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اعظم نے بجلی کا سوئچ آن کر دیا تھا اور کرنل مہرہ دم توڑتے ے کی طرح ڈکارتے ہوئے بالآخر ڈھیر ہو گیا۔ یہ سب کچھ آناً" فاناً" ہو گیا تھا۔ بریگیڈیئر ت ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے اذیت لمحہ تھا جب وہ خود کو ایک بریگیڈ کا کمانڈر ہونے کے باوجود ایک بے بس قیدی سمجھ رہا

○○○

اچانک فائرنگ کی آوازوں نے ان کے قدموں اور بازوؤں میں بجلیاں بھر دی تھیں اور ا بریگیڈیئر پنڈت کو دھکے مارتے ہوئے اس طرف لے جا رہے تھے جہاں ایک اور ت تماشا ابھی پنڈت کا منتظر تھا۔

رومن اکھاڑے کی بیرکوں میں موجود جوان بڑی بددلی سے اس طرف آئے تھے۔ سردی ہڈیوں میں اتر رہی تھی لیکن حکم کی سرتابی وہ نہیں کر سکتے تھے۔ صبح کے اس پہر دھند شدید تھی کہ چار پانچ گز دور پر بھی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ حملہ آوروں نے

ایسے شاندار وقت کا انتخاب کیا تھا کہ اس سیکشن کا کمانڈر دل ہی دل میں انہیں متعدد مرتبہ داد دے چکا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے جوانوں کو کس فارمیشن میں لے کر چلے۔ وہ لوگ حفظ ماتقدم یا پھر حملہ آوروں کی پوزیشن اور تعداد جاننے کے لئے خواہ مخواہ اکھاڑے کی طرف اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

لیکن----!

فائرنگ کے جواب میں دوسری طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ حملہ آور ان کی حکمت عملی کا احساس کر چکے تھے اور انہوں نے ابھی تک جواب میں ایک گولی بھی فائر نہیں کی تھی۔

سیکشن کمانڈر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے جوانوں کو کس طرف فائرنگ کا حکم دے۔ یہ خوف اس کے ذہن میں زہریلے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا کہ وہ لوگ گھات میں چھپے حملہ آوروں کے نرغے میں پھنستے جا رہے ہیں۔ شاید وہ لوگ انہیں جال میں پھنسا کر مارنا چاہتے تھے۔

لیکن اس طرح اپنے بریگیڈیئر اور کرنل کو دشمن کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ رومن اکھاڑے کی تمام بتیاں گل تھیں۔ اگر روشن بھی ہوتیں تو ان کی روشنی اس گہری دھند میں کوئی خاص اثر نہ کر پاتی لیکن اب تو سامنے سوائے برفیلے اندھیرے کی دبیز چادر کے جو ان سب کی نظروں کے سامنے تن گئی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سیکشن کمانڈر کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا----!

اس نے اپنے جوانوں کو رومن اکھاڑے کے اندر داخل ہو کر پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا تھا۔ ان حالات میں وہ یہی کر سکتا تھا۔ یہاں کوئی سرچ لائٹ بھی موجود نہیں تھی اور آرمی کی وہیکلز کی روشنیاں سامنے کا منظر تو کیا عیاں کرتیں' خود ان لوگوں کی موت کی پیامبر بن جاتیں---- اس گہری دھند میں تو وہ دشمن کی نظروں سے قدرے محفوظ تھے۔ بصورت دیگر وہ خود ٹارگٹ بن جاتے۔

ooo

بریگیڈیئر پنڈت کو ان لوگوں نے لمبا فوجی کوٹ پہنا کر اپنے درمیان بٹھا لیا تھا۔ اگلی سیٹ پر امریک سنگھ اور اعظم بیٹھے تھے۔ جیپ کا سٹیئرنگ اعظم نے سنبھالا تھا۔

رومن اکھاڑے کا محافظ دستہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

"بریگیڈیئر! اب تم ایک اور تماشہ بھی دیکھ لو۔"

یہ کہتے ہوئے امریک سنگھ نے اپنے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول کے مختلف بٹن دبانے شروع کر دیئے۔

جیسے جیسے وہ مختلف بٹن دبا رہا تھا' عمارت کی دیواروں' برآمدوں اور کمروں میں نصب ڈائنامیٹ پھٹنے لگے۔

قیامت صغریٰ کا سماں تھا----!

بریگیڈیئر پنڈت بے بسی کے عالم میں اپنے جوانوں اور اسباب کی تباہی کا منظر دیکھتا رہا۔ جو جوان اس جہنم زار سے کسی طرح باہر نکل آئے تھے' وہ گھات لگائے حریت پسندوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔

سیکشن کمانڈر کے لئے سوائے چیخنے چلانے کے اور کچھ کرنے کو باقی نہیں بچا تھا۔ وہ اپنے جوانوں کو کبھی دائیں' کبھی بائیں' کبھی پیچھے اور کبھی آگے فائرنگ کا حکم دیتا رہا اور اس کے جوان ایک ایک کر کے مرتے رہے۔

رومن اکھاڑہ قدیم رومن تہذیب کی طرح کھنڈرات کا ڈھیر بن چکا تھا۔ جب تک ہوائوں کی آواز پر اس علاقے میں موجود آرمی کے دوسرے یونٹ ان کی مدد کو پہنچتے' وہاں کچھ باقی نہیں بچا تھا---- ہر طرف تباہی تھی۔

ادھ جلی لاشیں----!

نیم مردہ زخمی----!

تباہ شدہ عمارت----!

اور اسی عمارت کے ایک کمرے میں دیدہ عبرت نگاہ تھی کرنل مہرو کی لاش! اس کا جسم بجلی کے کرنٹ سے نیلا پڑ چکا تھا اور جلد کئی جگہ سے جل کر پھٹ گئی تھی۔ آرمی انٹیلی جنس کے لئے اس واقعے کی واحد شہادت وہ دو نیم بیہوش فاحشائیں تھیں جن کے حواس ابھی تک ہوش میں نہیں آ رہے تھے۔

انہیں اس صورت حال نے اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ڈھنگ کی کوئی بات بھی ان کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ آرمی انٹیلی جنس کے لوگ ان دونوں کو اپنی جیپ میں بٹھا کر امید پر لے گئے تھے کہ شاید وہ حملہ آوروں میں سے کسی ایک کی نشاندہی کر سکیں۔

ooo

بریگیڈیئر پنڈت کو وہ لوگ جیپ میں ایک ذیلی سڑک کی طرف لے جا رہے تھے----! کالا کی دھند میں بھی انہوں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں اور بریگیڈیئر کو یہی

امید تھی کہ کسی بھی لمحے جیپ کسی گہری کھڈ میں گر پڑے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

یہ لوگ بہت ہوشیار اور اس علاقے کے ایک ایک انچ سے باخبر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اب پنڈت کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ جیپ ایک جگہ رک گئی' اسے پیدل چلنے کا حکم ملا۔ کسی نے اس کا ایک بازو تھام رکھا تھا اور بریگیڈیئر پنڈت اندھوں کی طرح چلتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے حساس کانوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جیپ اس سڑک پر آگے بڑھ گئی ہے۔ شاید وہ لوگ یہاں سے دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ پنڈت ان کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح بے بسی سے تخریب کاروں کے ہاتھوں اغوا ہو جانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس پیدل سفر کا اختتام قریباً" آدھ گھنٹے بعد ہوا۔ شاید وہ لگ کسی آبادی میں داخل ہوئے تھے۔ مختلف آوازوں نے اسے احساس دلایا کہ یہاں ان کے اور بھی ساتھی موجود ہیں کیونکہ اس جگہ کسی دوسرے ہاتھ کی گرفت اس نے اپنے بازو پر محسوس کی تھی۔ یہ گرفت کچھ زیادہ ہی سخت تھی لیکن بریگیڈیئر پنڈت احتجاج نہ کر سکا۔ بہرحال وہ پیشہ ور فوجی تھا۔

اب شاید سیڑھیاں آ گئی تھیں کیونکہ اسے رک رک کر چلنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ لوگ اتنے ہوشیار تھے کہ انہوں نے بریگیڈیئر کے سامنے اپنی کسی بات یا حرکت سے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کہاں ہے----؟ ابھی تک ان میں سے کسی نے سیڑھیوں کا نام تک نہیں لیا تھا۔

بریگیڈیئر پنڈت کو یہ احساس تو ہو چکا تھا کہ وہ کسی عمارت میں آ گیا ہے لیکن ہزار کان لگانے اور دماغ پر زور دینے کے باوجود وہ اس عمارت کی ساخت کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ شاید وہ لوگ اسے اس عمارت میں مسلسل گھما رہے تھے۔ پھر انہوں نے اچانک ہی اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا---- بریگیڈیئر پنڈت نے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ جان لیوا سردی اور مسلسل آنکھیں باندھ کر پیدل چلنے سے تو نجات ملی۔

اس نے خود کو کسی آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے محسوس کیا تھا۔ یہاں آ کر سردی کا احساس دم توڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرہ خاصا گرم تھا۔ شاید ہیٹر جل رہے تھے۔ اپنے بازوؤں سے ہاتھوں کی گرفت ہٹ جانے کے بعد اس نے قدرے سکون محسوس کیا تھا۔

اب اس نے دو ہاتھوں کو اپنے سر کے پیچھے آنکھوں پر بندھی پٹی کھولتے محسوس کیا۔ پٹی کھل گئی لیکن اس نے جان بوجھ کر آنکھیں نہ کھولیں۔ آہستہ آہستہ پھر اس نے آنکھیں

کھول دیں۔ کمرے میں : ب اور ہیٹر کی روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں لیکن بعد ہی وہ دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے سامنے پانچ آدمی موجود تھے۔ جن لوگوں کو اس نے رومن اکھاڑے میں دیکھا تھا' ان میں سے دو یہاں نظر آ رہے تھے۔ باقی تین شاید پہلے ہی سے یہاں موجود رہے ہوں گے۔

"خوش آمدید بریگیڈیئر پنڈت۔" ان میں سے ایک شخص نے جو عمر میں ان سب سے زیادہ تھا' اسے مخاطب کیا۔

"تم کون ہو؟"

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"کیا تم مجھے نہیں جانتے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں انڈین آرمی کا بریگیڈیئر کمانڈر ہوں؟ تم نے کتنے بھیانک جرم کا ارتکاب کیا ہے؟"

وہ جنونیوں کی طرح نجانے کیا کیا کہتا رہا لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس بے بسی نے اسے ابنارمل کر دیا ہے اور یہ بات اس کی شان مردانگی کے خلاف ہے کہ وہ ایک سینئر افسر ہوتے ہوئے حواس باختہ ہو جائے۔ اس نے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوتے ہی خود کو کنٹرول کر لیا۔

"شاید صدمے نے تمہارا دماغی توازن بگاڑ دیا ہے بریگیڈیئر----!" اس بزرگ نے پنڈت کو مخاطب کیا۔

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس مرتبہ پنڈت کا لہجہ قدرے پرسکون تھا۔

"یہ تمہارا درد سر نہیں پنڈت۔ یہ ہمارا اور تمہاری انڈین سرکار کا ہے۔ تم فی الوقت ہمارے مہمان ہو۔ ہمارا تعلق کشمیر فریڈم فائیٹرز تحریک سے ہے۔ تمہیں یرغمال بنا کر رکھا جائے گا۔ اگر تمہاری خدمات کا احساس کرتے ہوئے بھارت سرکار نے ہمارے مطالبات تسلیم کر لئے تو تم ایک ہفتے میں رہا ہو جاؤ گے بصورت دیگر تمہیں مرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری چوائس نہ ہمارے پاس ہے نہ تمہارے پاس۔ میں تمہیں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ ضرور کرنا' ہم لوگ حالت جنگ میں ہیں۔ تمام جنگی اصول لاگو ہوں گے لیکن یہاں سے تمہارا زندہ نکل جانا ہمارے لئے کتنا تباہ کن ثابت ہو گا' اس سے تم بخوبی آگاہ ہو۔ اس لئے ہم تمہیں زندہ نکل جانے کا موقعہ ہرگز نہیں دیں گے---- اور ہاں میں تمہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر ہمارا سودا طے نہ ہوا

تو تمہیں گولی مار دی جائے گی۔"

ooo

بریگیڈیئر پنڈت گردن جھکائے یہ سب کچھ سنتا رہا---!

اسے حالات کی سنگینی کا احساس بات کرنے والے کی سفاکی کی حد تک سنجیدہ لہجے سے ہوا تھا اور اس نے جان لیا تھا کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

"کیا تم لوگ مجھے یہ جاننے کا حق دو گے کہ میرے بدلے تمہارے حکومت ہند سے کیا مطالبات ہوں گے؟"

"نہیں تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں۔ ہم تمہیں ایک ریڈیو' مطلوبہ کتابیں' اخبارات اور کھانا فراہم کرتے رہیں گے۔ شراب کے لئے معذرت! ہم کوشش کریں گے کہ تمہاری مرضی کا کھانا پینا فراہم کر سکیں۔ کمرے سے ملحقہ باتھ روم موجود ہے اور سامنے والی الماری میں کپڑوں کے دو جوڑے بھی۔ یہاں کسی ضرورت کے لئے طلب کرنے پر ہی کوئی آئے گا--- تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کرو گے تو جواب نہیں ملے گا--- اب ہم چلتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ لوگ سامنے والی سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔

بریگیڈیئر تہہ خانے میں اکیلا رہ گیا۔ یہاں ٹی وی' ریڈیو' اخبارات اور کچھ کتابیں موجود تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں کے راستے ایک شخص نیچے اترا اور اس کے لئے چائے سے بھرا فلاسک اور سینڈوچ رکھ کر چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے قید میں اس کا پہلا ناشتہ تھا۔

پنڈت نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب سوائے مردانگی سے حالات کا مقابلہ کرنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔

ooo

رومن اکھاڑے کی تباہی کی خبر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی سری نگر کے در و دیوار پر طلوع ہوئی تھی۔ فوج نے اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا اور حالت جنگ کی سی کیفیت میں سری نگر کے گلی کوچوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ دن قریباً" دوپہر کو طلوع ہوا تھا۔ آج سال کی سب سے شدید دھند پڑی تھی۔ اس شدید دھند اور سردی نے کاروبار حیات عملاً مفلوج کر دیا تھا لیکن رومن اکھاڑے کی تباہی کی خبر نے جیسے سری نگر کی نیم مردہ بستی میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔

ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔

لوگ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب سا سری نگر کے گلی محلوں میں امڈ آیا--- بھارتی فوج کے سورے بے بسی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ نوجوانوں کی ٹولیاں ان کے سامنے سے کشمیر کی آزادی' پاکستان زندہ باد اور نعرہ تکبیر بلند کرتی گزر رہی تھیں۔

ابھی تک فوج نے رومن اکھاڑے کی طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن جموں ٹائمز کا نمائندہ کسی نہ کسی طرح یہاں تک جا ہی پہنچا--- اس نے کھٹاک کھٹاک کر کے یہاں کی خاصی تصاویر اتار لی تھیں اور یہاں موجود جوانوں کے ذریعے کرنل مہرہ کی مسخ شدہ اور نشان عبرت بنی لاش تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی چکا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑا معرکہ سر کیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے یہاں سے لوٹنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا' عین انہی لمحات میں آرمی کی ایک جیپ اس کے سر پر آ کھڑی ہو گئی۔

"تم یہاں پہنچے کس طرح ہو؟" آرمی انٹیلی جنس کے میجر نے کڑک کر پوچھا۔

"ہوائی جہاز کے ذریعے!" جواب کے طنز نے میجر کو کاٹ کر رکھ دیا۔

"تم جانتے ہو ہم اس طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں دے رہے۔"

"کیا کوئی ایسا قانون ہے؟"

"تم ہمیں قانون پڑھاؤ گے!"

"میں صرف آپ کو باخبر کر رہا ہوں کہ مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش بیکار ثابت ہو گی۔"

"اس سے کیمرہ چھین لو!" میجر نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

میجر کا حکم ملتے ہی اس کے ماتحتوں نے سختی سے رپورٹر کو جکڑ کر اس سے کیمرہ چھین لیا۔ کیمرہ انہوں نے میجر کی طرف اچھال دیا جس نے کیمرے سے فلم نکال کر ضائع کر دی۔

"میجر تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہ غنڈہ گردی ہے۔" رپورٹر نے چلاتے ہوئے احتجاج کیا۔

"مارو سالے کو۔ ہمیں قانون پڑھانے آیا ہے۔" اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے ایک زوردار تھپڑ کسی نے اس کے منہ پر جڑ دیا۔ دو تین منٹ میں ہی انہوں نے رپورٹر کی اچھی خاصی دھلائی کر کے رکھ دی تھی۔ پھر وہ اسے نیم بے ہوش وہیں پھینک کر آگے بڑھ گئے۔

بڑا باہمت رپورٹر تھا---!

بے چارہ کسی نہ کسی طرح اٹھا اور موٹر سائیکل کے ساتھ گھسٹتا ہوا اپنے آفس تک پہنچ گیا۔ اس کا ایڈیٹر اس سے بھی زیادہ گرم مزاج کا حامل تھا۔ بمشکل تین گھنٹے کے بعد ہی جموں ٹائمز کا ضمیمہ مقبوضہ کشمیر کے گلی بازاروں میں ہاتھوں ہاتھ بک رہا تھا۔ اس ضمیمے کی سرخی چلا چلا کر بھارتی فوج کے مقامی بریگیڈیئر کمانڈر کے غائب ہونے کی کہانی سنا رہی تھی۔ اخبار کے ضمیمے کے ذریعے لوگوں کو حالات کا علم ہوا کہ حریت پسندوں نے نہ صرف رومن اکھاڑہ تباہ کیا تھا بلکہ انہوں نے کرنل مہرو کو اس کے اذیت ناک ہتھیاروں سے قتل کر ڈالنے کے بعد بریگیڈیئر کو اغوا کر لیا تھا۔ اخبار نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ بریگیڈیئر پنڈت کو وہ لوگ یرغمال بنا کر ساتھ لے گئے ہیں۔

ooo

اس خبر نے تو جیسے وادی کشمیر میں آگ سی لگا دی تھی۔

دہشت زدہ اور یخ بستہ وادی میں زندگی نے نئی کروٹ لی تھی۔ حریت پسندوں کے تازہ کارنامے نے مردہ رگوں میں خون دوڑا دیا تھا۔

خوف زدہ اور سہمے ہوئے چہروں پر زندگی حرارت بن کر دمکنے لگی تھی!

بے حوصلوں کو حوصلہ مل گیا تھا----!

بے نواؤں کو نوا مل گئی تھی----!

گونگے درودیوار آزادی' حریت' اخوت اور خدائی وحدانیت کے نعروں سے لرزنے لگے تھے۔

جوش نے جلوس کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ٹولیاں بڑے بڑے گروہوں کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ پھر ایک مرکزی جلوس تشکیل پا گیا۔ لوگ پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے نعرے لگا رہے تھے۔ آزادی مانگ رہے تھے۔ غلامی کی لعنت سے نجات پانے کی شدید خواہش کا چلا چلا کر اظہار کر رہے تھے۔

یہ تماشا غاصبوں کے لئے---- ناقابل برداشت تھا۔ وہ احتجاج سننے کے تو عادی تھے ہی نہیں۔ انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ مقہور اور بے کس و بے بس جانور نما انسان کبھی ظلم پر احتجاج کا حوصلہ بھی کر پائیں گے۔ آج جب انہوں نے احتجاج سے بھی آگے نکل کر استصواب اور پھر آزادی کا مطالبہ کیا تو غاصبوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

غلاموں کی یہ حرکت ناقابل برداشت تھی----!

ناقابل یقین تھی----!

انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور ان نہتے غلاموں کے جلوس پر جانوروں کی طرح پل پڑے۔

لاٹھیاں' آنسو گیس اور پھر فائرنگ!

لوگ کٹ رہے تھے' گر رہے تھے۔ ان کے خون سے سڑکیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان کے حلق بدستور آزادی کے نعرے پکار رہے تھے۔

لیکن کب تک----؟

بالآخر انہیں آتش و آہن کے اس سیلاب کے سامنے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ شام ڈھلے تک سری نگر میں امن عامہ کی خطرناک صورت حال کے پیش نظر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ شہر کے چوراہوں میں بھارتی فوج نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔

زخموں سے چور لیکن نشۂ آزادی سے سرشار کشمیری اپنے گھروں میں سمٹ گئے تھے۔ رات ڈھلتے ہی ان کے گھروں کے بند کواڑ کھٹکھٹائے جانے لگے۔ جن گھر کے مکین فوراً دروازہ نہ کھولتے' ان کا دروازہ توڑ کر بھارتی فوج کے سورمے دھڑ دھڑ کرتے اندر گھس آتے اور جو نوجوان ان کے ہاتھ لگتا' اسے پہلے تو مار مار کر ادھ موا کر دیتے' پھر گھسیٹتے ہوئے باہر موجود ٹرک میں لا کر پھینک دیتے۔

اگر کوئی رشتہ دار اپنے پیارے کے دکھ پر نعرہ احتجاج بلند کرتا تو یہ لوگ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔ ان کے ہاتھ عورتوں پر بھی اسی طرح اٹھ رہے تھے جس طرح مردوں پر۔

شاید عورتوں کو مار پیٹ کر اپنی مردانگی کا رعب جما رہے تھے۔ اندھا دھند فائرنگ اور کرفیو کے بعد وہ یہی گمان کرتے تھے کہ: "شاید اب یہ لوگ دوبارہ سر نہیں اٹھائیں گے۔" لیکن حریت پسندوں کی دلیرانہ کارروائیوں نے جو آگ ان کے دلوں میں لگا دی تھی وہ بھلا ان جابرانہ ہتھکنڈوں سے کیسے سرد ہوتی؟

کرنل شکلا جیپ کے ٹائروں کے تعاقب میں تربیت یافتہ کتوں کے ساتھ شہر سے تین چار میل دور نکل آیا تھا۔ وہ اور اس کے جوان اس طرح بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگے تھے لیکن انہیں سختی سے حکم ملا تھا کہ: "چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بریگیڈیئر پنڈت کو تلاش کر کے اغوا کاروں کے ہاتھوں سے رہا کروانا تھا بلکہ اغوا کرنے والوں کو بھی ان کے ٹھکانوں سمیت نیست و نابود کر کے رکھ دینا تھا۔"

بریگیڈیئر کے اغوا' کرنل اور تیس چالیس نوجوانوں کی موت نے بھارتی افواج کے

ہیڈکوارٹر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اعلیٰ فوجی قیادت غصے سے پھنکار رہی تھی۔ وہ لوگ اس خبر کے افشا سے پہلے پہلے اس کھیل کو ختم کر دینا چاہتے تھے لیکن ان کی بدبختی جموں ٹائمز کے رپورٹر نے یہ خبر آؤٹ کر دی تھی---- اب تو ان کی حالت زخم خوردہ بھیڑیوں جیسی ہو رہی تھی۔

قریباً" دس میل تک نشانات کے تعاقب کا سلسلہ جاری رہا۔ اب وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکے تھے جب کرنل شکلا کے ایک جوان نے دور ہی سے چلا کر کرنل صاحب کو ایک طرف اشارہ کر کے کچھ دکھانا چاہا تھا۔

شکلا نے اپنے گلے میں لٹکی دوربین آنکھوں پر جمائی اور انگلی کے تعاقب میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔ ایک زوردار جھٹکا اس کے ذہن کو لگا۔ وہاں منظر ہی کچھ ایسا تھا۔

جیپ جس کے ذریعے وہ فرار ہوئے تھے' پہاڑی کے دامن میں موجود ایک گہرے نالے میں گری پڑی تھی۔ کرنل شکلا اور اس کے جوانوں نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ تباہ شدہ جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جیپ کو دھماکے سے تو نہیں اڑایا گیا تھا لیکن کافی بلندی سے نیچے پھینکا گیا تھا۔

شاید نیچے پھینکنے کے بعد بھی ان لوگوں نے اس بات کا مزید اطمینان کر لیا تھا کہ کہیں جیپ کا کوئی حصہ قابل استعمال نہ رہ جائے۔ تباہ شدہ جیپ کے بونٹ پر ایک پتھر رکھا تھا جس کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ دکھائی دے رہا تھا۔ کرنل شکلا نے بے تابی سے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ نکال لیا۔

لفافے کے اوپر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: "صرف اعلیٰ افسران ہی اس تحریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔"

کرنل شکلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے لفافے سے برآمد ہونے والی تحریر پڑھ رہا تھا:

"ہم بھارتی فوج کی اعلیٰ قیادت کو خبردار کر رہے ہیں کہ بریگیڈیئر رامیشور پنڈت ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم رومن اکھاڑے کو تباہ کرنے' کرنل مہرہ کو ہلاک کرنے اور بریگیڈیئر کو اغوا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔

اگر آپ لوگ بریگیڈیئر کی جان کی سلامتی چاہتے ہیں تو اس کے عوض ہمارے پانچ ساتھیوں کو رہا کرنا ہو گا۔ ابھی مطلوبہ ساتھیوں کے نام نہیں دیئے جا رہے' صرف سوچنے کا موقعہ دیا جا رہا ہے۔ ہمیں آپ کا جواب کل شام ۶ بجے تک مل جانا چاہیے۔ جواب دینے کے لئے ریڈیو سری نگر کا چینل استعمال کیا

جائے اور اس کے ذریعے ہمیں بتایا جائے کہ آپ لوگ بات آگے بڑھانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ اس بات کا خیال رہے کہ ہم کسی بھی حالت میں "درمیانی رابطہ" استعمال نہیں کریں گے اور بریگیڈیئر پنڈت کی جان صرف اسی صورت میں بچ سکے گی۔ اگر ہماری ہدایت پر ہماری مرضی کے مطابق عمل ہو۔ پیغام وصول ہونے کے اگلے روز شام چھ بجے کی خبروں میں آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اگلے روز علی الصبح بریگیڈیئر پنڈت کی لاش آپ کو وادی کشمیر کے کسی حصے میں مل جائے گی۔ اس بات کا خیال رہے کہ ہمیں یہ علم ہو جائے گا کہ ہمارا پیغام "صحیح ہاتھوں" تک پہنچ چکا ہے یا نہیں۔ وارننگ کی مدت کا آغاز بھی' ہم پیغام آپ لوگوں تک پہنچنے کے فوراً" بعد سے ہی کریں گے۔

اللہ ٹائیگرز!"

کرنل شکلا کو شدید سردی میں بھی اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ ں نے کاغذ کو اسی طرح لفافے میں بند کر کے اپنی جیکٹ کی جیب میں محفوظ کیا اور اب وہ ہ شدہ جیپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیپ کی سیٹیں' انجن' باڈی' ٹائر کوئی شے سلامت نہیں ی تھی۔ اس کے جوان ہر ممکن کوشش کر گزرنے کے باوجود ابھی تک جیپ سے کوئی ایسا و برآمد نہیں کر پائے تھے جو ان کی راہنمائی کرتا یا اس جیپ میں بریگیڈیئر پنڈت پر بیتنے ی کہانی سناتا۔

ooo

پندرہ منٹ بعد ہی آرمی کے مقامی انٹیلی جنس یونٹ کمانڈر نے تمام واقعات اور کاروں کی دھمکی دہلی میں اپنے ہیڈکوارٹر کو پہنچا دی تھی۔

یہ اطلاع انٹیلی جنس ہیڈکوارٹر میں ٹائم بم کی طرح اعلیٰ قیادت کے اعصاب پر پھٹی تھی۔ پہلے پیغام ہی سے ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بریگیڈیئر پنڈت کو عام قسم کے دہشت ردوں نے نہیں بلکہ منظم تنظیم نے اغوا کیا ہے اور یہ لوگ آسانی سے ہینڈل ہونے والے ں۔

جنرل بھاٹیہ اور اس کا نائب بریگیڈیئر رانجن اپنے مکمل سٹاف کے ساتھ ہنگامی میٹنگ ب کر چکے تھے۔ یہ میٹنگ محض ایک گھنٹے کے مارجن پر طلب کی گئی تھی۔ فیکس کے یے خط کی کئی کاپیاں ہو بہو نقل ہو کر ان کے سامنے دھری تھیں۔ مکمل جزئیات کے ھ واقعات کی تمام کڑیاں لوائنٹس کی صورت ٹائپ شدہ کاغذات پر ان کے نظروں کے

سامنے بچھی تھیں۔

"میرے خیال سے سر! سب سے پہلے ہمیں "را" کو مطلع کر دینا چاہیے۔ کیونکہ ان معاملات کو براہ راست وہی ڈیل کرتے ہیں۔" کرنل نے سب سے پہلے اپنی رائے پیش کی۔

"تمہاری عقل گھاس تو نہیں کھا گئی کرنل۔ آرمی کا بریگیڈیئر اغوا ہوا ہے اور ہم وہاں پولیس کے کسی سپرنٹنڈنٹ سے توقع لگا کر بیٹھ جائیں کہ وہ انہیں اغواکاروں کے شکنجے سے نکال لائے گا۔ کیا کریں گے یہ لوگ؟ سوائے اس کے کیس پولیس کو منتقل کر دیں۔" بریگیڈیئر رانجن اس تجویز سے بھڑک اٹھا۔

"لیکن وہ لوگ ہمارے لئے مسائل کھڑے کر دیں گے سر! پہلے ہی ہمارے درمیان خاصا تناؤ موجود ہے۔ پچھلے ہفتے تو ان کے اور ہمارے جوانوں کے درمیان کراس فائرنگ بھی ہو چکی ہے---- منسٹری کے لوگ اس معاملے میں بہت جذباتی ہو رہے ہیں جناب!" کرنل نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کو اس ڈانٹ کے باوجود نظرانداز نہیں کیا تھا۔

"مائی ڈیر کرنل! انڈین آرمی کا سارا وقار داؤ پر لگ چکا ہے۔ خبر پریس میں پہنچ چکی ہے لیکن ابھی تک نہ تو ان لوگوں نے اپنی طرف سے پریس کو خبر دی ہے اور نہ ہی ہماری طرف سے اس خبر کی تصدیق کی گئی ہے کہ بریگیڈیئر کو بھی وہ لوگ اغوا کر کے لے جا چکے ہیں۔ شاید وہ یہی چاہتے ہوں کہ ہم آپس میں معاملات طے کر لیں---- کرنل یہ لوگ ہمارا تماشا بنا کر رکھ دیں گے۔ تم بھارتی فوج کے بریگیڈیئر کمانڈر کے اغوا کو کسی منسٹر یا سیاستدان کا اغوا نہ سمجھو۔" اس مرتبہ جنرل بھاٹیہ براہ راست اس سے مخاطب تھا۔

کرنل نے اس کے بعد زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

"جنٹل مین! ہمیں سب سے پہلے ان لوگوں کی پہلی دھمکی پر غور کرنا ہے۔ ----کیا ہم کل شام چھ بجے تک ان کے ٹھکانے تک پہنچ پائیں گے؟ یہ ہے سب سے اہم سوال۔ اگر یہ معاملہ سول انٹیلی جنس کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تو وہ ایسی بیوقوفی ضرور کریں گے اور پھر چھ بجے سے پہلے تک اگر ان کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو وہ لوگ پنڈت کو مار ڈالیں گے۔ یہ بات ذہن میں رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔" جنرل بھاٹیہ نے ان سے کہا۔

"سر! میرے خیال سے سب سے پہلے تو ہم فوراً" سری نگر ریڈیو سے ان کی ڈیمانڈ کے مطابق کل چھ بجے کی خبروں میں یہ اعلان کروا دیں کہ ہمیں ان کی شرائط منظور ہیں۔ اس کے بعد کسی بھی طرح ان لوگوں کو براہ راست گفتگو پر تیار کرنا ہو گا۔ جب تک یہ لوگ سامنے نہیں آتے' کوئی بھی خطرہ مول لینے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔" راجن نے سب سے پہلے اپنی رائے پیش کی۔

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"ٹھیک ہے کل ریڈیو سے نشر ہونے والا پیغام تیار کر لو۔ اس درمیان اگلی حکمت عملی پلان کر کے کل رات یہیں میٹنگ کال کرو۔ بریگیڈیئر راجن تم شکلا کی مدد کے لئے فوراً" ایک ٹیم سری نگر بھیج دو۔ سول فلائٹس استعمال نہیں ہوں گی۔" جنرل بھاٹیہ نے انہیں اگلے احکامات سنا دیئے۔

اس جگہ ان لوگوں نے ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہیڈکوارٹر قائم کر دیا تھا۔ جس کا رابطہ ہاٹ لائن پر سری نگر میں قائم ہونے والے ایک اور ہنگامی مرکز سے قائم کر دیا گیا تھا۔ سری نگر کے ہنگامی مرکز کی کمان سنبھالنے کے لئے بریگیڈیئر راجن اپنی ٹیم کے ساتھ اسی وقت آرمی کے خصوصی جہاز پر سری نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آرمی کی وادی کشمیر میں موجود تمام یونٹس کو "ریڈ الرٹ" مل چکا تھا۔ سری نگر شہر کو آنے اور جانے والے تمام راستوں کا آرمی نے محاصرہ کر لیا تھا۔ شہر کے اندر فوج کی گشت بڑھا دی تھی۔

ooo

جموں ٹائمز کی خبر نے "را" کو چونکا دیا تھا----!

مقامی ایریا کمانڈر نے ہیڈ کوارٹر کو سگنل دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سری نگر کے گلی کوچوں میں سیکورٹی کا جال پھیلا دیا گیا۔ شام چھ بجے آرمی کے مقامی کمانڈر کی طرف سے "اللہ ٹائیگرز" کے نام پیغام نشر ہوا تو "را" کے ڈائریکٹر راؤ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"نان سینس! یہ گدھے کس کی اجازت سے ریڈیو سٹیشن تک پہنچے؟" وہ اپنے ماتحتوں پر برس پڑا۔

"سر! ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ سر! کشمیر میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" اس کا ماتحت رو دینے والے انداز میں بولا۔

"میں ابھی ڈیفنس منسٹری سے بات کرتا ہوں۔ ابھی اسی وقت---- اور تم مسٹر راجہ! تم فوراً" سری نگر پہنچو۔ اس سے پہلے کہ یہ گدھے کوئی اور گل کھلائیں' تم فوراً" حالات پر کنٹرول کر لو۔"

"او کے سر!" ڈپٹی ڈائریکٹر راجہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آرمی کے اگلے جہاز کی روانگی کے بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد ہی ایئرانڈین لائن کی ایک خصوصی فوکر پرواز "را" کی ٹیم کے ساتھ سری نگر کی طرف جا رہی تھی۔

ایک ضربِ کاری

سری نگر ریڈیو سے پیغام نشر ہو چکا تھا۔ امریک سنگھ اور بوڑھے کشمیری مجاہد نے اکٹھے
پیغام سنا تھا۔ جس میں ان کی ہدایت کے مطابق ان کی پیش کش مان لینے کا اعلان کیا گیا
ریڈیو کے نزدیک نوجوانوں کے چہرے تمتمانے لگے تھے۔ انہوں نے جوش جذبات میں
دوسرے کو ابھی سے مبارک باد دینا شروع کر دی تھی۔

"ابھی مشکل دور کا آغاز ہوا ہے بشیر شاہ!" امریک نے مقامی مجاہدین کے کمانڈر کو
ب کیا۔

"میں جانتا ہوں امریک سنگھ کہ آدھی فتح کی دنیا میں کوئی اہمیت تسلیم نہیں کی جاتی لیکن
لوگوں کی طرف سے ایسا اعلان ہی ہمارے لئے حیران کن ہے۔ وادی کی تاریخ میں کبھی
نہیں ہوا کہ غاصب نے کسی بھی مرحلے پر ایک لمحے کے لئے بھی اپنی شکست تسلیم کی
--- بہرحال ہم چوکس ہیں۔"

"ایک تجویز ہے میرے ذہن میں' اگر وہ کارگر رہی تو واہے گورو کی کرپا سے کامیابی
ے قدم چومے گی۔" امریک نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"وہ کیا؟" سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

"اس مرحلے میں اگر ہم آرمی والوں کو "را" سے ٹکرا دیں تو بازی ہم جیت سکتے ہیں۔
جنرل بھاٹیہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی زمانے میں وہ میرا او-سی تھا۔ وہ اپنے مزاج کا
ہے اور سویلین کی مداخلت کو آرمی معاملات میں کبھی پسند نہیں کرتا--- دوسری
راؤ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آرمی والوں کو گدھے سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں
--- ایک اور بات بھی ذہن میں رہے کہ بریگیڈیئر پنڈت کا تعلق بھارتی آرمی سے
اور وہ لوگ اس معاملے میں "را" کو کیس بگاڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ بشیر شاہ!
نے اپنے کارڈ حکمت اور صبر کے ساتھ کھیلے تو کوئی وجہ نہیں کہ نتائج ہماری مرضی کے
برآمد نہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی ایسا ہی سوچتا ہوں۔" بشیر شاہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

دونوں' بوڑھے کشمیری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اب انہوں نے آپس میں طے کرنا تھا کہ اس کھیل میں کس مہرے کو کس وقت آگے بڑھایا جائے۔ جلد ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور اب وہ لوگ مل کر ایک خط تیار کر رہے تھے جو انہوں نے آرمی انٹیلی جنس تک پہنچانا تھا۔ اس کے بعد ہی اگلا قدم اٹھایا جا سکتا تھا۔

اس سے پہلے ان لوگوں نے اپنے "محفوظ مقامات" کا تعین کر لیا تھا اور باقاعدہ نگرانی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ گو کہ ابھی تک سودا بازی کرنے والوں کو ان مقامات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے بھارتی فوج کے ان علاقوں کا رخ کرنے سے پہلے ہی یہاں اپنے مورچے مضبوط کر لئے تھے۔

○○○

نائیک روڈ پر واقع آرمی انٹیلی جنس کے اس "سیف ہاؤس" کا علم مقامی پولیس کو بھی نہیں تھا جہاں ڈیوٹی پر موجود میجر کو ایک لفافہ موصول ہوا---- لفافہ سرکاری استعمال کا تھا اور اس پر "بہت ضروری" کی مہر بھی ثبت تھی----!

نائیک روڈ کی اس شاندار کوٹھی میں آرمی انٹیلی جنس والوں نے حال ہی میں ڈیرہ جمایا تھا۔ اس ماڈرن آبادی کی خوبصورت کوٹھیوں میں سے ایک یہ بھی تھی۔

کوٹھی کے سفید دروازے پر بظاہر ایک پہرے دار سول کپڑوں میں کھڑا رہتا تھا اور اس کے باہر ایک مقامی تاجر کے نام کی تختی لگی تھی۔ اس بات کی خصوصی احتیاط برتی جاتی تھی کہ یہاں فوج کا کوئی اہلکار اپنی وردی میں داخل نہ ہو سکے' نہ ہی کوئی سرکاری گاڑی یہاں آئے۔ عمارت میں جدید تکنیکی نظام قائم تھا اور اس کا رابطہ خصوصاً" ہاٹ لائن پر دہلی سے جوڑا گیا تھا۔ آرمی انٹیلی جنس کی طرف سے سری نگر شہر اور اس کے قرب و جوار میں ہونے والے تمام آپریشن عموماً" اسی جگہ ترتیب دیئے جاتے تھے۔

فوج کا ایک حوالدار چوکیدار کے روپ میں کوٹھی کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ اس وقت سگریٹ سلگا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف تھا جب اچانک ایک موٹر سائیکل کے بریک چرچرائے۔ اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر موجود سوار نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا کر اسے چونکا دیا:

"یہ لفافہ میجر اگروال تک پہنچانا ہے فوراً" ورنہ تم ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

اس نوجوان نے اپنا یہ فقرہ اونچی آواز سے کہا کیونکہ موٹر سائیکل کا انجن سٹارٹ تھا اور اس

ساتھ ہی وہ ہوا ہو گئے۔

حوالدار کے لئے یہ سب کچھ اتنا اچانک اور چونکا دینے والا تھا کہ وہ بھونچکا ہی رہ گیا۔ کے سنبھلنے تک موٹر سائیکل اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے اس کھلے منہ کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔ حوالدار کا ہاتھ بے اختیار اپنے کوٹ کی جیب کی طرف گیا لیکن وہ پستول باہر بھی نکال لیتا تو یہ لوگ اس کے نشانے کی سے باہر ہو چکے تھے۔

لفافہ ابھی تک اس کے قدموں کے نزدیک پڑا تھا۔ اس نے کسی میکانکی عمل کے تحت ک کر لفافہ اٹھا لیا۔

"شاید یہ کوئی "سورس" ہو۔" اس نے سوچا اور اس اطمینان کے بعد لفافے میں سوائے کے اور کچھ نہیں' اس نے لفافہ جیب میں منتقل کر لیا۔

خیریت گزری کہ اس دوران کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ حالانکہ سامنے کی سڑک گاڑیوں کی اچھی خاصی آمدورفت جاری تھی۔

حوالدار کے لئے یہ بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ں انچارج میجر اگروال تک یہ خط کیسے پہنچائے؟ کیونکہ نہ تو وہ موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کر ا تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی کو پہچان سکتا تھا۔ وہ کمبخت پوری تیاری کے ساتھ آئے ۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل میں یہی خیال آیا کہ لفافہ گول ہی کر جائے۔ اس ح نہ ہو گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ پھر اس کو لفافہ تھمانے والے نوجوان کی وہ بات یاد کہ بصورت دیگر اس کی نوکری بھی جا سکتی ہے اور فوج میں نوکری جانے کا مطلب ہے رٹ مارشل اور پھر لمبی سزا----! حوالدار نے سوچا جو لوگ اس آفس کے متعلق خبر تے ہیں وہ یقیناً میجر اگروال تک اس لفافے کی اطلاع بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح تو اس لئے اور بھی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ بادل نخواستہ اس نے لفافہ میجر اگروال تک پہنچا یا۔ گو کہ اس کے فوراً" ہی بعد اسے اپنی ڈیوٹی سے ہٹا کر بطور سزا واپس یونٹ میں بھیج ا تھا کیونکہ اچانک صورت حال سے اس بری طرح بوکھلا جانے والا شخص کم از کم ان لم کا نہیں رہا تھا۔

○○○

میجر اگروال نے لفافہ چاک کر کے اس میں موجود خط پڑھا تو اس کے ذہن میں بھی پہلا کی پیدا ہوا تھا کہ جب ہیڈکوارٹر کو اس "سیف ہاؤس" کی اطلاع بھی تخریب کاروں

تک پہنچ جانے کی خبر ہو گی تو ان کے اعصاب پر کیسی بجلی گرے گی اور اس کے لئے کرنل شکلا حسب معمول سارا دوش اس کے کندھوں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جائے گا۔

تمام خدشات ذہن نشین کرنے کے بعد ہی اس نے یہ خط کرنل شکلا کی میز تک پہنچایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دہلی سے آنے والی ٹیم کے لوگ باری باری اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ خط میں لکھا تھا:

"ہم آپ لوگوں کو اس بات کا ثبوت دے چکے ہیں کہ آپ کی کوئی حرکت ہم سے پوشیدہ نہیں ہے' نہ ہی کوئی خفیہ ٹھکانہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ آج شام کے بعد کسی بھی وقت ہم فون پر بات کر کے اپنے ساتھیوں کے نام اور تبادلے کی جگہ کا تعین کر لیں گے۔ اس بات کا خاص خیال رہے کہ ہمارے کھیل میں کسی تیسرے کی مداخلت ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو گی۔

آپ کے خیر اندیش

اللہ ٹائیگرز"

"اف بھگوان! کتنے نااہل ہو گئے ہیں ہم لوگ۔ جب ہمارا محفوظ ترین ٹھکانہ بھی ان لوگوں کی نظروں میں آ چکا ہے تو پھر باقی کیا بچا ہو گا----؟" کرنل شکلا نے باقاعدہ ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"میجر اگروال یہ سب کچھ اب ہیڈکوارٹر کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ مجھے کل تک رپورٹ ملنی چاہیے کہ اس سیف ہاؤس کی اطلاع آخر باہر تک پہنچی کیسے؟" اس مرتبہ شکلا نے توقع کے مطابق اگروال کو مخاطب کیا تھا۔

"میں دیکھوں گا سر! لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ کم از کم ہم نے کوئی ایسا سوراخ نہیں چھوڑا جس سے سیف ہاؤس کی ہوا بھی باہر جا سکے---- سر! یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایسا ہیڈکوارٹر کی غلطی سے ہی ہو گیا ہو----!"

"نو آرگومنٹ میجر!" کرنل شکلا نے اسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"او کے سر----!" میجر اگروال نے اپنی ایڑیاں بجائیں۔

"اور ہاں! امید ہے ان لوگوں کے خط کے آخری فقرے کا مطلب تم نے جان لیا ہو گا۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ سویلین لوگ درمیان میں نہ آ جائیں ورنہ کچھ بھی ممکن ہے۔ جنرل صاحب اسے ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔" شکلا نے اسے سمجھایا۔

"رائیٹ سر!" اگروال کے لئے سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

ooo

"را" کے ڈپٹی ڈائریکٹر راجا کی اچانک آمد نے مقامی انتظامیہ کو چوکنا کر دیا تھا۔ وہ لوگ کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لئے خود کو تیار کر رہے تھے۔ صورت حال مقامی انتظامیہ کی توقع سے بڑھ کر سنگین ہو چلی تھی۔ آج تک اس ملک کی تاریخ میں کسی تخریب کار نے اتنی بڑی اور چونکا دینے والی کارروائی نہیں کی تھی۔ بھارتی فوج کا بریگیڈیئر تخریب کاروں کے پاس یرغمال تھا۔ ان کے انٹروگیشن سینٹر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی اور رومن اکھاڑے کا انچارج مارا جا چکا تھا۔

صرف سری نگر شہر سے ۳۳ روزانہ اخبار نکلتے تھے اور ہر دوسرا اخبار کسی نہ کسی گروپ سے رابطہ رکھتا تھا۔ مقامی انتظامیہ کے لئے تمام اخبارات کو روزانہ زوردار سرخیوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہونے سے روکنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اپنے غیر قانونی اثر و رسوخ کے ذریعے وہ دو یا تین اخبارات پر ہی قابو پا سکتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ ان کے بس میں نہیں تھا۔

دوسرے دن رات گئے تک یہ خبر ملک اور اس کے باہر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور دنیا بھر کے جو صحافی دہلی میں جمع رہتے تھے' وہ سب دھڑا دھڑ سری نگر کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔

"را" والوں کے لئے یہ امر بے حد تشویشناک تھا کہ کشمیر اور لندن کے اخبارات نے ایک ساتھ خبریں شائع کی تھیں۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس گروہ کا سلسلہ ملک سے باہر تک پھیلا ہوا ہے اور یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا تھا کہ یہ پلاننگ بھی بھارت سے باہر کسی ملک میں کی گئی ہے۔ یہاں تو صرف اس پر عمل ہوا تھا۔

راجا نے ایک رائے یہ بھی قائم کی تھی کہ عین ممکن ہے کوئی تخریب کار باہر سے ہی اس گروہ کی کمان کرنے کے لئے یہاں آیا ہو----؟

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے فوراً" ہیڈکوارٹر سے گزشتہ ایک مہینے کے درمیان بین الاقوامی فلائٹس سے بھارت آنے والوں کے کوائف مانگ لئے تھے۔ کمپیوٹر نے چند منٹ بعد ہی اس ایک ماہ میں قریباً" بارہ ہزار غیر ملکیوں کے بھارت میں داخل ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔

اس کے بعد "را" کے کمپیوٹرائزڈ سسٹم نے قریباً" پندرہ سو کشمیری اور سکھ غیر ملکی مسافروں کی آمد کا ریکارڈ فراہم کر دیا۔ رات گئے دہلی میں "را" کے ہیڈکوارٹر میں ڈپٹی

ڈائریکٹر راجا کے فوری عمل درآمد کے لئے جو احکامات پہنچے تھے انہوں نے مقامی افسران کو چکرا کر رکھ دیا۔

راجا صاحب نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ: "ملک کے کونے کونے میں موجود اپنے تمام مراکز کو حرکت میں لے آئیں اور ان پندرہ سو کشمیری نژاد اور سکھ مسافروں کی سرگرمیوں کا ریکارڈ جمع کریں۔ اسے خصوصاً" ان لوگوں کے نام پتے درکار تھے جو امیگریشن کو فراہم کردہ اپنے ایڈریسوں پر موجود نہیں تھے۔

راجا صاحب نے اس آپریشن کو ۴۸ گھنٹے کے اندر مکمل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ ۴۸ گھنٹوں کے اندر بہرصورت مکمل ریکارڈ سری نگر میں قائم اس کے ہنگامی ہیڈکوارٹر میں اس کی میز پر موجود ہونا چاہیے۔

"را" والوں کے لئے ایسے ہنگامی احکامات سے نمٹنا روز کا معمول تھا۔ انہیں تربیت ہی اس بات کی دی گئی تھی لیکن ملک گیر سطح پر اتنا بڑا آپریشن اتنی مختصر مدت میں مکمل کرنے میں وہ اپنے "باس" کی توقعات پر پورا اتر پائیں گے یا نہیں----؟ یہی تھا وہ پریشان کن سوال جس نے ان لوگوں کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔ صورت حال کچھ بھی رہی ہو' ان کا اصول تھا کہ انہیں اپنے آفیسرز کی توقعات پر پورا اترنا تھا----!

اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے----!

کچھ بھی کرنا پڑتا----!!

دوسرے ہی لمحے "را" کے وسنت دیہار میں واقع ہیڈکوارٹر پر "ریڈ الرٹ" ہو چکا تھا۔ مقامی ایکسچینج کو "را" نے خصوصی احکامات کے تحت صبح تک اپنے استعمال کے لئے مخصوص کروا لیا تھا۔ "را" کے ماہرین ٹیلی فون و ٹیلی گراف عملاً" ایکسچینج پر قابض ہو چکے تھے۔

ایک پہر رات گزرنے تک وہلی میں موجود "را" کے تمام افسران اس ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے گھروں سے اپنے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ اگلے ۴۸ گھنٹوں تک انہیں اپنی میزوں پر موجود رہنا ہے۔

کسی بھی لمحے کچھ بھی ممکن تھا----!

"را" کے کمپیوٹر سینٹر سے مشکوک پندرہ سو کشمیری اور سکھ غیرملکیوں کے امیگریشن کو فراہم کردہ ایڈریسوں کی لسٹیں تیار ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگوں نے پنجاب' ہریانہ' ہماچل' یوپی اور مقبوضہ کشمیر کے ایڈریس لکھوائے تھے۔ اب "را" کے ماہرین ہر صوبے کے ایڈریسوں کی الگ الگ فہرست مرتب کر رہے تھے۔

یہ فہرستیں ہر صوبے کے کاؤنٹر انٹیلی جنس کے انچارج کو فراہم کر دی گئی تھیں اور یہ فیکس مشینوں کے ذریعے صوبے کے مقامی دفتر تک ڈپٹی ڈائریکٹر راجا صاحب کے احکامات کے ساتھ پہنچا دی گئی تھیں۔

صبح ہونے تک ان لوگوں نے مقامی وفاتر کو اطلاعات پہنچانے تک کا مرحلہ طے کر لیا تھا اور اب وہ بھارت کے کونے کونے میں موجود اپنے ایجنٹوں کی ان غیرملکیوں کی تازہ ترین سرگرمیوں اور ایڈریسوں سے متعلق اطلاعات جمع کرنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے----!

اگلے روز صبح "را" کے ملک بھر میں موجود خفیہ دفاتر تک "ریڈ الرٹ" سگنل پہنچ گیا تھا اور "را" کا ہر چھوٹا بڑا ملازم مستعد اور تیار نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے احکامات موصول ہوتے ہی اپنے اپنے علاقوں میں متعلقہ غیرملکیوں کو کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔

○○○

فون اتفاق سے کرنل شکلا نے موصول کیا تھا:

"تم شاید کرنل شکلا بول رہے ہو----" دوسری طرف سے اس کے ہیلو کے جواب میں کہا گیا اور شکلا کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔

یہ لوگ زبردست ماہر نفسیات تھے اور انسانی کمزوریوں پر ان کی نظر بھی خوب تھی۔

"کون ہو تم----؟" اس نے بظاہر اپنی آواز بڑا زور لگا کر رعب دار بنائی تھی۔

"اللہ ٹائیگرز!" جواب ملا۔

"جانتے ہو تم لوگ کیا کرنے جا رہے ہو؟ کتنے بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہو تم لوگ----؟" کرنل شکلا نے سٹارٹ لیا۔

"میرے خیال سے گفتگو کے لئے تم مناسب آدمی نہیں ہو۔ ہم دس منٹ کے بعد فون کریں گے اور صرف بریگیڈیئر راجن سے بات ہو گی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کرنل شکلا ہیلو ہیلو چلاتا رہا' پھر اس نے ریسیور کو غصے سے گھورتے ہوئے کریڈل پر رکھ دیا۔

اس کے سامنے دھری میز کے گرد کرسیوں پر آرمی انٹیلی جنس کے دیگر سینئر افسران بریگیڈیئر راجن کی ہمراہی میں بیٹھے اپنے نزدیکی مائیک سے نشر ہونے والی آوازیں سن رہے تھے۔

"بہت ہوشیار لوگ ہیں کرنل!" بریگیڈیئر رانجن کا لہجہ بڑا سرد اور سنجیدہ تھا۔

"یس سر!" احساس شکست نے کرنل شکلا کا سر جھکا دیا۔ "کاش معاملہ بریگیڈیئر صاحب کا نہ ہوتا۔" اس نے شاید یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"یہ معمولی تخریب کار نہیں کرنل۔ ان سے سیدھی سیدھی بات کرنا ورنہ شاید ہم بریگیڈیئر پنڈت سے بھی ہاتھ دھولیں۔"

وہ لوگ آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ فون اس مرتبہ بھی کرنل شکلا نے ہی اٹھایا تھا۔

"ہیلو۔۔۔۔!"

"کرنل شکلا میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہم بریگیڈیئر رانجن کے سوا اور کسی سے بات نہیں کریں گے۔" دوسری طرف سے ناراضی کا اظہار ہوا۔

"ضرور کرو بھئی لیکن فون ریسیو کرنے کی ڈیوٹی تو میری ہی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے علاوہ ہمارا اپنا کوئی فون آ جائے۔" کرنل شکلا نے گفتگو کو طول دینا چاہا۔

"اگلا فقرہ بریگیڈیئر رانجن کو بولنا ہو گا ورنہ ہم بات نہیں کریں گے اور....." اس نے غصیلی آواز کے ساتھ اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی بریگیڈیئر رانجن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے شکلا کو بولنے سے منع کر دیا تھا۔

ریسیور اب بریگیڈیئر رانجن کے ہاتھ میں تھا۔

"رانجن سپیکنگ!" اس نے بارعب آواز مین کہا۔

"بریگیڈیئر میں نہایت ادب سے آپ سے گزارش کروں گا کہ مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں طویل گفتگو نہیں کروں گا کیونکہ تم لوگ فون ٹریس کرنے کی کوشش کرو گے۔ میں صرف مطلوبہ پانچ ساتھیوں کے نام پڑھتا ہوں' چونکہ تم لوگ یہ کال ریکارڈ بھی کر رہے ہو اس لئے دہرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی وضاحت اور صاف آواز میں رک رک کر بھارتی انٹیلی جنس کی حراست میں موجود پانچ حریت پسندوں کے نام لے دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس وقت وہ لوگ کہاں کہاں قید ہیں۔

"بریگیڈیئر اپنی سرکار سے بات کر لو۔ ہم کل شام سات بجے تک کا وقت دیتے ہیں۔ تمہیں ہاں یا ناں میں جواب دینا ہے۔ ہمارا یہ فون پر آخری رابطہ ہے۔ اس کے بعد ہم فون پر بات نہیں کریں گے لیکن پیغام آپ لوگوں تک بہرحال پہنچ جایا کرے گا اور جواب بھی ہم

وصول کر لیا کریں گے۔ اگر آپ لوگوں کو یہ سودا منظور ہوا تو کل شام سات بجے سے ساڑھے سات بجے کے درمیان میجر اگروال کو لال بازار کے بس سٹاپ پر بھیج دینا۔ میجر کو بس سٹاپ کے گرد دو چکر لگا کر لوٹ جانا ہو گا۔ اس کا مطلب ہم یہی سمجھیں گے کہ آپ کو ہماری بات منظور ہے' بصورت دیگر آٹھ بجے ہم پنڈت کو گولی مار دیں گے۔" دوسری طرف سے بات کرنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے کر گزرنے کی بھی قادر ہے۔

"یہ تو بہت کم وقت ہے۔" رانجن نے بڑی جلدی جلدی سے کہا۔ اسے ڈر تھا کہیں فون بند ہی نہ کر دیا جائے۔

"نہیں بریگیڈیئر کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے لئے یہ بہت وقت ہے۔ ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ "را" کا ڈپٹی ڈائریکٹر راجا صاحب بھی اپنے کتوں سمیت سری نگر کے گلی محلوں میں ہماری بو سونگھتا پھر رہا ہے۔ ہمیں اس پر بھی نظر رکھنا ہو گی اور اتنے وقت میں اتنے زیادہ جھنجٹ ہم نہیں پال سکتے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کیا تم کوئی درمیانی رابطہ نہیں بتاؤ گے جس کے ذریعے بات ہو سکے۔" رانجن نے پھر بات کرنے میں پھرتی دکھائی۔

"ہم بات کے نہیں عمل کے قائل ہیں۔" اتنا کہہ کر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

"اف بھگوان! کن لوگوں سے پالا پڑ گیا ہے۔"

رانجن ریسیور رکھتے ہوئے بڑی فکر مندی سے بڑبڑایا۔ وہاں موجود دیگر افسران بھی حیرت اور پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسے چالاک لوگوں سے ان کا پالا پڑا تھا جن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ تو بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ حالات کو سمجھ میں آنے ہی نہیں دیتے تھے اور اب یہ کہہ کر تو انہوں نے آرمی افسران کے اعصاب پر بم ہی گرا دیا تھا کہ وہ آئندہ فون پر رابطہ قائم نہیں کریں گے۔

بریگیڈیئر رانجن نے تھوڑی ہی دیر بعد اغوا کاروں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے ٹیپ اپنے ریمارکس ہیڈکوارٹر منتقل کر دیئے تھے۔ انہوں نے جنرل بھاٹیہ سے کہہ دیا تھا کہ یہ اتنی آسانی سے قابو آنے والے نہیں اور کوئی بھی کوشش وہ پنڈت کی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر نہیں کر سکتے۔

بریگیڈیئر پنڈت کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا رسک جی ایچ کیو بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے ہی حریت پسندوں کے ہاتھوں ایک کرنل اور بہت سے جوانوں کی اموات نے فوج کے مورال پر برا اثر ڈالا تھا اور پہلی ہی کارروائی میں اتنی جانوں کا ضیاع بھارتی سینا کے لئے بڑی بدنامی کا باعث بن رہا تھا اور اب اگر ان کا بریگیڈیئر بھی ان لوگوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو شاید بہت سے لوگوں کو خودکشی ہی کرنا پڑتی۔

یہ بڑا ذلت آمیز مقام ہوتا----!

جنرل بھاٹیہ کو چالیس سالہ سروس میں ایسے کرائسس کا سامنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ لوگ تو گفتگو کا موقعہ دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف جی ایچ کیو کا دباؤ برابر بڑھ رہا تھا اور وہ لوگ بریگیڈیئر پنڈت کی بہرصورت رہائی چاہتے تھے۔ اب تک سی این سی نے تین مرتبہ بہ نفس نفیس جنرل بھاٹیہ سے بات کی تھی۔ ہیڈکوارٹر سے لوگ بار بار تازہ ترین صورت حال کی رپورٹ طلب کر رہے تھے اور جنرل بھاٹیہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟

ooo

آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ اشخاص کا ریکارڈ ان کے پاس پہنچ گیا۔ یہ تمام دہشت گرد تھے۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس پر کم از کم دس افراد کے قتل کا الزام نہ رہا ہو۔ اگر ان پر کیس چلایا جاتا تو سزائے موت سے کم کسی کو کوئی سزا نہ ملتی۔

"کیا وزارت داخلہ ان لوگوں کو رہا کرنے پر رضامند ہو جائے گی؟" جنرل بھاٹیہ کے لئے اس سوال کا جواب سوچنا خاصا تکلیف دہ عمل تھا۔

بادل نخواستہ اس نے معاملات کو احسن طریقے سے حل کرنے میں مدد کے لئے سی این سی سے درخواست کر دی تھی اور کمانڈر انچیف کو بتا دیا تھا کہ اغوا کاروں نے انہیں کل شام تک کا وقت دیا ہے جس میں بہرحال انہیں جواب دینا پڑے گا۔ اس کے بعد کمانڈر انچیف تو وزیر داخلہ اور پرائم منسٹر سے میٹنگ کے لئے چلا گیا جب کہ جنرل بھاٹیہ نے سری نگر کو پیغام بھیج دیا تھا کہ بات چیت کا خواہ کچھ بھی نتیجہ ظاہر ہو' وہ لوگ اغوا کاروں کی مرضی کے مطابق انہیں ہاں میں جواب دیں۔

ooo

بھارتی پرائم منسٹر نے کابینہ کا ہنگامی اجلاس دو گھنٹے کے نوٹس پر طلب کیا تھا۔

اس اجلاس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہ بھی موجود تھے جب کہ بریفنگ کے لئے جنرل بھاٹیہ کو خاص طور سے طلب کیا گیا تھا---- "را" کا ڈائریکٹر راؤ اس کے سامنے والی کرسی پر موجود تھا۔ سب سے پہلے تو جنرل بھاٹیہ نے اپنی رپورٹ اور اغواکاروں کے ساتھ گفتگو کا ٹیپ ان لوگوں کو سنایا۔ اس کے بعد تینوں افواج کے سربراہوں نے اس معاملے پر اپنی الگ رائے دی۔

تینوں نے فوجی نقطہ نگاہ سے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایک مرتبہ تو ان لوگوں کا مطالبہ مان کر کسی نہ کسی طرح بریگیڈیئر پنڈت کو آزاد کروا لیا جائے۔ اس کے بعد رہا ہونے والوں سمیت کسی کو وہاں سے نکلنے کا موقع نہ دیا جائے خواہ اس میں معاہدہ توڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔

"لیکن آپ لوگ پہلے ہی ایسا کرنا کیوں نہیں چاہتے؟ کیا بھارتی سینا اب اتنی باہمت بھی نہیں رہی کہ اپنے ایک آفیسر کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلا سکے؟" وزیر داخلہ نے بڑا الجھتا ہوا سوال کیا تھا۔

"جناب والا! جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بریگیڈیئر کی موت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں ایک مرتبہ کسی بھی طرح چالاکی سے کام لے کر ہمیں بریگیڈیئر پنڈت کو رہا کروا لینے دیں' اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ مجرموں میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔" کمانڈر انچیف نے جواب دیا۔

وزیراعظم نے اپنی نگاہوں کو اب "را" کے ڈائریکٹر کے چہرے پر مرکوز کر دیا تھا۔

"جناب والا! آرمی انٹیلی جنس کے عدم تعاون کے باوجود ہم اپنے طور پر بہت کچھ کر چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کسی بھی طرح اگر ہم ان لوگوں کو چار پانچ روز تک گفت و شنید میں الجھائے رکھیں تو کامیابی ہمارے قدم چوم سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ہر ممکن کوشش سے ہم چار پانچ روز تک ان لوگوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد راؤ نے اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کی اور بتایا کہ "را" نے مشتبہ افراد کی تلاش کا بڑا آپریشن شروع کر دیا ہے اور کل تک ان کا ڈپٹی ڈائریکٹر راجا کسی نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے گا۔"

جنرل بھاٹیہ کا جی چاہتا تھا کہ اس وقت اٹھ کر راؤ کا چہرہ نوچ لے---- یہ کمبخت ہر وقت اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا----!

ooo

اس مرحلہ پر وزیر داخلہ نے وزیر اعظم کے سامنے انٹیلی جنس کی مختلف ایجنسیوں کے عدم تعاون کی شکایت کو دہرایا اور یہ تجویز پیش کی کہ کم از کم اہم ترین قومی معاملے پر ایک مشترکہ کمیٹی بنا دی جائے جو مل کر کام کرے۔

اس مرحلہ پر جنرل بھاٹیہ نے وزیراعظم کی توجہ اغواکاروں کی اس دھمکی کی طرف مبذول کروائی کہ وہ کسی تیسری طاقت کی مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے اور یہ بھی بتا دیا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے اور جڑیں بہت گہری ہیں۔

"جنرل صاحب شاید ان غنڈوں سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہیں۔" راؤ نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اپنی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ جنرل بھاٹیہ کی طرف اچھالی۔

بھاٹیہ نے اس کے طنز کو اس طرح نظرانداز کیا کہ اس کی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ وزیر داخلہ اور "را" کے ڈائریکٹر کے علاوہ سیکورٹی کونسل کے سربراہ نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ: "مجرموں کو رہا کرنا ملکی سالمیت کو داؤ پر لگانے والی بات ہو گی اور ساری دنیا میں ہماری ناک کٹ کر رہ جائے گی۔" کابینہ نے بھی ملی جلی رائے پیش کی تھی لیکن ایک بات پر سب ہی لوگوں نے اتفاق رائے کیا تھا کہ: "بریگیڈیئر کی تخریب کاروں کے ہاتھوں موت نہیں ہونی چاہیے خواہ اس کے عوض انہیں کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔" انہوں نے اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی کہ تخریب کاروں کے ساتھ ہونے والے کسی معاہدے کو خاطر میں نہ لایا جائے اور بریگیڈیئر پنڈت کی رہائی کے ساتھ ہی ان لوگوں کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آئی بی' را اور ملٹری انٹیلی جنس سے ایک ایک آفیسر لے کر ایک ایکشن کمیٹی بنا دی گئی جو اس صورت حال کی لحہ بہ لحہ رپورٹ وزیر اعظم کو پیش کرنے کی ذمہ وار تھی۔

وزیراعظم نے کمال سیاست سے کام لے کر آرمی اور سول انٹیلی جنس کے سربراہوں سے کہہ دیا تھا کہ: "کوئی بھی ایجنسی اگر ایسا کر پائی کہ ملک کی عزت پر حرف نہ آنے پائے تو یہ اس کا اہم کارنامہ تصور ہو گا۔" اس نے تمام ایجنسیوں کو حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہر قانونی یا غیر قانونی طریقہ اپنانے کی کھلی چھٹی دے دی تھی۔

صبح ہونے کو تھی جب یہ اہم میٹنگ برخاست ہوئی۔ ان لوگوں کو یہ سگنل تو حکومت کی طرف سے بہرحال مل گیا تھا کہ وہ اغوا کاروں کے ساتھ گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھیں اور ان کو اگلے روز شام کو یہ پیغام بھی پہنچا دیں کہ حکومت نے ان کے مطالبات تسلیم کر

لئے ہیں۔

ooo

وزیراعظم کے حکم پر گو کہ ایک مشترکہ ایکشن کمیٹی قائم ہو گئی تھی لیکن ہر ایجنسی کو علم تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے کس حد تک تعاون کرنا ہے۔ وہ لوگ اپنے اپنے ممبر کو اپنی کارکردگی کی خبر پہنچاتے رہے۔ اس سے زیادہ یہ کمیٹی اور کیا انجام دے سکتی تھی۔

اس روز شام ڈھلنے تک ڈپٹی ڈائریکٹر راجا صاحب کے پاس ایسے تیرہ غیر ملکیوں کی لسٹ پہنچ چکی تھی جنہیں اس ایجنسی کے لوگ بعد از خرابی بسیار بھی تلاش نہیں کر پائے تھے۔

ان میں ایک نام ٹھاکر روندر سنگھ بھی تھا۔۔۔۔!

ٹھاکر روندر سنگھ دو ماہ پہلے بمبئی کے سانتا کروز ایئر پورٹ سے داخل ہوا تھا۔ اس نے ایک ہوٹل کا ایڈریس لکھوایا تھا جہاں سے تین روز بعد ہی وہ کہیں اور چلا گیا تھا اور آج تک پھر اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ امیگریشن ریکارڈ سے اس کا پاسپورٹ نمبر اور برطانیہ کا ایڈریس ان لوگوں نے معلوم کر لیا تھا۔

بارہ دیگر افراد جن کا تعلق دوسرے ممالک سے تھا' کے ناموں کے گرد سرخ حاشیے لگا کر راجا نے "سپیشل انکوائری اور فوری رپورٹ" کے احکامات جاری کر دیئے تھے جب کہ بھارت اور برطانیہ میں حال ہی میں تخریب کاری کے خاتمے کے سلسلے میں طے پانے والے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت "را" نے فوراً برطانیہ میں ایم آئی فائیو سے رابطہ قائم کر کے انہیں ٹھاکر روندر سنگھ کے پاسپورٹ کا نمبر دیتے ہوئے اس کے مکمل کوائف اور ریکارڈ طلب کیا تھا۔

راجا کے لئے حیرانگی کی بات یہ تھی کہ ٹھاکر کے پاسپورٹ پر بزنس میں پیشہ درج تھا اور جو فارم اس نے بھارتی ویزے کے حصول کے لئے بھرا تھا' اس میں بھارت میں قیام کے لئے صرف دس دن کی درخواست کی تھی۔ کسی بھی برطانوی تاجر کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہوتا کہ وہ دو ماہ تک بھارت میں اپنی کاروباری مصروفیت کو بھلا کر وقت ضائع کرتا پھرے۔

"را" کے پاس ایسی بہت سی وجوہات موجود تھیں جن کی بنا پر وہ ٹھاکر روندر سنگھ پر شک کرتے۔ معاملات کی سنگین نوعیت کے پیش نظر ایئر انڈیا کی خصوصی پرواز سے "را" کا ایک اعلیٰ افسر فوری معاملے کی جانچ پڑتال کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ وہ لوگ جلد از جلد ٹھاکر روندر سنگھ کا مکمل "بائیوڈیٹا" حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوئی حتمی رائے اس کے بعد ہی قائم کی جا سکتی تھی۔

ooo

میجر اگروال اس وقت لال چوک کے مخصوص بس اسٹاپ پر موجود تھا۔

اس نے اغوا کاروں کے کہنے کے مطابق بس سٹاپ کے دو چکر مکمل کر لئے تھے۔ اس کی یہاں آمد سے پہلے انٹیلی جنس کے سفید کپڑوں میں ملبوس اہلکاروں نے اس علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

لیکن----!

ان کے لئے جاننا ناممکن تھا کہ یہاں موجود ہزاروں لوگوں میں سے اس مخصوص شخص کو وہ پہچان سکیں جو میجر اگروال کی حرکات کو نوٹ کر رہا ہو۔ اگروال نے کام ختم ہونے پر واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا۔

بس سٹاپ کے بالکل سامنے کی بلڈنگ میں موجود دفاتر میں سے ایک کھڑکی سے دو محتاط آنکھوں نے اس کی حرکات نوٹ کر لی تھیں اور اب وہ شخص مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ اس دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور طویل عرصے سے مجاہدین کی جدوجہد میں ان کے ساتھ تعاون کرتا آ رہا تھا۔ کچھ روز پہلے اس کو میجر اگروال کی شناخت کروائی گئی تھی۔ اس کی رہائش گاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دو تین مرتبہ اگروال کو دیکھا تھا اور اب اس کی مشابہت اس کے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔

آج اسے یہ حکم موصول ہوا تھا کہ اس نے رات سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان میجر اگروال کو لال چوک کے بس سٹاپ پر ایک خاص حرکت دہراتے ہوئے دیکھنا اور اپنے ساتھیوں کو مطلع کرنا تھا۔

اگروال کی روانگی کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے دفتر ہی سے ایک نمبر پر ٹیلی فون کر کے حریت پسندوں کو آگاہ کر دیا اور اب مطمئن ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

ooo

ٹیلی فون کال بٹہ مالو میں موجود ایک کشمیری تاجر کی دوکان پر بیٹھے بشیر شاہ نے وصول کی تھی اور اطمینان کی ایک لہر اس کے تن بدن میں سرایت کر گئی۔ گزشتہ دو روز سے کھنچے ہوئے اعصاب کو قدرے سکون آ گیا تھا۔ وہ فون سننے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور اسی محلے کی ایک گلی کے مکان پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک نوجوان نے دروازے کے سوراخ سے اسے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر موجود تھا۔

"السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ----!" دروازہ کھولنے والے نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی احتراماً کہا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے بشیر اندر داخل ہو گیا۔

دونوں مکان کی بیٹھک میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے اور بشیر شاہ نے اسے چند ہدایات دینے کے بعد اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر دے دیا۔ اس نے یہ لفافہ "نیوخندہ" کے علاقے میں ایک شخص تک پہنچانا تھا۔

"اچھا عزیز خدا کے حوالے----!" بشیر شاہ نے عزیز نامی اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"فی امان اللہ بھائی جان!" عزیز نے محبت اور احترام کے ملے جلے لہجے میں اسے کہا۔

بشیر شاہ کی روانگی کے چند منٹ بعد ہی وہ ایک ٹیکسی کے ذریعے "نیوخندہ" کے علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر مخصوص مکان تلاش کرنے میں اسے کچھ دیر نہیں لگی تھی۔

یہ "آئی بی" کے ڈی ایس پی موتی لال بھان کا مکان تھا۔ عزیز نے دروازے پر دستک دی، دروازہ ایک نوجوان لڑکی نے کھولا۔

"فرمایئے----!" اس نے بڑی بے باکی سے عزیز کو مخاطب کیا تھا۔

"موتی لال جی گھر پر ہیں؟"

"ابھی نہیں آئے، تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ آپ اندر آیئے تھوڑا انتظار کر لیجئے۔" موتی لال بھان کی سپتری نے عزیز کے سراپے پر للچائی ہوئی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں ان کے آفس سے آیا ہوں۔ یہ بہت ضروری لفافہ ان تک پہنچانا ہے۔ ان کے آفس سے جانے کے فوراً ہی بعد وہلی سے ان کے لئے خصوصی پیغام آیا تھا۔ ایس پی صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں رات تک ہرصورت میں ان کو لفافہ پہنچا دوں۔"

اس نے لفافہ لڑکی کو تھما دیا۔

"آپ کا شبھ نام----؟" لڑکی نے بڑے دلربانہ سے اس کا نام دریافت کیا تھا۔

"دنیش کہتے ہیں مجھے----!" عزیز نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"دنیش جی! کوشلیا نام ہے میرا---- آپ بیٹھئے ناں۔" اس نے ہندو نام سنتے ہی عزیز کو

باقاعدہ دعوت دی۔

"جی نہیں، آفس میں کچھ ضروری کام ہے پھر کبھی آؤں گا۔ میں موتی لال جی کے آفس میں کام کرتا ہوں۔"

"ضرور آیئے گا۔"

"رام رام۔۔۔۔!" عزیز نے اس کی اگلی بات کا جواب دینے کی بجائے یہاں سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔

ڈی ایس پی موتی لال بھان چند منٹ بعد ہی معمول کے مطابق گھر پہنچ گیا۔ کوشلیا نے اسے لفافہ تھماتے ہوئے ساری رام کہانی سنا دی۔ موتی لال پہلے تو حیرانی سے لفافے کی طرف دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ دنیش نام کا کوئی نوجوان اس کے دفتر میں کام نہیں کرتا تھا۔

اس نے مزید کچھ کہے سنے لفافہ کھولا۔ اس بڑے لفافے میں دو چھوٹے لفافے تھے جن میں ایک پر ان کا نام لکھا تھا اور دوسرے پر کرنل شکلا کا نام اور ملٹری انٹیلی جنس کے مقامی آفس کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھا تھا۔ اس نے پہلے تو اپنے نام والا خط بے قراری سے کھولا۔ وہاں ایک مختصر تحریر موجود تھی۔

"مسٹر موتی لال!

تمہیں ٹیلی فون کر کے شکلا کو اطلاع دینی ہے کہ وہ اپنا خط موصول کر لے۔

وقت ضائع نہ کرنا ورنہ اپنی نوکری سے جاؤ گے کیونکہ معاملہ بہت نازک ہے۔

بریگیڈیئر پنڈت کے اغوا والا معاملہ ہے۔ احتیاط کرنا۔"

خط کے نیچے نہ کوئی نام تھا نہ کسی کے دستخط۔ موتی لال چکرا کر ہی تو رہ گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے پہلے اپنے آئی بی کے مقامی جے ڈی چڈھا کو فون کر کے فوراً" ملاقات کی اجازت چاہی۔ چڈھا نے ملاقات کا مقصد جاننا چاہا تو موتی لال نے فون پر بتانے سے معذرت کر لی۔ چڈھا نے اسے فوراً" اپنے گھر پر ہی ملاقات کا وقت دے دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ڈی ایس پی موتی لال بھان اس کے سامنے دونوں لفافوں اور کہانی سمیت موجود تھا۔

آئی بی کے مقامی جے ڈی مسٹر چڈھا نے اس خط کو عطیہ خداوندی جان کر فوراً" چاک کیا اور اس میں موجود تحریر پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔۔۔۔!

ooo

اگلے ہی لمحے وہ دہلی میں اپنے ہیڈکوارٹر سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔ اس نے ڈی جی مسٹر

جاکھڑ سے براہ راست بات کی تھی۔ خط کی نقل اپنے آفس میں موجود فیکس کے ذریعے ہیڈکوارٹر کو بھیجنے کی تاکید کرتے ہوئے جاکھڑ نے اسے کہا تھا کہ اس خط کو دوبارہ لفافے میں بند کر کے موتی لال بھان کے ذریعے کرنل شکلا تک پہنچا دے۔

"اور ہاں یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ شکلا کو یہ خط براہ راست پہنچا دیا گیا ہے۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہو نا کہ موتی لال نے اس خط کا ذکر تک کسی سے نہیں کیا اور خط ملتے ہی سیدھا اس کی طرف آ رہا ہے۔۔۔۔!" جاکھڑ نے آخر میں کہا۔

"یس سر! آپ نہ بھی کہتے تو ہم یہی کرنے والے تھے سر!" چڈھا نے فون پر دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"آل رائیٹ تم لوگ چوکس رہو۔ اپنے مخبروں کی اطلاعات پر براہ راست تم خود نظر رکھو۔ یہی موقع ہے ان سالوں کو نیچا دکھانے کا۔ مسٹر چڈھا! یہاں سری نگر میں فوجیوں کی طرف سے بریگیڈیئر رانجن اور "را" کی طرف سے راجا صاحب آ کر براجمان ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی لڑائی میں اگر کچھ ہمارے ہاتھ لگ گیا تو ڈیپارٹمنٹ کے لوگ تم پر فخر کیا کریں گے۔" جاکھڑ نے کہا۔

"یس سر! میں پوری طرح چوکس ہوں سر!"

"او کے! گڈ بائی۔۔۔۔!" جاکھڑ نے سلسلہ ختم کر دیا۔

موتی لال بھان کو آئی بی کے مقامی جے ڈی نے ڈائریکٹر صاحب کے حکم اور ہدایات کے مطابق خط پہنچانے کے لئے ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل شکلا کے آفس کی طرف روانہ کر دیا۔ آج اس کی سروس کا بہترین دن تھا جب قسمت خود بخود اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

ooo

رات کے اس پہر جب کرنل شکلا کی میز پر آئی بی کے مقامی ڈی ایس پی لال بھان کی ملاقات کی چٹ پہنچی تو وہ ایک لمحے کے لئے چونک گیا۔

"یہ سالے آئی بی والے کہاں سے آن ٹپکے!" اس نے چٹ لانے والے حوالدار کے بجائے اپنے سامنے بیٹھے میجر اگروال کو گھور کر دیکھا۔

اگروال کا دل آج پھر چاہا تھا کہ اس کمبخت کا ٹینٹوا دبا دے۔ وہ اندر ہی کٹ کر رہ گیا۔ کرنل شکلا نے اسے تختہ مشق بنا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد موتی لال بھان کرنل شکلا کے سامنے بیٹھا تھا۔

"خیریت----!" کرنل نے اس کے مودبانہ آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

موتی لال حوالدار سے ترقی کرتا ہوا ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اپنے جذبات پر قابو پانے میں تو اسے کمال حاصل تھا۔ اس اچانک حملے کو بھی وہ مسکرا کر ٹال گیا۔

"ایک لفافہ آپ کا غلط ایڈریس پر پہنچ گیا تھا۔" اس نے لفافہ کرنل شکلا کی طرف بڑھا دیا۔ "دراصل یہ دو لفافے تھے ایک میرے لئے اور دوسرا آپ کے لئے۔ میں نے اپنے والا کھولا تو اس میں یہ حکم موجود تھا۔"

"تھینک یو مسٹر بھان! لیکن مجھے امید ہے کہ تم براہ راست نہیں پہنچے ہو گے۔ ظاہر ہے پہلے تم نے اپنے افسران کو اس حادثے سے باخبر کیا ہو گا۔" کرنل شکلا نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"نو سر! چونکہ آپ تک فوری پہنچانے کی ہدایت تھی اور یہ ملکی سالمیت کا معاملہ ہے اس لئے....."

"مسٹر بھان کیا تمہیں یقین ہے کہ تم سچ بول رہے ہو۔" کرنل شکلا نے اس کی چکنی چپڑی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا۔

"جناب والا! مجھ سے کیا غلطی سرزد ہو گئی ہے؟" موتی لال بھان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔

"مسٹر بھان ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم سویلین لوگ ہمیں سمجھتے کیا ہو؟ تمہیں ضرورت کیا ہے اس پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی؟ یہ فوجی معاملات ہیں ان میں آئی بی کا کیا کام ہے؟" کرنل شکلا کو اچانک ہی احساس ہوا جیسے وہ ضرورت سے زیادہ ہی بول گیا ہے۔

"او کے مسٹر بھان مجھے ضروری کام ہے۔ مسٹر اگروال آپ کو چائے پلاتے ہیں۔" بھان کا جواب سنے بغیر وہ اسے میجر اگروال کے پاس چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"کرنل صاحب شاید ناراض ہو گئے----!" اس نے اگروال کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسٹر بھان برا مت مانئے پلیز۔ یوں تو حالات ہی ایسے ہیں کہ اچھے بھلے لوگ پریشان ہیں لیکن یہ شخص عام حالات میں بھی ابنارمل ہی رہتا ہے۔"

اگروال کی بات پر موتی لال بھان نے بڑی مکاری سے قہقہہ لگایا تھا۔

چائے کی پیالیاں سامنے رکھے دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو رہے تھے اور اسی بے تکلفی ہی میں موتی لال بھان نے بہت سی کام کی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ وہ بڑا گھاگ افسر تھا۔ ایجنسی شاید بہت محنت کے بعد بھی وہ کچھ حاصل نہ کر پاتی جو اس نے ایک ہی نشست سے حاصل کر لیا تھا۔ بھان کو امید تھی کہ چڈھا صاحب بہت خوش ہوں گے۔

لفافہ کرنل شکلا نے بریگیڈیئر رانجن کے سامنے ہی کھولا تھا۔ اس میں سے جو تحریر برآمد ہوئی وہ یہ تھی۔

"کرنل شکلا!

رہائی کا طریقہ یہ ہے تم ہمارے پہلے تین آدمیوں کو راولپور ریسرچ لیبارٹری کے سامنے چھوڑو گے۔ باقی دو کو صدرہ گرلز سکول کے پاس' ان کی رہائی کے ایک گھنٹہ بعد ہم بریگیڈیئر پنڈت کو رہا کر دیں گے۔ ہمارے پلان میں ترمیم کی گنجائش بھی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ پہلے ہمارے پانچوں ساتھیوں کو تم اپنے آفس میں اکٹھا کرو گے۔ یہیں سے انہیں رہائی کے لئے لے جانا ہو گا۔ ہم ابھی وقت نہیں بتا رہے۔ ہمارے ساتھیوں کو ۲۵ تاریخ کی شام پانچ بجے تک اپنے پاس لے آؤ۔ پانچ بجے ہم فون کر کے رہائی کے وقت کا تعین کریں گے۔ کوئی بھی چالاکی تمہارے لئے تباہ کن ہو گی۔ ہماری زندگی کا مقصد ہی شہادت ہے اگر نصیب ہو جائے تو ہمارا مشن مکمل---- لیکن پنڈت مارا گیا تو ساری دنیا میں بھارتی سینا منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی---- اور ہاں راجا صاحب سے کہہ دینا زیادہ ہوشیاری نہ دکھائے۔ وہ ہمارے راستہ میں کانٹے بچھا رہا ہے۔

اللہ ٹائیگرز"

ooo

اگلے ہی لمحے رانجن اپنے ہیڈکوارٹر میں جنرل بھاٹیہ کو تازہ صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

"رانجن! کسی طرح معاملے کو لمبا کرو۔ یوں تو ہم اپنی ہی نظروں میں گر جائیں گے۔ یہ لوگ تو ہمیں پتلیوں کی طرح انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔" جنرل بھاٹیہ نے کہا۔

"سر! جب وہ اپنا راستہ ہی نہیں بتا رہے۔ کسی کو "سودے بازی" کے لئے درمیان لانے پر آمادہ ہی نہیں---- وہ تو ہم سے رابطہ صرف اپنے احکامات ہم تک پہنچانے کے

لئے کرتے ہیں۔ پھر ہم معاملات کو طول کیسے دے سکتے ہیں؟ ایسے خطرناک دہشت گردوں کے متعلق تو میں نے کبھی زندگی میں سنا بھی نہیں تھا۔" اس نے بے بسی کا اظہار کیا۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کمانڈر انچیف کو کیا بتاؤں؟ وہاں جی ایچ کیو کے لوگ سوائے پنڈت کی رہائی کے اور کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں----!" جنرل بھاٹیہ کی آواز سے پریشانی مترشح تھی---- "تم پانچوں مجرموں کو یہاں اکٹھا کرو' مجھے امید نہیں کہ یہ لوگ اس منصوبے پر عمل کریں گے۔ عین ممکن ہے آخری لمحات میں ان کا پلان بدل جائے۔"

"میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا سر!"

"ٹھیک ہے۔ فی الوقت تم ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو لیکن اپنی پوری پوری تیاری رکھنا۔ جن جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہاں ابھی سے اپنے لوگوں کو پھیلا دو۔ رانجن! انہیں بچ کر نہ جانے دینا۔ آدھا گھنٹہ ان لوگوں پر نظر رکھنا کوئی ایسا ناممکن بھی نہیں۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ ہم نے کابینہ کو یقین دہانی کروائی ہے کہ ان لوگوں کو بچ کر نہیں جانے دیں گے۔ تم جانتے ہو اگر ناکامی ہوئی تو راؤ ہمارے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دے گا۔ آج کل وہ یوں بھی پرائم منسٹر کا چہیتا بنا ہوا ہے۔"

"سر! ہم جان کی بازی لگا دیں گے' آپ مطمئن رہیں۔"

جنرل بھاٹیہ کو امید تھی کہ واقعی اس کے ساتھی تخریب کاروں کو بچ کر نہیں جانے دیں گے اور جیسے ہی بریگیڈیئر پنڈت کو رہائی ملی وہ لوگ تخریب کاروں کو چن چن کر مار ڈالیں گے۔ اس نے وزارت داخلہ سے پانچوں قیدی سری نگر کے آرمی انٹیلی جنس آفس میں جمع کرنے کی درخواست کر دی تھی۔

۲۴ تاریخ کی رات تک ان پانچوں کو ملک کی مختلف جیلوں سے نکال کر سری نگر جمع کر دیا گیا تھا۔ صدرہ اور راولپور میں آرمی' را اور آئی بی نے اپنے آدمیوں کا جال بچھا دیا تھا۔ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر فوج نے قبضہ جما رکھا تھا۔

۲۵ تاریخ کی صبح' بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لوگ چکرا کر رہ گئے جب مقبوضہ کشمیر سے نکلنے والے قریباً" سب ہی اخبارات نے اس روز حریت پسندوں کے ساتھ بھارتی حکومت کے معاملات طے پا جانے کی خبریں جاری کی تھیں---- اور یہ سرخیاں جمائی تھیں کہ آج شام کو صدرہ اور راولپور میں قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا جس کے آدھ گھنٹہ بعد حریت پسند یرغمالی فوجی افسر کو رہا کریں گے۔ اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہی سری نگر میں

جیسے ایک طوفان بدتمیزی گھس آیا۔ سری نگر کے گلی کوچوں شہریوں سے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ لوگ جوش جذبات میں نعرے بازی کرنے لگے تھے۔ سارا شہر جشن کا سا سماں پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ نوجوانوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں مختلف حریت پسند جماعتوں کے جھنڈے لہرائے گھوم رہی تھیں۔ اس ہجوم کو کنٹرول کرنا انتظامیہ کے لئے ناممکن تھا۔ اس مرحلے پر فوج کی مداخلت سے حالات ایسے بگڑتے کہ پھر کبھی نہ سنبھل پاتے۔

"ہجوم کو فی الوقت اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے!" یہ تھے وہ سرکاری احکامات جو مرکز نے اس روز جاری کئے۔

حصار ٹوٹتا ہے

ایم آئی فائیو کے تعاون سے جب "را" کا ایجنٹ انکوائری کے سلسلے میں ٹھاکر روندر سنگھ کے گھر پہنچا تو اسے وہاں موجود پایا۔

یہ ان کے لئے چونکا دینے والی بات تھی۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد سے ان لوگوں نے دو تین گھنٹے میں ہی مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں جن کے مطابق ٹھاکر روندر سنگھ نے کبھی پاسپورٹ نہیں بنوایا۔ صرف ایک مرتبہ پاسپورٹ بنوانے کے لئے فارم بھرے تھے جس کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی تو اس نے اپنے ایجنٹ سے فارم کینسل کروانے کو کہہ دیا۔

پاسپورٹ کے اندراج وہی تھے جو سانتا کروز امیگریشن پر لکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے پاسپورٹ پر کوئی اور سفر کر کے بھارت پہنچا ہے اور پاسپورٹ کے حصول کے لئے کاغذات جمع کرواتے وقت صرف تصویریں بدل دی گئی تھیں' باقی سب کچھ وہی تھا۔

شام تک یہ ساری معلومات ٹی پی پر راجا صاحب تک پہنچ گئی تھیں اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ جو شخص ٹھاکر روندر سنگھ کے نام سے بھارت میں داخل ہوا ہے' وہ کوئی تخریب کار ہے اور اسے خصوصی مشن پر یہاں بھیجا گیا ہے۔

عین ممکن ہے اس سازش کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ کارفرما ہو؟ اس نے سوچا۔

"ٹھاکر روندر سنگھ کو ڈھونڈو۔ اگر وہ پاتال کی تہہ میں چھپا ہے تو بھی اسے نکال کر باہر لاؤ۔ اسے ہر صورت تلاش کرو۔ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے----!" اس نے سری نگر سے ہیڈکوارٹر کو حکم جاری کیا۔

یہ حکم بھارت کے چپے چپے پر پھیلے "را" کے ایجنٹوں کو منتقل ہو چکا تھا اور اب وہ لوگ بڑی سرگرمی سے ٹھاکر روندر سنگھ کو تلاش کر رہے تھے لیکن ایک ہوٹل کے بعد اس کا کہیں سراغ ہی نہیں مل رہا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے یہ شخص؟"

یہی تھا وہ اہم سوال جس کا جواب "را" نے بہرصورت تلاش کرنا تھا۔

راجا نے سری نگر میں اپنے ایجنٹوں کی تازہ کھیپ ملک سے لا کر داخل کر دی تھی۔ وہ سب لوگ بڑی سرگرمی سے کسی اجنبی اور غیر ملکی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

اچانک ہی ایک اطلاع نے راجا صاحب کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"سر! کرنل شکلا سات بجے پانچ قیدیوں کو رہا کرنے جا رہا ہے۔ یہ لوگ آرمی انٹیلی جنس کے سیف ہاؤس میں موجود ہیں اور کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔" ایک اہم ذرائع نے اسے مطلع کیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ----!" اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ یہ بیوقوف فوجی بھارت ماتا کی ناک کٹوائے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ یہ اطلاع دہلی میں راؤ کو دے رہا تھا۔

"ہمیں اس پاگل پن کو روک لینا چاہیے سر! ورنہ ہماری ساکھ تباہ ہو کر رہ جائے گی----!" اس نے قریباً چلاتے ہوئے فون پر کہا تھا۔

"راجا---- میں بہت مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا' ساری حکومت پاگل ہو رہی ہے۔" راؤ کا لہجہ بظاہر بڑا پرسکون لیکن اپنے اندر ہزار طوفان چھپائے ہوئے تھا۔

"آل رائیٹ سر!" کہہ کر راجا نے ریسیور ٹوٹے ہوئے ہاتھوں سے کریڈل پر رکھ دیا۔

ooo

ٹھیک سات بجے فون کی گھنٹی بجی تھی----!

کرنل شکلا نے بے چینی سے فون اٹھایا۔

"کرنل فوراً" روانہ ہو جاؤ۔ پانچوں کو لال چوک میں رہا کرنا ہے اکٹھے۔ ہم نے پہلا پلان بدل لیا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کرنل شکلا نے بریگیڈیئر رانجن کی طرف دیکھا جس نے مایوسی سے گردن جھکا لی تھی----!

کرنل شکلا اپنے پانچ جوانوں کے ساتھ پانچ قیدی لے کر آرمی کے ایک چھوٹے ٹرک میں لال چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس ٹرک کا تعاقب بیک وقت آرمی انٹیلی جنس "را" اور آئی بی کے لوگ کر رہے

تھے۔ ہر ایجنسی نے اپنے اپنے آدمی پہلے ہی سے لال چوک میں پھیلا دیئے تھے۔ جب قیدیوں سمیت ٹرک لال چوک میں پہنچا تو وہاں ہزاروں کی تعداد میں موجود کشمیریوں نے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ ان لوگوں نے ٹرک کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہجوم میں موجود سینکڑوں کی تعداد میں موجود پولیس والوں کے کیمرے حرکت میں آ گئے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں موجود انٹیلی جنس کے لوگوں نے رہا ہونے والوں کو اپنی نظروں کے حصار میں جکڑنا چاہا تھا لیکن انہیں کچھ سمجھ ہی نہ آ سکی۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں کے سامنے نوجوانوں کی ٹولیاں ایک ایک رہائی پانے والے حریت پسند کو لے کر غائب ہو گئیں۔ خدا جانے ان لوگوں کو زمین نگل گئی یا پھر آسمان کھا گیا۔

ہجوم کے اندر ہی اندر وہ لوگ ایک ایک کر کے غائب ہو گئے تھے اور سیکورٹی والے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان کی سب تدبیریں دھری کی دھری رہی گئی تھیں۔ کسی ایک پر بھی وہ لوگ نظر نہیں رکھ پائے تھے۔

اب وہاں فلک شگاف نعرے بلند کرتا ہجوم تھا یا پھر ان کی بے بسی پر ماتم کرتی ہوئی برفیلی ہوائیں! مختلف کونوں' کھدروں میں چھپے سیکورٹی کے ملازم اپنی اپنی ایجنسیوں کو واکی ٹاکی پر ناکامی کے پیغامات سنا رہے تھے۔

ooo

امریک سنگھ کے ساتھ پانچوں باری باری بغلگیر ہو رہے تھے----!

اس نے بشیر شاہ کے ساتھ مل کر جس خوبی سے یہ آپریشن مکمل کیا تھا' اس پر وہ لوگ اپنے دلوں میں امریک سنگھ کی لئے احترام اور محبت کے بے پناہ جذبات رکھتے تھے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں وہ انہیں آنے والے حالات کی منصوبہ بندی سے متعلق ہدایات دے رہا تھا جب دوسرے کمرے سے بشیر شاہ نے اس کے لئے فون کی اطلاع دی۔

لندن سے ستنام سنگھ اس سے مخاطب تھا۔

"امریک سیہاں! اپنی شناخت فوراً" بدل لو۔ وہ لوگ یہاں ٹھاکر روندر سنگھ تک پہنچ گئے ہیں۔ ٹھاکر تو محفوظ ہے لیکن ان لوگوں کو علم ہو گیا ہے کہ اس کے پاسپورٹ کو کسی اور نے استعمال کیا ہے---- تم اب ٹھاکر کے نام کو بھول جاؤ۔ جلد ہی ہم دوبارہ رابطہ کریں گے۔ فی الوقت کچھ عرصے کے لئے تمہیں منظر سے ہٹنا ہو گا۔ گور سیوک نے بندوبست کر لیا ہے۔ کچھ عرصے کے لئے تمہیں نیپال میں قیام کرنا ہو گا۔ اس دوران واگھورو سچا بادشاہ کوئی اور بہتر

صورت نکال دے گا۔"

ستنام سنگھ نے اسے لندن کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کامیاب کارروائی پر اپنی اور "سادھ سنگت" کی طرف سے مبارکباد دے دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی مدد کے لئے جلد ہی ایک اور کشمیری ساتھی کو بھی روانہ کر رہے ہیں۔

"ویر جی! میں جانتا ہوں ایسا ہونا ہی تھا لیکن میں بھاگوں گا نہیں---- میں گیدڑ کی زندگی ایک پل کو نہیں جی سکتا۔ میدان جنگ سے باہر نہیں جاؤں گا۔ میں پنجاب کی طرف نکلتا ہوں' باقی جو مہاراج کو منظور ہو----!" اس نے ستنام سے کہا۔

ستنام سنگھ جانتا تھا کہ اسے سمجھانا بے کار ہے اور ایک مرتبہ میدان عمل میں کودنے کے بعد اب امریک سنگھ دوبارہ نہ لوٹے گا جب تک وہ اپنا مشن مکمل نہ کر لے۔ یوں بھی فون پر زیادہ دیر تک بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے معاملات واہگورو کی مرضی پر چھوڑے اور اگلے فون تک "رب راکھا" کہہ کر فون بند کر دیا۔

امریک سنگھ نے فون رکھا تو بشیر شاہ کو سامنے موجود پایا۔

"مجھے علم ہے ویر جی لیکن تم فکر نہ کرنا۔ تم انشاء اللہ یہیں رہو گے۔ میرے خیال میں ان حالات میں دو تین روز تک تمہارا باہر نکلنا یوں بھی مناسب نہیں۔"

امریک سنگھ کو یہ کچھ پسند نہیں تھا کہ وہ اس طرح بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہے لیکن حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ بشیر شاہ اسے زندگی میں پہلا ایسا شخص ملا تھا جس سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ اس نے جس طرح بھارتی انٹیلی جنسوں کو آپس میں ٹکرا کر اپنا الو سیدھا کیا تھا' اس پر امریک سنگھ نے اسے کتنی ہی مرتبہ داد دی تھی۔

تیسرے دن بشیر شاہ نے اس کے لئے جعلی شناخت تلاش کر لی تھی۔ یہ دہلی کی کسی تجارتی کمپنی کا شناخت نامہ تھا جس کے سیلز منیجر کی حیثیت سے وہ یہاں آیا تھا۔ یہ کمپنی عطریات فروخت کرتی تھی اور امریک سنگھ کو اب اسلم خان بنا دیا تھا۔ یہاں سے دہلی تک اس نے اسلم خان کی حیثیت سے سفر کرنا تھا۔

اس نے بشیر شاہ کے متعدد مرتبہ کہنے پر بھی کسی کے ہمراہ جانے کی پیش کش رد کر دی تھی اور کہا تھا کہ وہ امریک سنگھ کی سری نگر سے روانگی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔ بشیر شاہ نے بادل نخواستہ ہی اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

آج اسے رخصت ہونا تھا---- عزیز اسے بس اڈے تک خود چھوڑنے آیا تھا۔ امریک سنگھ نے اپنے بیگ میں عطریات کی مختلف شیشیاں جمع کر رکھی تھیں اور اب وہ اسلم خان کی

حیثیت سے دہلی کی طرف عازم سفر تھا۔ اس نے بس کے ذریعے پہلے جموں جانا تھا جہاں سے اگلا سفر وہ ٹرین کے ذریعے کرنا چاہتا تھا۔

بس سری نگر سے روانہ ہوئی تو آسمان کھل چکا تھا۔ رات کو جمع ہونے والے بادلوں کے ٹکڑے روئی کے سفید گالوں کی طرح آسمان پر بکھر چکے تھے۔ نیلے اور سفید رنگ چمکتی دھوپ میں اپنے تمام تر حسن سمیت اس کی آنکھوں میں گھس آئے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف سرسبز پہاڑی سلسلے میں درختوں پر جمی شبنم قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ شاید کشمیر کے درخت اپنے مکینوں کی قسمت پر نوحہ کناں تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ تھم گئی تھی لیکن سردی اب بھی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ بس کا کنڈیکٹر بار بار ونڈ سکرین کے اندر کی طرف شیشے پر آنے والی نمی کو خشک کرنے کے لئے کپڑے سے صاف کرنے لگتا تھا۔ دھوپ میں چمکتی اوس کے قطرے امریک سنگھ کو تراوٹ اور زندگی کے احساس سے دو چار کر رہے تھے۔

سری نگر سے بس جیسے ہی باہر نکلی۔ سڑک کے دونوں اطراف فوجی ٹرکوں کی قطاریں دکھائی دینے لگیں---- بانہال تک تو کسی نے انہیں کچھ نہیں کہا مگر جیسے ہی وہ لگ درہ بانہال سے باہر نکلے' انہیں جموں کی طرف سے آنے اور سری نگر کی طرف سے جانے والی تین چار بسیں دکھائی دیں۔

بھارتی فوج کے کمانڈوز نے یہاں ڈیرے جما رکھے تھے اور ملٹری انٹیلی جنس بسوں کے ایک ایک مسافر کو چیک کر رہی تھی---- پندرہ بیس منٹ بعد ان کی باری آئی۔ وہ لوگ دس دس مسافروں کو باہر لے جاتے جہاں سیکورٹی والے ان سے سوال و جواب کرتے تھے۔ اس دوران بس کے اندر موجود سامان آرمی کے جوان چیک کرتے رہتے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ایک مدراسی آفیسر نے امریک سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اسلم خان!"

"کیا کام کرتے ہو؟" اگلا سوال ہوا۔

"اس پر لکھا ہے۔" اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

"تم خود نہیں بتاؤ گے؟" مدراسی اب براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"میں کوئی بدمعاش آدمی نہیں ہوں' ایک کمپنی کا سیلز منیجر ہوں۔" امریک تلخی سے بولا۔

"بہت ہوشیار ہو تم----!" مدراسی نے یہ بات اچانک ہی کچھ ایسے انداز سے کہی تھی کہ ایک لمحے کے لئے تو امریک گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے سنبھل کر دریافت کیا۔

"ہم تمہیں تفتیش مکمل ہونے تک اپنا مہمان رکھیں گے۔" اس مرتبہ اس کے سوالوں کا جواب پشت سے ملا تھا۔

امریک سنگھ نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبا تڑنگا شخص سیاہ چشمہ آنکھوں سے لگائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ امریک سنگھ نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے لات گھمائی اور پوری قوت سے پچھلے شخص کے پیٹ میں ماری۔ اس سے پہلے کہ مدراسی آفیسر کا ہاتھ اپنے ہولسٹر تک پہنچے' امریک سنگھ نے اس انداز سے دوسری لات اس کی کنپٹی پر جمائی تھی کہ وہ دوہرا ہو کر پرے جا گرا۔

اب وہ اپنی بس کی آڑ میں سیدھا بھاگ رہا تھا۔ جب تک فوجی صورت حال کو سمجھ کر فائرنگ شروع کرتے وہ سڑک سے ملحق پہاڑی کے گھنے اور سرسبز سلسلے میں آگے ہی آگے بھاگتا چلا گیا۔

گولیاں درختوں کے پتوں پر اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ امریک سنگھ منجھے ہوئے کمانڈوز کی طرح جھک جھک کر گھنے درختوں اور جنگلی گھاس کے اندر ہی اندر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

موت اس کا تعاقب کر رہی تھی اور----

بھاگتے بھاگتے کبھی کبھی وہ مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا تھا۔

اس کے تعاقب میں آنے والوں کے فوجی بوٹوں کی دھمک سے پہاڑی لرزنے لگی تھی لیکن کوئی اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

تعاقب میں آنے والے پیشہ ور کمانڈوز تھے اور وہ رک رک کر فائرنگ کر رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے کیپٹن امریک سنگھ کے ساتھ ساتھ تعاقب کرنے والوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ کسی عام سے دہشت گرد سے نہیں' یہ شخص کوئی منجھا ہوا تخریب کار دکھائی دیتا ہے۔

"پہاڑی کو گھیر لو---- اسے بہرصورت زندہ گرفتار کرنا ہو گا۔"

یہ تھا وہ حکم جو "را" کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی طرف سے مقامی کمپنی کمانڈر کو موصول ہوا تھا۔

کمپنی کمانڈر جس کی ذمہ داری تھی کہ ایک ایک لمحے کی رپورٹ "را" کو پہنچاتا رہے'

نے فوراً" ہی ڈپٹی ڈائریکٹر راجا سے رابطہ قائم کیا تھا۔ "اسے زندہ گرفتار کرنا ہے----" راجا صاحب کا یہ حکم اس نے چیخ چیخ کر ان کمانڈوز کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کی تھی جس کے لئے اسے بیٹری سے چلنے والے ا۔سمپلی فائر کا سہارا لینا پڑا تھا۔

یہ آواز جس نے پہاڑی سلسلے میں گونج پیدا کر دی تھی اور کسی کے کانوں تک پہنچ پاتی یا نہیں---- امریک سنگھ نے ضرور سن لی تھی۔

"سالو! تم مجھے کیا زندہ گرفتار کرو گے۔ میں زندہ تمہارے ہاتھ آؤں گا ہی نہیں۔" اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

قمیص کے کالر میں چھپے زہریلے کیپسول کو اس نے بھاگتے بھاگتے ہاتھ سے چھو کر اس کی موجودگی کا دوبارہ احساس کر لیا تھا۔ جب تک یہ زہریلا کیپسول اس کی گرفت میں تھا' تعاقب میں آنے والے اسے زندہ گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔

آج اس کا دل اپنے دوست کیپٹن ستنام سنگھ کو بار بار داد دے رہا تھا جس نے اسے انگلینڈ کے تربیتی کیمپ میں بھیج کر گویا ایک مرتبہ پھر اس کے جسم میں نیا خون دوڑا دیا تھا۔

آج کمانڈر سٹیفی کے بتائے ہوئے سارے داؤ اس نے ایک ایک کر کے آزما لئے تھے۔

اسے تو تعاقب میں آنے والے کتوں کو غلط راستے پر ڈالنے کی تربیت دی گئی تھی' یہ بے چارے تو پھر انسان تھے۔

آدھ گھنٹہ مسلسل پہاڑیوں میں چکر لگانے کے بعد امریک سنگھ کو احساس ہونے لگا تھا جیسے واقعی اس نے دشمن کو چکر میں ڈال دیا ہے۔ فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی لیکن رک رک کر----!

فائرنگ کی آوازوں سے امریک سنگھ جیسا پیشہ ور فوجی اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نے تعاقب میں آنے والوں کو کم از کم اپنی سمت بھلا دی ہے۔ اب وہ لوگ صرف اندازے سے ہی اس کے پیچھے آ رہے تھے۔

کشمیر کی سرسبز پہاڑیوں نے اس پر اپنا دامن وا کر دیا تھا---! گھنے درختوں کے اندر ہی اندر وہ اطمینان سے راستہ بناتا چلتا چلا جا رہا تھا۔

قسمت شاید اس پر زیادہ ہی مہربان ہونے لگی تھی کہ جب اچانک گھنے بادلوں نے مشرق کی سمت سے اس طرف یلغار کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سیاہ ہونے لگا تھا۔

شاید فلک نے بھارتی فوجیوں کی بدبختی کا ماتم شروع کر دیا تھا چونکہ اچانک ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔

ooo

یہ بارش یہاں کوئی نئی انہونی بات نہیں تھی۔ یہاں کا معمول تھا لیکن اس بارش پر سب سے زیادہ غصہ ان کمانڈوز کو آ رہا تھا جنہوں نے پہلے ہی امریک سنگھ کی سمت کھو دی تھی۔

وہ لوگ اندازے سے پہاڑیوں کو گھیرے میں لے رہے تھے لیکن میلوں پھیلے ہوئے اس جنگلی سلسلے میں وہ کوئی کارنامہ انجام دینے سے قاصر تھے۔ بادلوں نے ایسے آسمان کو ڈھانپا تھا کہ اندھیرا آسیب کی طرح زمین پر اتر آیا----

تعاقب کرنے والوں کے پاس شاید ٹارچیں موجود نہیں تھیں' اسی لئے وہ رک گئے۔ اب یہ لوگ بکھر کر اندازے سے اس علاقے کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ پندرہ بیس فوجیوں پر مشتمل اس دستے کے پاس کوئی وائرلیس سیٹ بھی نہیں تھا کہ پیچھے آنے والوں کو اگلی صورت حال سے آگاہ کر کے انہیں سارے علاقے کو گھیرے میں لے لینے کا مشورہ دے سکتے۔

موسم کے تیور اتنے اچانک بدلے تھے کہ وہ سب چکرا کر رہ گئے---- اس صورت حال کا واحد حل یہی تھا کہ وہ اپنی اپنی جگہ دبک کر بیٹھ جاتے اور اس طرح گھات میں بیٹھے امریک سنگھ کے اس جال میں پھنسنے کی بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگتے----

انہوں نے ایسا ہی کیا---- یہ الگ بات کہ آج کوئی دیوی یا دیوتا ان کی پرارتھنا سننے کے لئے فارغ نہ تھا۔

دو تین گھنٹے ہونے کو آ رہے تھے اور بارش کا زور تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ مقامی کمپنی کمانڈر جانتا تھا کہ اس نوعیت کی بارش چھاجوں برسا کرتی ہے۔

"را" اور ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ وقفے وقفے سے فون کر کے ان سے تازہ ترین صورت حال دریافت کر رہے تھے لیکن وہ انہیں "ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی----!" کے علاوہ اور کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"یہ لوگ کیا ڈھائی تین گھنٹے سے جھک مار رہے ہیں۔ ابھی تک ایک تخریب کار بھی پکڑا نہیں جا سکا ان سے----!" بالآخر بریگیڈیئر رانجن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"سر! بارش اور اندھیرے میں تعاقب ممکن نہیں رہا ہو گا۔" اس نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

"نان سینس! تم فوجی ہو یا گدھے---- ان کے پاس کیا ہنگامی ضروریات کے لئے ٹارچیں نہیں تھیں۔" دوسری طرف سے پھر رانجن نے چیخ کر دریافت کیا۔

"سر! دھوپ نکلی ہوئی تھی جب وہ ہماری گرفت سے نکل کر بھاگا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ! تم نے اس کو جانے ہی کیوں دیا' گولی مار دیتے۔"

"سر! راجہ صاحب نے سختی سے اسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا راجہ صاحب---- فوراً اپنے جوانوں کو حکم دو کہ اس سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیں۔ اگلی پوسٹوں کو خبردار کر دو۔ میجر! اگر یہ آدمی زندہ یا مردہ ہمارے ہاتھ نہ آ سکا تو تمہاری بدبختی آ جائے گی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔" بریگیڈیئر رانجن نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

"او کے سر! میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ مطمئن رہیے۔" اس کے جواب پر دوسری طرف سے طنزیہ ہنسی سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ooo

جس لاری سے امریک سنگھ سفر کر رہا تھا' اسی بس کی آخری سیٹ کے ایک کونے میں بیٹھے ایک مسافر نے بڑی گہری نظروں سے صورت حال کا جائزہ لیا تھا۔ اس نے امریک سنگھ کو بھاگتے اور پھر فوجیوں کو اس کے تعاقب میں لپکتے دیکھ لیا تھا۔

بس تھوڑی دیر کے بعد اپنی منزل پر روانہ ہو گئی لیکن مسافر کی بے قراری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یہ ہاشم تھا----!

اسے بشیر شاہ نے بطور خاص امریک سنگھ پر جموں تک نظر رکھنے کی ہدایت کے ساتھ ہی اس بس میں سوار کروایا تھا۔ ہاشم نے ایک طرح سے چھپ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرنی تھی لیکن یہاں صورت حال اتنی اچانک اور تکلیف دہ ہو گئی تھی کہ اس کے لئے مدد کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا----!

آدھ گھنٹہ تک بس روک کر آرمی والوں نے دوبارہ اس بس میں سوار ایک ایک مسافر کو اپنی تسلی کے مطابق چیک کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی۔ ہاشم کے لئے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ اس آدھ گھنٹے میں کم از کم اس نے امریک سنگھ کو زندہ یا مردہ یہاں نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فی الوقت وہ محفوظ ہے----!

اس اثناء میں وہاں فوجیوں کو اس نے بڑی افراتفری کے عالم میں دیکھا----!

ان کا کمانڈر وائرلیس سیٹ کے سرہانے کھڑا تھا۔ یہ سیٹ بس سے کچھ فاصلے پر ایک لکڑی کی میز پر دھرا تھا۔

بانہال سے نکلتے ہی جب ہاشم نے بادلوں کے گالے آسمان پر اڑتے دیکھے تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بارش تھوڑے وقفے کے بعد پھر شروع ہو گئی ہے۔ گھنے جنگل اور پہاڑی سلسلے میں یہ کالی سیاہ گھٹائیں اس کے نزدیک امریک کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھیں۔

بٹوٹ پہنچ کر وہ بس سے اتر گیا----!

اسے سفر بھی یہیں تک کرنا تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ ان کے ایک اور مجاہد ساتھی نے لینی تھی جو بس سٹینڈ پر ٹکٹ خرید کر اس بس کا منتظر تھا۔

جیسے ہی ہاشم بس سے باہر نکلا اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں دیرینہ آشناؤں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر بغلگیر ہو گئے۔ بغل گیر ہوتے ہی ہاشم نے اپنے ساتھی کے کان میں وہ مخصوص لفظ کہہ دیا تھا جو اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا سکتا۔

دونوں باتیں کرتے باہر آ گئے----!

راستے میں ہاشم نے اسے امریک سنگھ پر ٹوٹنے والی قیامت کی مکمل تفصیلات فراہم کر دی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ تم فوراً" ٹیلی فون پر بشیر شاہ کو مطلع کرو۔ مجھے جموں تک سفر کرنا ہے۔ اگر ٹکٹ خرید کر بھی میں نے سفر نہ کیا تو کوئی نیا خدشہ ان لوگوں کے ذہن میں سر نہ اٹھا لے۔" منتظر ساتھی نے ہاشم کو ہدایت کی۔

بس نے اس اثناء میں روانگی کا ہارن بجا دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اس کا ساتھی بس کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہاشم نے مقامی بازار کا رخ کیا تھا۔ اس کی جہاندیدہ نظروں سے ایک کونے میں موجود سی آئی ڈی کا وہ اہلکار پوشیدہ نہیں رہا تھا جس نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے یہاں تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

شاید بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ اس بس کے تمام مسافروں کی آخری لمحات تک نگرانی کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ہاشم کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ خوامخواہ سی پھیل گئی۔ بٹوٹ اس کے لئے اجنبی شہر نہیں تھا۔ یہاں اس کے رشتے کا ایک چچا رہتا تھا جس سے ملنے وہ اکثر جایا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے بظاہر یہی بہانہ ذہنی طور پر تیار کیا تھا اور اس کا رخ اپنے چچا کے گھر کی طرف تھا۔

اپنے چچا کے گھر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ٹیلی فون پر سری نگر سے سلسلہ ملایا اور چند منٹ بعد ہی وہ تمام واقعات کی اطلاع سری نگر پہنچا چکا تھا۔ بشیر شاہ نے براہ راست اس

کا پیغام موصول کیا تھا----!

تفکر کی لکیریں اس کے کشادہ ماتھے پر گہری ہونے لگی تھیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچا' پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔ اب وہ اپنے ایک خفیہ مرکز کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے ہر ممکن حفاظتی اقدام کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی خطرہ مول لیا جائے۔

بشیر شاہ کی ہدایات پر مجاہدین کشمیر نے محض آدھ گھنٹے میں اپنے موجودہ ٹھکانے تبدیل کر لئے تھے اور وہ لوگ متبادل محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکے تھے۔

بشیر شاہ نے اگلے روز تک کسی نئی اطلاع کا انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فی الوقت وہ یورپ میں ٹیلی فون کر کے ان لوگوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

شبِ زنداں کے اسیر

والش کو جیل سے رہا ہوئے ابھی پندرہ بیس روز ہی گزرے تھے۔ اس مرتبہ اس نے ت سال کی مسلسل قید کاٹی تھی۔

وہ ایک پیشہ ور قاتل تھا اور بڑے بڑے لوگ اسے بڑی بڑی رقمیں دے کر اس سے ے اہم کام لیا کرتے تھے۔ والش نے کبھی چھوٹا ہاتھ نہیں مارا تھا۔ اپنی دانست میں وہ بڑا ہشیار مجرم تھا لیکن ایک روز برطانوی پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ ہی لیا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے ہوشیار وکیل نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا بہتر ستعمال کرتے ہوئے اسے لمبی قید سے بچا لیا تھا۔ والش منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ اس نے جیل وں کو اپنے روپے سے کبھی شاکی ہونے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا اور جیسے تیسے زندگی کے ت سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے کاٹنے کے بعد بالآخر رہا ہو کر باہر آ گیا۔

جیل میں ہی اسے اپنی محبوبہ کی بے وفائی کی اطلاع مل گئی تھی جس نے اس کے دوست یڑ ماؤتھ کے ساتھ رنگ رلیاں منانا شروع کر دی تھیں۔ والش نے عہد کیا تھا کہ وہ جیل ے رہا ہوتے ہی دونوں کو قتل کر دے گا۔ اب اس کی زندگی کا صرف یہی ایک مقصد رہ گیا ۔ سات سال سے وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

جیل سے رہائی پر اسے اطلاع ملی کہ دونوں گلاسگو سے غائب ہو چکے ہیں۔ والش جرم کی ا کا باشندہ تھا۔ پندرہ بیس روز کی جستجو کے بعد اس کو علم ہو گیا کہ اس کے دونوں شکار ن میں ہیں۔

آج کل وہ لندن میں دیوانہ وار انہیں تلاش کر رہا تھا۔ یہاں اس کی کوئی خاص شناسائی ں تھی نہ ہی لندن پولیس کے پاس اس کا کوئی باقاعدہ ریکارڈ موجود تھا۔ یوں بھی وہ بڑی ہشیاری سے گلاسگو کی پولیس کو جل دے کر وہاں سے نکلا تھا۔

لندن وہ آ تو گیا تھا لیکن پیسے کے ہاتھوں خاصا پریشان تھا۔ جرم کی دنیا میں دوستوں کی ی یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو ایک آدھ شناسا موجود تھا' اس نے ابتدا میں تو اس کی

کچھ مدد کر دی' اس کے بعد آنکھیں پھیر لیں۔

آج کل والش کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔ وہ چاہتا تو کسی بھی وقت کوئی بھی کارنامہ کر دکھاتا اور ایک معمولی واردات ہی اس کا معاشی مسئلہ حل کر دیتی لیکن والش اپنا مشن مکمل کرنے سے پہلے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔۔۔!

اس نے ساؤتھ ہال کے براڈوے پر ایک دوکان پر دو تین گھنٹے کی جاب تلاش کر لی تھی اور یہاں سے فراغت کے بعد اپنے شکار کی تلاش میں نکل جایا کرتا تھا۔ شب گزاری کے لئے اس کے ایک دوست نے اپنے فلیٹ کا ایک کمرہ اسے دے رکھا تھا۔

اس روز والش ایک گھٹیا سے "پب" میں بیٹھا شراب سے اپنا غم غلط کرنے میں کوشاں تھا کیونکہ اس کے دوست نے بھی کسی آمدہ خطرے کی بو سونگھ کر اسے ٹھکانہ تبدیل کر لینے کی ہدایت کی تھی اور اب اس نے تنگدستی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بادل نخواستہ کچھ کر گزرنے کی ٹھان لی تھی۔

لیکن وہ کیا کرے؟

یہ بڑا پریشان کن مسئلہ تھا۔

اس وقت وہ شراب خانے سے اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا جب اس نے اپنے ایک کندھے پر ایک مشفقانہ دباؤ محسوس کیا۔ والش نے گردن گھما کر دیکھا اور ایک ایشیائی کو مسکراتے ہوئے پایا۔

"ہیلو مسٹر والش!" اس نے والش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

والش نے بڑی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور ڈھیلا سا ہاتھ تھما دیا۔

"تم مجھے نہیں جانتے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے' میں جانتا ہوں۔ میں بھی تمہاری دنیا کا مکین ہوں اور تمہاری یہ حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ ایک کام ہے میرے پاس تمہارے لئے۔۔۔ بڑا کام۔۔۔ تمہارے شایان شان۔۔۔ اگر مناسب سمجھو تو ہم کسی اور جگہ بیٹھ کر بات کر لیں۔۔۔!" اس نے ایک ہی سانس میں والش کو بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

○○○

والش نے ایک لمحے کے لئے سوچا' پھر خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

"او کے!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پراسرار اجنبی اس کے ساتھ "پب" کے نزدیکی پارکنگ تک آیا پھر دونوں اس کار میں بیٹھ گئے جو اجنبی یہاں کھڑی کر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مڈل سیکس کے ایک شاندار ہوٹل میں موجود تھے۔ ایشیائی جس نے اپنا نام "خان" بتایا تھا' اس کے لئے پر تکلف کھانے کا آرڈر دے چکا تھا۔

"ویل مسٹر خان! اب دھندے کی بات ہو جائے۔" والش نے کھانا کھاتے ہوئے اسے کہا۔

"اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ یہ جگہ ایسی باتوں کے لئے بہرحال غیر محفوظ ہے۔ ہم یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جائیں گے اور وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

والش نے ایک نظر اس پر ڈالی اور مسکرا کر گردن جھکاتے ہوئے پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

آج اس نے بڑی دیر بعد اتنا پر تکلف کھانا کھایا تھا۔ اب دونوں اس ہوٹل کی تیسری منزل کے ایک کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ کمرے میں ان کا استقبال جس خاتون نے کیا اس کے سراپے پر ایک نظر پڑتے ہی والش کو اپنے خون میں بجلیاں کوندنے کا احساس ہوا۔

"سوزین۔۔۔۔ مائی سیکرٹری! اگر ہمارا سودا پٹ گیا تو تمہاری سیکرٹری بھی یہی ہو گی۔۔۔!" خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے والش کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

سوزین اس اثناء میں کمر لچکاتی کسی کام کا بہانہ کر کے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

والش بے بسی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہ گیا۔

"مسٹر والش! میں کسی تعارف کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہیں بھی کام سے مطلب رکھنا چاہیے۔ ایک آدمی کو قتل کرانا ہے اور ہم تمہیں اس کا ۲۵ ہزار پونڈ تک معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔۔۔۔!" خان نے اچانک ہی یہ بات کہہ کر اسے چونکا دیا۔

"آدمی کون ہے؟" والش نے بھی لگی لپٹی بغیر سیدھی بات کرنا مناسب سمجھا۔

"عام آدمی ہے۔ بوڑھا بزنس مین۔ اس کے گھر میں ایک بوڑھی عورت ایک جوان لڑکی اور ایک آدھ نوکر کے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"تم جانتے ہو میرا اصول! میں گاہک سے پہچان کے بغیر سودا نہیں کیا کرتا۔" والش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مسٹر والش اس دھندے میں مار وہی لوگ کھاتے ہیں جو لگے بندھے اصولوں سے چمٹے رہیں۔ تمہیں کام سے غرض ہونی چاہیے۔ ہم تمام رقم ایڈوانس دے دیں گے۔" خان کا

آخری فقرہ چونکا دینے والا تھا۔

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کام نہ ہو سکے!" والش نے اسے کریدا۔

"اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ صورت حال کا جائزہ لے لو لیکن فیصلہ کرنے کے بعد اس سے پیچھے ہٹنا ہمارے لئے ممکن ہو گا نہ تمہارے لئے!" خان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

والش نے سگریٹ سلگا کر اس کے دو تین گہرے کش لئے۔ اتنی بڑی رقم اگر ہاتھ لگ جائے تو وہ سوسن اور پیٹر ماؤتھ کو زمین کی ساتویں تہہ سے بھی باہر نکال سکتا ہے۔ اس نے ہامی بھر لی۔ اس کے ساتھ ہی خان نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

والش نے لفافہ کھولا۔ اس میں آنند بخشی کی تازہ تصویریں' اس کے ٹیلی فون نمبر' ممکنہ ٹھکانے' گھر کا ایڈریس' آنے جانے کے راستے' دفاتر اور گھر سے فرار ہونے کے بعد فرار کے مختلف راستوں کا تفصیلی ذکر موجود تھا۔

"مجھے سودا منظور ہے لیکن اس کے لئے مجھے برمنگھم جانا ہو گا۔" والش نے کہا۔

"ہمیں علم ہے۔ سوزین تمہارے ساتھ رہے گی۔ تم دونوں میاں بیوی کی حیثیت میں برمنگھم جاؤ۔ ہم وہاں تمہارے ایک ہفتے تک قیام کے مکمل اخراجات برداشت کریں گے۔" اس نے سوزین کے ذکر پر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے----!" والش کو اور کیا درکار تھا۔

○○○

رات گئے خان واپس چلا گیا۔

اس اثناء میں سوزین وہاں آ گئی تھی۔ خان نے دونوں کا بھرپور تعارف کرواتے ہوئے سوزین کو بتا دیا تھا کہ اسے ایک ہفتے تک کیا ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بھی مختصراً سمجھا دیا تھا کہ انہیں کن ناموں اور کس بھیس کے ساتھ لوگوں سے ملنا ہے۔

خان وہاں سے چلا گیا تھا۔ روانگی پر اس نے ایک ہزار پونڈ والش کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ اپنا حلیہ بہتر بنانے کا بندوبست کرے۔ ساری رات والش اور سوزین ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے اور صبح دیر گئے تک لمبی تان کر سو رہے۔

اگلے روز وہ کار میں برمنگھم کی طرف عازم سفر تھے۔ سوزین نے ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال رکھی تھی۔ برمنگھم کے علاقے "سالٹلی" میں پہلے ہی سے ایک مکان ان کے لئے موجود تھا۔ سوزین کار کو سیدھے یہاں لائی تھی۔

مکان کا دروازہ اس نے اپنے پاس موجود کنجی سے کھولا تھا۔ اندر ہیٹر جل رہے تھے اور ضروریات زندگی کی ہر شے موجود تھی۔ والش کو اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی منظم گروہ ہے جسے دھوکا دینا آسان نہیں لیکن یہ بات اسے سمجھ نہ آ سکی کہ آخر ان لوگوں کو اس کی اصلیت کا علم کیسے ہوا ہو گا۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو رہا کہ ان لوگوں کے ہاتھ اگر اتنے لمبے ہیں تو اس کے متعلق جان لینا بھی ان کے لئے ممکن ہے۔

یوں بھی والش کو آج کل پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ ان کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

سوزین نے اس کے اور اپنے لئے کافی کے دو مگ تیار کر دیئے تھے۔ کافی کی چسکیاں لیتا ہوا وہ برمنگھم کی روڈ گائیڈ کا بھی تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے یہ شہر اس سے پہلے متعدد مرتبہ دیکھا تو تھا لیکن یہاں قیام کرنے کا موقع کبھی نہ ملا تھا۔

کافی کا مگ ختم کر کے اس نے "روڈ میپ" ہاتھ میں پکڑا۔ سوزین سے کار کی چابی مانگی اور دوسرے ہی لمحے وہ کار کو برمنگھم کی سڑکوں پر دوڑا رہا تھا۔ خان اسے کسی بڑے گروہ کا فرغنہ ہی لگا تھا۔ یہ لوگ اتنے پراعتماد تھے کہ سوزین نے چابی اسے تھمانے میں ایک لمحے کا توقف بھی نہیں کیا تھا۔

شاید وہ جانتے تھے کہ والش اب انہیں دھوکہ دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔

شام ڈھلنے تک اس نے گاڑی کی پٹرول کی ٹینکی قریباً" خالی کر دی تھی لیکن اس دوران وہ آنند بخشی کے گھر کے چاروں اطراف سے نکلنے والی سڑکیں' متبادل محفوظ اور غیر محفوظ راستوں کا عملی طور پر جائزہ لے چکا تھا۔

گھر واپسی پر اس نے سوزین کو اپنا منتظر پایا----!

اگلے روز سوزین نے اسے گھر کی چابیاں دے دی تھیں اور کہہ دیا تھا کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کے علاوہ وہ اس سے رابطہ نہیں کرے گی۔ والش چار روز تک جی بھر کے سویا' پیا' موج اڑائی لیکن اپنے کام سے غافل نہیں رہا۔ اس نے اس درمیان بخشی کی نقل و حرکت' معمولات اور عادات کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا اور اپنا لائحہ عمل بھی مرتب کر لیا تھا۔

اس علاقے میں جہاں بخشی رہتا تھا گو کہ پولیس کی گشت نہ ہونے کے برابر تھی' اس کے باوجود بخشی نے کوئی گارڈ بھی نہیں رکھا ہوا تھا یا اگر ایسا تھا بھی تو کم از کم ابھی تک والش اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔

ooo

پانچویں روز سوزین نے خان کو والش کے فیصلے سے مطلع کر دیا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اس "ویک اینڈ" پر وہ اپنا کام کرے گا۔۔۔۔! خان نے اسے ہدایات دے کر فون بند کر دیا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے "آقاؤں" سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس مرتبہ معمولی سی کوتاہی پر بھی کتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے اور اس کیس سے اس کا مستقبل بلکہ کسی حد تک زندگی بھی وابستہ تھی۔

اسی روز سوزین نے والش کو ۲۵ ہزار پونڈ کی ادائیگی اس کے بتائے ہوئے طریق کار کے مطابق کر دی تھی۔ مکان سے والش نکل گیا تھا اور اس نے ایک ہوٹل میں "پے انگ گیسٹ" کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں میں اس نے اپنی داڑھی اور مونچھیں اتنی بڑھا لی تھیں کہ اب بہت غور کرنے پر ہی اس کا کوئی شناسا اسے پہچان سکتا کیونکہ اس نے اپنے سر کے بالوں کا رنگ بھی تبدیل کر لیا تھا۔

آج ہفتے کی شام تھی اور بخشی اپنے من پسند شراب خانے میں شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ مہینے کے آخری ہفتے میں وہ اکثر کسی بڑے شراب خانے میں اپنے دوستوں کو مدعو کیا کرتا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے احتیاطاً" اس نے شراب و شباب کی دعوتوں کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی نفسیاتی کیفیت تھی۔ ذہنی طور پر اس نے ابھی تک حالات کی ستم ظریفی سے مفاہمت نہیں کی تھی۔ جب سے عدالت میں اس کی بیٹی نے خورشید کے ساتھ شادی کا بیان دیا تھا' مقامی ہندوؤں نے اس کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بھارتی ہائی کمیشن کے لوگوں نے اسے معاشرتی زندگی سے کاٹ پھینکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

زندگی اس کے لئے اجیرن بن کر رہ گئی تھی۔ وہ لوگ جو اس کے دستر خوان پر پلتے تھے' اس کی طرف منہ کر کے تھوکنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ اس صورت حال نے اسے ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔

اس وقت وہ شراب کے نشے میں دھت اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور اس کا انتظار کرتے کرتے اونگھنے لگا تھا۔ اگر وہ بیدار بھی ہوتا تو اسے کبھی علم نہ ہو پاتا کہ گاڑی کے ساتھ کیا قیامت گزر گئی ہے۔

پارکنگ کے دوسرے کونے میں اپنی گاڑی میں بظاہر اونگھتے ہوئے والش نے اس پر نظریں جما رکھی تھیں۔ جیسے ہی اس نے ڈرائیور کو کار سے نکل کر شراب خانے کی طرف

جاتے دیکھا' ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر چپک گئی۔

بخشی کا ڈرائیور شاید ایک پیگ لگانے کے لئے گاڑی سے اتر گیا تھا۔ اس کی اسے اپنے باس کی طرف سے اجازت تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے اوورکوٹ کی جیب میں موجود پستول کو تھپتھپا کر اس کا جائزہ لے لیا تھا۔

ooo

جیسے ہی وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلا' والش بلی کی طرح دبے پاؤں اپنی کار سے برآمد ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا اس طرف آنے لگا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں الو کی طرح چمکتی ہوئی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ اس کی چھٹی حس مکمل بیدار تھی۔ تیز بارش ہوا کے قہر سے بچنے کے لئے اس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کئے ہوئے تھے اور سر پر ٹوپی جما رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی لمبی جیبوں میں تھے۔

یہ ہاتھ بخشی کی کار کے نزدیک برآمد ہوئے اور اس نے ایک بڑے میگنٹ سے منسلک چھوٹی سی ڈبیا کار کے پچھلے حصے کے نیچے چپکا دی تھی۔ اس عمل میں بمشکل دو منٹ لگے تھے۔

دو منٹ میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ اپنی گاڑی میں دوبارہ آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کی لائٹ اس نے بجھا رکھی تھی۔ بخشی کا ڈرائیور جلدی واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ سلگا رکھا تھا۔

والش کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس نے بخشی کو لڑکھڑاتے ہوئے اسی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ اپنی گاڑی کو پارکنگ سے باہر نکال رہا تھا۔

یہ گاڑی اس نے دو روز پہلے ہی سیل میں دو ہزار پاؤنڈ میں خریدی تھی۔ اس نے اپنا نام و پتہ طے شدہ منصوبے کے مطابق غلط لکھوایا تھا۔ پارکنگ سے باہر آ کر سنسان سڑک کے کنارے اس کی گاڑی رینگنے لگی۔

رات ایک پہر بیت چکی تھی۔

بخشی کی گاڑی شراب خانے کی پارکنگ سے باہر نکلی اور برق رفتاری سے اس کی گاڑی سے آگے نکل گئی۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان بمشکل بیس پچیس گز کا فاصلہ قائم ہوا تھا کہ والش نے اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ پر سے سرخ بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی برمنگھم کی فضا ایک زوردار دھماکے سے لرز اٹھی۔

بخشی کی کار کے پرخچے اڑ گئے۔۔۔۔!

کار کے جلتے ہوئے ٹکڑے پندرہ بیس گز دور تک جا گرے تھے۔ والش نے گاڑی چند قدم آگے بڑھائی اور اسے تیزی سے ایک گلی میں گھمایا۔ اس گلی کا خاتمہ ایک بڑی سڑک پر ہوا۔ سڑک تک پہنچنے کے لئے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس سے ٹریفک سگنل کا سامنا نہ ہو۔ اس کے لئے اس نے پہلے سے خاصی تیاری کر رکھی تھی۔

والش نے اس طرح سات آٹھ سڑکیں بڑے اطمینان سے عبور کیں۔ اس نے ایسا راستہ اپنایا تھا کہ پولیس کی کسی گشت کرنے والی گاڑی سے اس کا سامنا ہی نہ ہو سکے۔ یوں بھی وہ شراب خانے کی اس سمت میں جا رہا تھا جدھر سے واپس اس طرف آنے کے لئے راستہ یک طرفہ تھا۔ وہ جانتا تھا دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی اس علاقے میں گشت کرنے والی پولیس کی تمام گاڑیاں جائے حادثہ پر اکٹھی ہو جائیں گی۔

اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑا پیچ دار راستہ اختیار کیا تھا۔ مہمان خانے میں وہ اپنے معمول کے مطابق پہنچا تھا اور یہاں کے مکینوں میں سے کوئی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے۔

مہمان خانے کے ایک کونے میں موجود ٹیلی فون باکس سے اس نے کام مکمل ہونے پر سوزین کے فراہم کردہ ایک نمبر پر فون ملایا۔ دوسری طرف سے متعلقہ جواب ملنے پر اس نے صرف یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ "آپ کا کام ہو گیا ہے' اجازت دیجئے۔"

اب وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں شراب سے جی بہلا رہا تھا۔ صبح اس نے سب سے پہلے اپنا حساب بے باک کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

○○○

رات کے دو بجنے کو تھے جب بھارتی ہائی کمیشن کے ایک انڈر سیکرٹری کی خواب گاہ میں موجود فون کی گھنٹی بجی۔ سیکرٹری شاید اسی فون کا منتظر تھا۔۔۔ اس نے اپنے پہلو سے لپٹی فاحشہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

"سر! کام ہو گیا۔۔۔۔!"

دوسری طرف خان اس سے مخاطب تھا۔

اشوک ہی "خان" کے روپ میں والش سے ملا تھا۔ اس مرتبہ "را" نے بہت احتیاط سے منصوبہ بندی کی تھی کیونکہ پے در پے شدت سے ان لوگوں نے کشمیری حریت پسندوں کے ہاتھوں زک اٹھائی تھی' اس کا انتقام لینا ناگزیر تھا۔ یہ اب ان لوگوں کی عزت کا مسئلہ بن

تھا اور اس مرتبہ آنے والا "انڈر سیکرٹری" کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس نوعیت کے سیکرٹری کو "را" بڑے نازک مواقع پر ہی میدان میں اتارا کرتی تھی۔ ڈائریکٹر راؤ نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس ذلت کا بدلہ نہ لیا گیا تو وہ اپنی اگلی نوکری میں کبھی اعظم کا سامنا نہیں کر سکے گا۔

"انڈر سیکرٹری" کا اپنا کام کرنے کا طریقہ تھا۔ وہ اپنے کام میں ہائی کمیشن کو کبھی ملوث کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے۔

"تھینکس!" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

○○○

برطانوی پولیس کے اعلیٰ حکام موقعے پر پہنچے تھے۔۔۔۔!

انہوں نے تباہ شدہ کار کے مختلف ٹکڑے تجزیاتی جائزوں کے لئے لیبارٹری میں بھیج تھے۔ بخشی اور اس کے ڈرائیور کے جسم ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ ان کے جسم کے ٹکڑے بیس پچیس گز دور دور تک بکھر گئے تھے۔

پولیس کی رپورٹ کے مطابق کار کا انتہائی طاقت ور اور جدید ترین ریموٹ بم کے ذریعے تباہ کیا گیا تھا۔ جب پولیس حکام اس شراب خانے میں اس رات آنے والے لوگوں کو تلاش کر رہے تھے' والش واپس لندن پہنچ چکا تھا۔ برمنگھم سے ودلور ہمپٹن پہنچا تھا جہاں اپنی کار اس نے کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر میں پھینک دی تھی جو کاروں کا قبرستان بنا ہوا تھا۔ کسی کو جانے اس سے پہلے کتنی ایسی کاریں لوہے کی پچکی ہوئی چادروں میں تبدیل ہو کر پڑی تھیں۔ والش کی آنکھوں کے سامنے کرین مشین نے اس کی گاڑی اٹھا کر اتنی بلندی سے پھینکی تھی کہ اب اس کا نام و نشان بھی ڈھونڈنا ممکن نہ رہتا۔

کاغذات اس نے جلا کر راکھ کر دیئے تھے اور ایک مرتبہ پھر لندن کی گلیوں میں نئے اور دلولے کے ساتھ اپنے شکار ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

○○○

بخشی کی موت پر کشمیر فریڈم موومنٹ کی طرف سے ایک بیان اخبارات کو جاری کیا گیا میں کہا گیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس کی کارروائی ہے اور برطانیہ جیسے آزاد اور جمہوری میں بھارتی ہائی کمیشن کی اس حرکت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ان بیانات میں یہ بھی عائد کیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت نے بھی بھارتی ہائی کمیشن کو کھل کھیلنے کی کھلی دے رکھی ہے اور اس کے خلاف اتنی ثبوت مل جانے کے باوجود ابھی تک دو ملازمین

کو ملک بدر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا گیا۔

بیانات میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ اپنی معاشی حالت کو استحکام بخشنے کے لئے کشمیریوں اور سکھوں کی بلی بھارتی سامراج کو پیش کر رہا ہے اور حال ہی میں ایک کشمیری راہنما کا برطانیہ سے اخراج بھی اسی لئے ہوا کہ بھارت نے برطانوی ہیلی کاپٹروں کا سووا منسوخ کرنے کی دھمکی دی تھی۔

سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ تنظیم کی طرف سے اس سلسلے میں باقاعدہ احتجاج کا اعلان ہوا اور وقت مقررہ پر ان لوگوں نے بھارتی ہائی کمیشن کے سامنے کھڑے ہو کر نعرے بھی لگائے۔

اس کے برعکس بھارتی وزارت خارجہ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ یہ حرکت پاکستان نواز سکھوں اور کشمیریوں کی ہے۔ پہلے تو وہ لوگ بخشی کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے رہے جس کے بعد اسے مار ڈالا۔ اس بیان میں حکومت پاکستان کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ آزاد دنیا میں بھارتی وقار کے خلاف سازشوں سے باز رہے ورنہ سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے۔

ooo

نیلما کو بخشی نے آج تک یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کس آگ میں جل رہا ہے۔ اسے صرف یہی علم تھا کہ اس کے باپ کے بھارتی سفارت کاروں سے بڑے نزدیکی تعلقات ہیں کیونکہ بھارت میں اس کے والد کے کئی دوست اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور یہ لوگ انہیں جانتے ہیں لیکن یہ علم تو اسے اب ہوا تھا کہ آج تک اس کا باپ جس ملک کے لئے اپنے بھائی بندوں کی جڑیں کاٹتا رہا' آج انہی لوگوں نے اسے مروا ڈالا۔

یہی صلا تھا اس کے باپ کی محنتوں اور کسی کے لئے کی جانی والی---- بے ایمانیوں کا----!!

اس نے سوچا اور نفرت سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے اپنے دھرم سے' اپنے سماج سے' اپنے آپ سے گھن سی آنے لگی تھی۔ یوں تو ایک آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی ہونے کے ناطے اس نے کبھی پتھروں کو بھگوان نہیں مانا تھا لیکن اب تو ایسے تصور سے بھی اس کی جان جاتی تھی۔

اس کے باپ کی موت کی خبر سن کر سب سے پہلے کریم خان اور خورشید افسوس کرنے آئے تھے۔ ماں بیٹی کا غم سے برا حال تھا۔ ان کے لئے یہ صورت حال بے حد اذیت ناک تھی کہ اس کمیونٹی سے سوائے ایک دو ہندو فیملیوں کے جن کا بھارت سے تعلق نہیں تھا'

ہندو اس کے باپ کی موت کا افسوس کرنے بھی نہیں آیا تھا۔

ooo

اس صورت حال پر وہ پھٹ پڑی۔

اس نے سینکڑوں مسلمان' سکھوں اور انگریز دوستوں کی موجودگی میں جو کچھ منہ میں آیا' ک دیا۔ نیلما نے ضد کر کے اپنے باپ کی لاش مقامی عیسائی قبرستان تک پہنچائی تھی اور ے عیسائیوں کے قبرستان میں ہی دفن کیا گیا۔

قبرستان سے واپسی پر خورشید اس کے ساتھ گھر ہی چلا آیا تھا۔ غم سے نڈھال نیلما نے بات نوٹ کر لی تھی کہ ایک کار مسلسل ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ اپنے باپ کی موت کے بعد---- وہ خاصی ہوشیار ہو گئی تھی اور آنکھیں کھلی رکھنے لگی تھی۔

"گھبراؤ نہیں---- یہ اپنے لوگ ہیں۔ کاش بخشی صاحب نے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہوتا۔ تمہیں علم ہے کریم لالہ نے انہیں اپنی سیکورٹی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ افسوس ایک ہندو ہو کر بھی وہ اپنے ہم نسل لوگوں کو نہ سمجھ سکے----!" خورشید نے اس کی بے چینی نوٹ کرتے ہوئے خود ہی وضاحت کر دی۔

"بہت سی باتوں کا علم انسان کو مرنے تک نہیں ہوتا۔" نیلما نے' ورو جس کے چہرے پر نہ جانے والے موسم کی طرح ٹھہر گیا تھا' خلا میں کسی گمشدہ شے کو ڈھونڈتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"لو سگریٹ پی لو----!" خورشید نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیلما کا خیال کسی اور طرف بٹ جائے۔

"ہٹا لو اسے۔ میں نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے----!" نیلما نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"نیلما---- کیا واقعی؟" خورشید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟ یقین نہیں آتا؟" نیلما نے سنجیدگی اختیار کی۔

"نہیں نیلما! یہ بات نہیں۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ نیکی انسان میں کہیں نہ کہیں زندہ ضرور رہتی ہے۔ بس کوئی راہ دکھانے والا مل جائے۔" خورشید بولا۔

"ہاں خورشید! تم نے ٹھیک کہا۔ میں نے اب زندگی کی اس سب سے بڑی سچائی کو پا لیا ہے۔ مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ میرے سماج کی مسلط کردہ لعنتوں کے باوجود کسی نادیدہ طاقت

نے میرے اندر سچائی کی ایک شمع کو کبھی بجھنے نہیں دیا۔ خورشید! مجھے علم نہیں کہ تم اس بات سے کیا مطلب لو گے لیکن اسے میری کمزوری یا حالات سے سمجھوتہ نہ سمجھنا۔ میں نے اپنے دل و دماغ کی تمام تر گہرائیوں سے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے' میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی لیکن میری خواہش ہو گی کہ میں تمہاری بیوی کی حیثیت سے اپنی اگلی زندگی کا آغاز کروں----!"

نیلما نے اچانک اتنی بڑی اور اہم بات کہہ دی تھی کہ ایک لمحے کے لئے تو خورشید سن ہو کر رہ گیا۔

اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ خورشید کو آج وہ کوئی بدلی ہوئی عورت لگی۔ چند لمحے کے لئے تو وہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔

"نیلما! تمہارے فیصلے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے' اس کا اندازہ شاید ابھی نہیں کر پاؤ گی---- لیکن میں اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ کہیں یہ تمہارا جذباتی فیصلہ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں تم خواب دیکھنے یا دکھانے والی لڑکی نہیں ہو لیکن انسانی فطرت کا یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ انسان بہرکیف خوابوں میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اسلام جبر کا نہیں مرضی کا دین ہے' دین فطرت ہے۔ یہ ہر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ دنیا میں جتنے غیر مذاہب کے لوگ ہیں' ان کے اندر کہیں نہ کہیں اسلام موجود رہتا ہے۔ یہ جو نیکی ہے دراصل یہی اسلام ہے' یہی روشنی ہے۔ کہیں نہ کہیں اندھیرے میں اس کا وجود ضرور قائم رہتا ہے۔ جو قسمت والے ہوں' وہ اس کو اپنے اندر تلاش کر لیتے ہیں۔ تمہارا شمار ان خوش قسمتوں میں ہوتا ہے جو اپنے اندر جھانکنے کا شعور پا لیتے ہیں۔ یہ جو روشنی تمہیں ملی ہے' یہ تمہاری زندگی کے سارے اندھیروں کو اجالوں میں بدل دے گی۔ انشاء اللہ تم زندگی کی ہر سانس میں مجھے اپنے ساتھ دھڑکتا پاؤ گی۔ میں تمہیں پانا اپنی خوش قسمتی جانوں گا لیکن اتمام حجت کے لئے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلے پر ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کر لو۔ اپنے آپ سے اچھی طرح پوچھ لو' جو راستہ تم اختیار کرنے جا رہی ہو' وہ کسی وقتی مجبوری کا تقاضا تو نہیں---- میں نے تم سے کہا ناں کہ دین میں جبر نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ تم آج اور کل اس فیصلے پر غور کرنا۔ اس کے بعد مجھے مطلع کر دینا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر جاگنے والی سچائی کی اس شمع کو روشن رکھے۔"

خورشید کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ گرمیوں کی بارش کی نرم اور گداز بوندوں

کی طرح نیلما کے ذہن پر برس رہا تھا۔ اسے اپنے وجود اور سلگتے ذہن میں ٹھنڈک' تراوٹ' تازگی اور زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک نئی امنگ اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔ خود آگہی کے نشے نے اس کے روئیں روئیں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اسے اپنا جسم ہلکا ہو فضا میں تیرتا محسوس ہونے لگا۔ خورشید کے جواب نے اسے حیرت انگیز خوشی سے ہمکنار کیا تھا۔

اس نے احساس کر لیا کہ یہ کوئی عام سا لڑکا نہیں ہے۔ اس کی توقعات کے برعکس جواب نے اسے ایک روحانی سرشاری عطا کر دی تھی۔ خورشید کی عظمت اس کی نظروں میں دوچند ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا یہ کتنے عظیم انسان ہیں جو عورت کے جسم سے آگے بھی سوچتے ہیں۔ یہ کیسا نوجوان تھا جس کی جھولی میں وہ پکے ہوئے پھل کی طرح گرنے جا رہی تھی اور وہ صبر اور استقامت کا مجسمہ بنا اسے زندگی کے حقائق سے آگاہ کر رہا تھا۔

اگر کہیں اس کے دل و دماغ میں اپنی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے کے خلاف کوئی معمولی سا احتجاج بھی موجود تھا تو اسے خورشید کے جواب نے ختم کر دیا۔

ooo

دو روز بعد اس نے خورشید کو جواب دینے کی بجائے اسلامک سینٹر کا رخ کیا اور وہاں اسلام سے متعلق بنیادی معلومات کے کورس میں باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ اس نے خورشید کو اس کے سوال کا عملی جواب دے دیا تھا۔ پندرہ بیس روز کے بعد اس نے ایک سادہ سی پروقار تقریب میں سنٹرل مسجد کے امام صاحب کے سامنے پورے صدق و یقین کے ساتھ اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا----!

مسز بخشی کی دنیا شراب تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے اس بات کی کوئی پروا ہی نہیں تھی کہ دنیا میں اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔

نیلما کا اسلامی نام نائیلہ رکھا گیا تھا۔

جب سے وہ نیلما سے نائیلہ بنی تھی' اس نے اپنے سر کو ایک بڑے سکارف سے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز لوگوں کو یہ بھی سننے کو مل گیا کہ وہ نائیلہ بخشی سے نائیلہ خورشید بن گئی ہے۔ اس شادی نے مقامی آبادی میں ایک تناؤ کھڑا کر دیا تھا اور شہر میں دو تین جگہ تو صورت حال خاصی کشیدہ ہو گئی تھی۔ "را" کے لوگوں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور سکھوں کو بھی اس جھگڑے میں گھسیٹ لائے۔ اس طرح ہندو سکھ اور مسلم لڑائی کی صورت پیدا ہونے لگی۔ اس زہریلے پراپیگنڈے سے گو کہ تمام لوگ متاثر نہیں تھے

پھر بھی ایک بڑا حصہ سکھوں کی آبادی کا اس سے متاثر ہو چکا تھا۔

ooo

امریک سنگھ نے بارش میں رکنے کے بجائے چلتے رہنے کو زیادہ بہتر جانا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے تعاقب میں آنے والے انسان نما شکاری کتے پہاڑی کی اوٹ یا گھنے درخت کے تنے سے چمٹے ہانپ رہے ہوں گے۔ بارش کی صورت میں واہگورو نے گویا اس کے لئے مدد بھیج دی تھی۔ اسے سمت کا تو کوئی اندازہ نہیں تھا' نہ ہی اس علاقے میں کبھی ماضی میں اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ بس وہ اندازے سے ہی ایک طرف چلتا رہا----!

اسے چلتے ہوئے تین چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے لیکن پہاڑی سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"کہیں میں راستہ بھول تو نہیں گیا۔" اس نے خود سے سوال کیا۔

اس بات کا جواب اسے اثبات میں ملا تھا۔ اس نے اب اس جگہ چھپ کر کچھ وقت گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی بچانے کی جدوجہد ٹھٹھرا دینے والی سردی پر بھی غالب آ گئی تھی۔

لیکن کب تک----!

بارش تو اب تھم گئی تھی---- اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ اس کے جسم پر کپڑے چیتھڑوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ تن کا کوئی کپڑا ایسا نہ تھا جو بارش میں مکمل بھیگ نہ گیا ہو۔ ہوا اپنے سارے زور کے ساتھ اس کے جسم سے ٹکرائی اور یخ کر دینے والی لہریں جسم کے مساموں کے ذریعے اس کے اندر رینگنے لگتی۔ اس پر کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔

اس صورت حال میں اس نے بیٹھ کر نمونیے کا انتظار کرنے کے بجائے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح کم از کم وہ اپنا جسم تو کسی حد تک گرم رکھ سکتا تھا۔ قسمت شاید اس پر زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی کیونکہ اب اس کی آنکھوں نے کچھ فاصلے پر میدانی علاقہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس میدانی علاقے پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی تھی کہ یہاں بھارتی فوج اس کے استقبال کے لئے موجود ہو گی۔

اس نے ایک گھنے درخت کی اوٹ---- میں بیٹھ کر کچھ لمحے ستانے اور اگلا لائحہ عمل طے کرنے کا ارادہ کیا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ شدید سردی نے اس کی سوچیں بھی منجمد کر دی ہیں اور اگر وہ کچھ دیر اور یونہی بیٹھا رہا تو خون اس کی رگوں میں جم جائے گا۔

بادل نخواستہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا----!

اس کا رخ اس اکیلی عمارت کی طرف تھا جس کی چمنی سے دھواں نکلتے اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔

عمارت کی شکل اب واضح ہونے لگی تھی۔ کچھ اور نزدیک پہنچ کر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ کسی سرکاری ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گیا ہے' پھر ایک بورڈ بھی نظر آ گیا جس پر ہندی' اردو اور انگریزی میں "فارسٹ ریسٹ ہاؤس" لکھا تھا۔ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر وہ بالآخر ریسٹ ہاؤس کے شکستہ برآمدے تک پہنچ ہی گیا۔

اس نے اپنے سامنے والے کمرے کا رخ کیا تھا----!

کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھٹکھٹانے پر جس صورت نے اس کا استقبال کیا' اسے دیکھ کر نجانے کیوں امریک کو اپنے زیادہ محفوظ ہو جانے کا احساس ہوا۔ "سلام بابو جی!" بوڑھے نے جو اندر دہکتے آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا' اس کے چہرے پر سرسری سی نظر دوڑاتے ہوئے اسے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا' "سلام بابا!"

کہتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ بوڑھا چوکیدار چند ثانیے اپنی جگہ کھڑا شش و پنج میں مبتلا رہا' پھر وہ بھی اندر ہی آ گیا۔ کمرے کا دروازہ اس نے اپنے عقب میں بند کر دیا تھا۔

ooo

"میرا نام کیپٹن رانا ہے' ادھر ہم لوگ شکار کھیل رہے تھے کہ اچانک بارش نے آلیا۔ میں راستہ بھٹک چکا ہوں۔ شکر ہے بھگوان کا یہاں تک تو پہنچ گیا۔ کیا نام ہے اس جگہ کا؟ میں تو بابا جی اس طرف بالکل اجنبی ہوں' ابھی بانہال میں میری پوسٹنگ ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں۔" اس نے فوراً" ہی ایک جھوٹ گھڑ کر بوڑھے چوکیدار کو سنا دیا۔

"صاحب جی! یہ بانڈی پور ہے۔ سامنے والی پہاڑی سے بانڈی پورہ کے جنگلات شروع ہو جاتے ہیں۔"

بوڑھا چوکیدار اسے بتانے لگا۔ امریک نے باتوں ہی باتوں میں اس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس ریسٹ ہاؤس میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا اور بانڈی پورہ یہاں سے پانچ میل دور تھا۔ چوکیدار نے اسے بتایا کہ یہاں وہ اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ رہتا ہے۔ آج صبح ہی اس کا ساتھی کسی کام کے سلسلے میں پندرہ میل دور واقع ایک گاؤں میں گیا ہے۔ اس نے آج شام کو واپس آنا

ہے لیکن موسم کے تیور دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ اب وہ شاید اگلے روز تک ہی واپس آئے گا۔

اس نے بوڑھے چوکیدار پر اپنی کپتانی کا رعب تو ڈال دیا تھا لیکن اب اسے یہی دھڑکا لگا تھا کہ جانے کب کوئی اور بھولا بھٹکا سرکاری مسافر آ جائے۔ چوکیدار نے اسے بتایا تھا کہ یہاں ہفتوں تک کوئی نہیں آتا' بس کبھی کبھی محکمہ جنگلات کے چھوٹے افسر یہاں رنگ رلیاں منانے چلے آتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کی حالت بھی یہی بتا رہی تھی کہ یہ بڑے افسروں کا ریسٹ ہاؤس نہیں ہے۔

اس کے دل سے رہ رہ کر ایک ہی دعا نکلتی تھی کہ کم از کم اس کے کپڑے سوکھنے سے پہلے کوئی اور اس طرف نہ آئے۔ چوکیدار کو اس نے ابھی تک باتوں میں الجھا رکھا تھا اور اسے یہی بتایا تھا کہ ممکن ہے اس کے ساتھی اسے ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آ نکلیں۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک دس کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

"بابا جی اگر چائے کا بندوبست ہو جائے تو کیا کہنے؟"

بوڑھے چوکیدار نے ہر ممکن کوشش کی کہ پیسے امریک سنگھ کو لوٹا دے لیکن اس نے چوکیدار کی ایک نہ چلنے دی۔ اپنا کوٹ اور جرسی اتار کر اس نے آتش دان کے سامنے کرسی رکھ کر اس پر لٹکا دی تھی اور خود ایک دوسری کرسی بچھا کر وہاں بیٹھ گیا۔ چوکیدار جو اب چائے بنانے دوسرے کمرے میں جا چکا تھا' نے یہاں جلانے کے لئے لکڑیاں خاصی تعداد میں جمع کر رکھی تھیں۔ امریک نے اس کے آنے تک آگ کی شدت میں کمی نہیں آنے دی تھی۔ چائے کا مگ اپنے حلق میں انڈیلتے ہوئے اسے اپنا جسم سوکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ چائے دے کر چوکیدار پھر واپس چلا گیا۔

اس کی واپسی قریباً" آدھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس درمیان امریک کو یہی دھڑکا لگا رہا کہ عین ممکن ہے وہ کسی کو اس کے متعلق مطلع کرنے گیا ہو۔ چوکیدار کی واپسی تک اس کا جسم اور کپڑے سوکھ چکے تھے۔

"مجھے اب چلنا چاہیے۔ معلوم نہیں میرے ساتھی کہاں رہ گئے----!" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ فی الحال یہاں سے نہ ہی جائیں تو بہتر ہو گا۔" اس مرتبہ چوکیدار کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے چونک کر دریافت کیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کیپٹن صاحب کہ اس علاقے کو فوج نے مکمل گھیرے میں لے رکھا ہے۔" اس نے اس مرتبہ براہ راست امریک سنگھ کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" امریک نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

"فضل!" بوڑھے نے حیران ہوئے بغیر جواب دیا۔

"دیکھو بابا فضل! تم مسلمان ہو اور میں مسلمانوں کا دوست ہوں.....!" اس نے ابھی کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ فضل نے اس کی بات ٹوک دی۔

"آپ مجھے کچھ نہ بتائیں کیپٹن صاحب لیکن مجھے علم ہے کہ آپ فوج کے ہاتھوں سے بچ نکلے ہیں اور میری اطلاع کے مطابق حریت پسند ہیں۔ آپ کے آنے سے دو گھنٹے پہلے یہاں فوج کی ایک جیپ بھی آئی تھی اور ان لوگوں نے مجھے آپ کے متعلق بتا کر سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں یہاں کسی بھی اجنبی کی آمد سے انہیں مطلع کر دوں۔ وہ لوگ یہاں سے بمشکل دو میل دور موجود ہیں اور انہوں نے اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بیٹا! کاش میں بھی حریت پسندوں کے شانہ بشانہ جہاد آزادی میں شامل ہو سکتا لیکن شاید یہ سعادت میری قسمت میں نہیں۔ آج قسمت نے مجھے کچھ موقع دیا ہے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تم مطمئن رہو بیٹا! میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی تم تک پہنچے گا۔ یہ ایک بوڑھے مسلمان کا اپنے خدا سے عہد ہے۔"

بوڑھے فضل نے آخری بات اتنے اعتماد سے کہی تھی کہ امریک سنگھ کے لئے سوائے اس پر اعتبار کر لینے کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

"بابا جی آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ گو کہ میں مسلمان نہیں لیکن میں حریت پسندوں کا ساتھی ہوں۔ آپ کی طرح ہم لوگ بھی براہمن سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی جانیں تلی پر رکھ کر میدان میں نکل آئے ہیں---- آپ کی مدد کا شکریہ۔ یقیناً ایک مسلمان ہونے کے ناطے آپ مجھے دھوکہ نہیں دیں گے۔"

"تم مطمئن رہو بیٹا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے دوبارہ باہر نکل گیا۔

اس مرتبہ اس کی واپسی کھانے کی ایک ٹرے کے ساتھ ہوئی۔ اس نے یہاں موجود اشیائے خوردنوش سے بہترین ڈش منتخب کر کے اس کے لئے تیار کر دی تھی۔ کھانا دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔

ooo

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں تمہیں راتوں رات یہاں سے نکال کر مجاہدین کے ایک محفوظ ٹھکانے تک پہنچا دوں گا جہاں سے انشاء اللہ وہ تمہیں سری نگر پہنچا دیں گے۔" اس نے کھانے پر ہی تجویز پیش کر دی۔

اس کی باتوں سے امریک نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص مجاہدین کا ساتھی ہے اور یہ اس کی خوش بختی تھی کہ وہ بھٹک کر بھی محفوظ ہاتھوں میں پہنچا تھا۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب بوڑھے فضل کی رہنمائی میں وہ ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلا۔ اب اس کی حالت بہت سنبھل چکی تھی۔ بوڑھا رہنما پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ ان کا سفر کئی گھنٹوں پر محیط تھا۔ اس دوران ستانے کے لئے وہ راستے میں دو مرتبہ چند منٹ کے لئے رکے بھی تھے۔ رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب وہ ایک گاؤں تک پہنچے۔ فضل نے اس گاؤں کا نام مومن پورہ بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ یہاں سے سری نگر تین چار گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ اس نے امریک کو وہیں چھپنے کو کہا---- اور اسے کہا تھا کہ وہ اکیلا مجاہدین کے ٹھکانے پر جائے گا۔ اس نے امریک کو سمجھا دیا تھا کہ خطرے کی صورت میں وہ اسے کیا اشارہ کرے گا۔

گاؤں کے باہر کھیت میں چھپے امریک نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ فضل کی واپسی قریباً" پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ فضل کی بتائی ہوئی جگہ سے کافی ہٹ کر وہ اس راستے پر بیٹھا تھا جو گاؤں سے اس طرف آتا تھا۔ آنے والوں کو یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ امریک دبے قدموں بلی کی طرح ان کے تعاقب میں آ رہا ہے۔ وہ اچانک ہی نکل کر ان کے سامنے آ گیا تھا کیونکہ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکے کی چال نہیں چل رہا۔

اس کے اچانک سامنے آنے پر ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے پستول نکال کر اس کی طرف تان لیا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں دوست۔ میں تمہارا ساتھی ہوں۔" امریک نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"تم مجھے ورما کہہ لو۔ ظاہر ہے میں تمہیں اپنا صحیح نام نہیں بتا سکتا۔"

"ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں لیکن تمہیں ثبوت دینا ہو گا کہ تم سرکاری آدمی نہیں ہو' بصورت دیگر ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔" بات کرنے والے کے لہجے سے امریک اندازہ کر

سکتا تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔

"تم بشیر شاہ تک پیغام پہنچا سکتے ہو تو میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ہم دوپہر تک تمہارا پتہ لگا لیں گے۔"

وہ امریک کو اپنے ٹھکانے پر لے آئے تھے۔ فضل وہیں سے لوٹ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صبح جب وہاں ریسٹ ہاؤس پر کوئی آئے تو اسے وہاں نہ پا کر خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جائے---- اس بوڑھے کی جوانی پر امریک دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا جو قریباً" ساری رات چلتا ہی رہا تھا۔

امریک کو انہوں نے ایک علیحدہ کمرے میں آرام کرنے کی ہدایت کے ساتھ بند کر دیا تھا۔ یہ کمرہ یوں تو خاصا آرام دہ تھا لیکن فی الوقت ان لوگوں نے اسے "زیر حراست" ہی رکھا ہوا تھا۔ اس صورت حال پر امریک نے کوئی احتجاج نہیں کیا---- اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو بھی حفاظتی اقدام اختیار کرتا۔

دوپہر تک وہ لمبی تان کر سوتا رہا----!!

ooo

اس کی آنکھ کھلی تو اس کے لئے "بھوجن" موجود تھا۔

شام ہونے تک ہاشم وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے امریک کو پہچان کر خدا کا شکر ادا کیا اور ساتھیوں کی تشویش سے اسے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ بشیر شاہ نے اس کی گرفتاری کی اطلاع ابھی تک پیچھے نہیں پہنچائی تھی۔ انہیں امید تھی کہ ضرور کوئی معجزہ رونما ہو گا۔

ہاشم کے ساتھ اگلے روز وہ سری نگر کی طرف عازم سفر تھا۔

سری نگر میں پندرہ بیس روز قیام سے اس کا حلیہ خاصا بدل چکا تھا۔ اس مرتبہ ان لوگوں نے کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے متبادل انتظامات کئے تھے اور امریک سنگھ نے متبادل انتظامات کے تحت سری نگر سے تین روز میں سفر طے کر کے پٹھانکوٹ پہنچنا تھا۔ اس دوران کسی بھی حفاظتی چوکی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

پٹھانکوٹ سے اس نے دہلی کا رخ کیا جہاں سے وہ دوبارہ "منڈ" کے علاقے میں پہنچا دیا گیا۔

آج جسدیو سنگھ نور محل سے خصوصی ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ امریک کی والدہ آخری دموں پر ہے اور اپنے بیٹے سے ملاقات کئے بغیر اپنے پران نہیں تیاگے گی۔ اس رات جسدیو کے ساتھ وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

ooo

"را" نے اس مرتبہ میجر ٹنڈن کو بھیجا تھا۔۔۔!

ٹنڈن اس سے پہلے نکسل باڑی' بوڈو اور گورکھا کی تحریکوں سے نمٹا تھا۔ وہ "دہشت گردوں" سے نمٹنے کے لئے صرف "دہشت گردی" کے اصول کا قائل تھا۔ ہیڈکوارٹر نے جان توڑ محنت کے بعد یہ سراغ لگا لیا تھا کہ روندر سنگھ دراصل بھارتی فوج کا بھگوڑا کیپٹن امریک سنگھ ہے اور پنجاب میں گزشتہ آٹھ ماہ سے جو بموں کے دھماکے ہو رہے ہیں' ان کے پیچھے اسی کا ذہن کارفرما ہے۔

ہیڈکوارٹر نے بیشتر پولیس افسران کے قتل کا ذمہ دار بھی کیپٹن امریک سنگھ کو گردانا تھا اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ امریک سنگھ کے سرحد پار تعلقات خاصے مضبوط ہیں۔ وہ آئی ایس آئی کا خاص آدمی ہے۔

ٹنڈن نے ایسے بہت سے معرکے پہلے سر کئے تھے جیسا اب وہ پھر سر کرنے جا رہا تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ امریک سنگھ کو زمین کے پاتال سے بھی ڈھونڈ کر مار ڈالو یا زندہ گرفتار کر لو۔۔۔!

ٹنڈن اپنے آفس میں بیٹھا اس کی فائل کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں امریک سنگھ کی فوجی زندگی اور سول زندگی کی جتنی بھی تصویریں مل سکتی تھیں اسے فراہم کر دی گئی تھیں لیکن ان میں سے کوئی تصویر داڑھی کے بغیر نہیں تھی۔ ان کے گھریلو حالات' ممکنہ ٹھکانے' دوستیاں' خاندانی دشمنیاں ہر شے اس کے سامنے تھی۔

ٹنڈن نے جالندھر کو اپنا ہیڈکوارٹر مان کر نور محل تھانے کے اس گاؤں پر سرخ دائرہ لگا لیا تھا اور اب وہ مقامی ٹاؤٹوں کو بریفنگ دے کر اس علاقے میں لانچ کر آیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے صرف مخبروں پر اعتماد کرنے کی بجائے کچھ اور بھی کر گزرنے کی ٹھانی تھی اور "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹوں کی خاصی تعداد کو جالندھر میں پھیلا دیا تھا۔

تیسرے روز اسے ایک اہم خبر مل گئی جس کی اسے مدت سے ضرورت تھی کہ نور محل کا رہنے والا نوجوان آتما سنگھ تخریب کاروں کا ساتھی ہے لیکن ابھی تک پولیس کو اس پر شک نہیں گزرا۔

آتما سنگھ مقامی خالصہ کالج کا بی اے کا طالب علم تھا اور تحریک خالصتان کے لئے گزشتہ دو سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ کسی کو اس پر شک ہی نہیں گزر سکتا تھا۔۔۔ آج جب وہ اپنے ٹریکٹر میں اسلحہ لاد کر کسی دوسرے گاؤں جا رہا تھا'

پولیس کو تو جل دینے میں کامیاب ہو گیا لیکن "را" کے ایجنٹ کی گہری نظروں سے نہ بچ سکا۔ جس نے یہ اسلحہ کماد کے کھیتوں میں چھپے تین نوجوانوں کے حوالے کرتے اسے دیکھ لیا تھا۔

اگلے روز شام تک آتما سنگھ کے مکمل کوائف میجر ٹنڈن کے سامنے پڑے تھے۔ اس کی بہن مقامی کالج میں ایف۔اے کی طالبہ تھی۔ دوسری میٹرک میں پڑھتی تھی اور باپ ایک سرکاری محکمے میں دوسرے درجے کا افسر تھا۔ ٹنڈن نے حسب عادت اپنی آنکھیں اور ہونٹ سکیڑ کر چند لمحے اس کی تصویر پر نظریں جمائیں۔ پھر ایک منصوبہ اس کے شیطانی ذہن نے تیار کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ماتحتوں کو بریفنگ دے رہا تھا۔ منگل کاون ان لوگوں نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے منتخب کیا تھا۔

شوندر کور منگل کو معمول کے مطابق کالج جانے کے لئے گھر سے نکلی۔ وہ گھر سے بڑی سڑک پر پیدل جایا کرتی تھی۔ آج جب وہ نور محل کے کھیتوں میں درمیانی راستے سے گزر رہی تھی تو اچانک کماد کے ایک کھیت سے ایک لمبا تڑنگا شخص باہر نکل آیا۔ اس کی شکل سکھوں جیسی ہی تھی اور سر پر پگڑی باندھ کر اس نے مقامی دیہاتی کا روپ دھارن کر رکھا تھا۔

شوندر نے گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن پیچھے سے آنے والے مضبوط ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان لوگوں نے شوندر کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلنے دی تھی۔ جٹی نے خود کو ان کی گرفت سے نکالنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن اب ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کی گردن ایک طرف لٹک گئی تھی۔

شوندر کو ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں بند تھی جہاں دو تین فوجی افسر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

"کون ہو تم؟ مجھے کیوں لایا گیا ہے؟" اس نے زمین سے اٹھ کر سامنے والے فوجی افسر سے دریافت کیا۔

اس کے سوال کا جواب زوردار تھپڑ کی صورت میں موصول ہوا۔ دھان پان سی لڑکی دیوار سے ٹکرا کر دوبارہ زمین بوس ہو گئی۔ اس مرتبہ وہ چیختی ہوئی دوبارہ اٹھی اور فوجی پر حملہ آور ہوئی۔ جواب پھر ویسا ہی ملا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش برسنے لگی۔ ان لوگوں نے شوندر کور کو اتنی بے رحمی سے مارا تھا کہ اس کے جسم کا رنگ نیلا پڑنے لگا۔۔۔ آدھ گھنٹے میں وہ دو مرتبہ بے ہوش ہوئی تھی۔ اس

دوران وہ لوگ اس کے جسم پر ہر ممکن تشدد کرتے رہے۔ ابھی تک کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ کوئی اذیت پسند درندے دکھائی دے رہے تھے جو اپنی حیوانی حس کو تسکین دینے کے لئے اب اس کے جسم کو سگریٹ سے بھی داغنے لگے تھے۔

اس مرتبہ شوندر کو ہوش آیا تو سوائے زبان کے وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"آتما سنگھ کا تعلق تخریب کاروں کے کس گروپ سے ہے؟" پہلی مرتبہ اس سے سوال ہوا اور پہلا سوال ہی ایسا تھا کہ اس کے دل و دماغ پر بم کی طرح پھٹا۔

اسے علم نہیں تھا کہ اس کا بھائی خالصتانیوں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ ان کا گھرانہ ضرور مذہبی تھا لیکن آتما سنگھ نے کبھی اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ تمام لوگ سنت بھنڈرنوالہ کے پیروکار تھے اور سنت جی کے مشن کی تکمیل کے آرزومند بھی تھے۔ اسے یاد آگیا کہ اس کے کالج کی ایک ساتھی کے ساتھ انٹیلی جنس والوں نے کیا سلوک کیا تھا۔ جانے کتنے موزیوں نے اس کی بے حرمتی کرنے کے بعد اسے گلہ گھونٹ کر مار ڈالا تھا کیونکہ انہیں شک تھا کہ اس کا باپ تخریب کاروں کا ساتھی ہے۔

"کیا اب یہ لوگ میرا بھی یہی حال کریں گے؟" یہ تھا پہلا سوال جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا۔

"مجھے علم نہیں۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہے لیکن مرنے سے پہلے وہ کسی بزدلی کا مظاہرہ کرتے اپنی "سکھی مان مریادہ" پر حرف نہیں لانا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے ہم تمہیں بتا دیتے ہیں----!"

دو مضبوط ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔ اس مرتبہ اس کے جسم کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا اور وہ لوگ اس کے جسم کے نازک حصوں پر تشدد کر رہے تھے۔ شوندر کور کی چیخوں سے آسمان کا کلیجہ شق ہو رہا تھا لیکن یہ شقی القلب درندے قہقہے لگا رہے تھے۔ شام گئے تک وہ درندگی کا یہی کھیل رچاتے رہے۔ پھر اسے ایک کوٹھری میں پھینک کر لاک اپ کر دیا۔

ooo

شوندر کی اچانک گمشدگی پر سب سے پہلے آتما سنگھ کا ماتھا ٹھنکا تھا' کہیں اس کی معصوم بہن بھیڑیوں کے ہاتھ تو نہیں لگ گئی؟

یہ سوچ ہی بڑی جان لیوا تھی۔

اس کے گھر والوں نے مقامی تھانے میں رپٹ درج کرا دی تھی لیکن آتما سنگھ کو کسی پل چین نہیں تھا۔ تھانے سے واپسی پر وہ اپنے گھر جانے کی بجائے کسی اور طرف جا رہا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ اس سانحے کی خبر اپنے ساتھیوں تک ضرور پہنچا دے۔

جیسے ہی وہ تھانے کی عمارت سے باہر نکلا' ایک فوجی جیپ میں بیٹھے جوانوں نے اس کی طرف رائفلیں تان لیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر کسی کو باخبر کرے' ان لوگوں نے اسے اٹھا کر جیپ میں بٹھایا اور جیپ ہوا ہو گئی۔

آتما سنگھ کو سب سے پہلے میجر ٹنڈن کے سامنے پیش کیا گیا----!

"بہت چالاک بنتے ہو!" ٹنڈن نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مغلظات کا طوفان بکتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی وہاں موجود لوگ درندوں کی طرح اس پر پل پڑے اور اسے پندرہ بیس منٹ میں روئی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ آتما سنگھ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ہوش میں لا کر پہلا سوال اس سے میجر ٹنڈن نے ہی پوچھا تھا۔

"کے ایل ایف سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں کسی کو نہیں جانتا' میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا ہے۔" اس کے منہ سے جیسے ہی یہ جواب نکلا' وہ لوگ پھر آتما سنگھ پر پل پڑے۔

شام تک انہوں نے آتما سنگھ کے جسم کا رواں رواں توڑ ڈالا لیکن اس صدق کے پتلے کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلوا سکے۔ شام کے بعد ٹنڈن نے "ترپ چال" چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس کھیل کو زیادہ دیر جاری رکھ کر دشمن کو متوجہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس مرتبہ آتما کو ہوش آیا تو اس کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے اور ہتھکڑی کا سرا مضبوطی سے ایک سلاخ سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بہن کو دو سپاہی تھامے کھڑے تھے۔ شوندر کور پر نظر پڑتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ دونوں بہن بھائی دیوانہ وار ایک دوسرے کو پکار رہے تھے لیکن ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے۔ ان کی چیخ پکار کا جواب دلدوز قہقہوں کی صورت میں مل رہا تھا۔

"خاموش----!" اچانک دروازے سے ٹنڈن اندر داخل ہوا۔

"لے جاؤ اسے!" اس نے شوندر کور کی طرف اشارہ کر کے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "میں

تمہاری ماں اور باپ کا بھی یہی حشر کروں گا۔ اگر میں چاہتا تو تمہیں بہت پہلے جب تم نے ۴ ستمبر کو اسلحہ "ماکھانوالی" پہنچایا تھا' گولی مار دیتا لیکن میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ تمہارے خون سے ہاتھ رنگ کر مجھے کیا ملے گا؟"

اس نے آخری بات کہہ کر آتما سنگھ کے ذہن کو زبردست جھٹکا دیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ یہ لوگ اس کا مکمل ریکارڈ رکھتے ہیں اور ان کا تعلق "را" سے ہو گا۔

رات گئے تک میجر ٹنڈن نے آتما سنگھ کو اس بات کے لئے تیار کر لیا تھا کہ وہ نور محل میں کیپٹن امریک سنگھ کی آمد کی خبر دے گا۔ اس صورت میں اس کی جان چھوٹ سکتی ہے بصورت دیگر اس کے ماں' باپ اور بہن کا ایسا حشر کرے گا کہ وہ نہ جی سکے گا نہ مر سکے گا۔

آتما سنگھ اور اس کی بہن کو ان لوگوں نے اس ہدایت کے ساتھ رہا کیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بیتنے والی قیامت کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ لوگ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔

دونوں بہن بھائی رات کے اندھیرے میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ آتما سنگھ نے گھر والوں سے صرف یہی کہا تھا کہ انہیں خالصتان کی حمایت کے الزام میں پکڑا گیا تھا لیکن تفتیش کرنے پر جب وہ بے گناہ پائے گئے تو ان لوگوں نے انہیں رہا کر دیا۔ کیپٹن امریک والے قصے کا شوندر کور کو علم نہیں تھا۔ آتما سنگھ نے اپنے گھر والوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اس بات کی کسی کو خبر نہ ہونے دیں اور شوندر کے متعلق بھی کوئی اور کہانی گھڑ لیں' اسی میں ان کی سلامتی تھی۔

دو تین روز تک آتما سنگھ خودکشی پر غور کرتا رہا لیکن اس نے سوچا کیا اس کے مرجانے سے ان کی ماں بہن کی عزت بچ جائے گی؟ اس کے باپ کی عزت اور زندگی بچ جائے گی؟

"را" نے اسے مرنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ خود تو مر جاتا لیکن اس کا سارا خاندان زندہ درگور ہو جاتا۔ اس کے لئے سوائے امریک سنگھ کی آمد کی خبر دینے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ تھا۔ اگر وہ گاؤں سے گھر والوں کے ہمراہ فرار ہونے کی کوشش بھی کرتا تو بھی ایسا نہ کر پاتا کیونکہ اس امکان پر "را" کی نظر اس سے پہلے ہی ہو گی--- اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟

ooo

پانچویں روز ہی اسے معلوم ہوا کہ کیپٹن امریک سنگھ گھر والوں کی ملاقات کو آ رہا ہے کیونکہ اس کی قریب المرگ ماں نے اپنے بیٹے سے ملنے کی شدید خواہش ظاہر کی تھی۔ یوں

بھی اسے گھر سے نکلے بہت دن ہونے کو آئے تھے۔

بادل نخواستہ اس نے یہ خبر قصائیوں کو پہنچا دی تھی کہ اب--- اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

جس روز یہ خبر "را" کو ملی' اسی روز ٹنڈن نے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ وہ اس مرتبہ امریک سنگھ کو مہلت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے اس علاقے میں کام کرنے والی کسی بھی انٹیلی جنس پولیس یا سی آر پی کو کانوں کان اس بات کی خبر نہیں ہونے دی تھی کہ "را" کیپٹن امریک سنگھ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہے!

نور محل کے لوگوں کو علم ہی نہ ہو پایا کہ اس روز شام کو گاؤں کے ویشنو مندر میں بھگتوں کی جو جماعت آ کر ٹھہری ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟

میجر ٹنڈن نے سنیاسیوں اور پنڈتوں کے روپ میں نور محل کے اطراف میں اپنے آدمیوں کا جال بچھا دیا تھا۔ جس روز امریک سنگھ نے آنا تھا' میجر ٹنڈن خود گاؤں میں موجود تھا۔

ooo

شام ڈھل رہی تھی جب امریک سنگھ نور محل کے اڈے پر ایک بس سے اترا۔ اس نے مقامی ہوم گارڈ کی وردی پہن رکھی تھی جس پر دھسا ڈال کر بظاہر سردی سے بچنے کا سوانگ رچایا گیا تھا۔ اس دھسے کے اندر کلاشنکوف اور اس کی کمر سے بندھی بیلٹ میں بھری ہوئی میگزینیں موجود تھیں۔

امریک سنگھ کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ بس سے اترتے ہی "گھر کے بھیدی" نے جسے انٹیلی جنس والوں نے ایک ایسی جگہ چھپا رکھا تھا جہاں سے وہ تو سب کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن اسے کوئی نہ دیکھ سکے' امریک سنگھ کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جیبی ٹرانسمیٹر پر میجر ٹنڈن تک اطلاع پہنچ گئی۔

"اسے گھیرے میں لئے رکھو' ہم نے بہرصورت اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کرنی ہے۔ اگر یہ زندہ ہاتھ آ گیا تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔" اس نے اپنے نائب کو ہدایت دی۔

وہ لوگ بلی کی طرح پنجوں پر چلتے اس کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ امریک سنگھ ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر بظاہر چوکنا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے باپ کی بانہوں میں سمٹ گیا۔ چارپائی پر لیٹی موت

کی منتظر ماں کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ اس نے ایک ہی لمحے میں اپنے سورے کی لاکھوں بلائیں لے ڈالی تھیں۔

اس نے جھک کر ماں کے پاؤں چھوئے اور پھر اس کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

"پتر جا میں نے تجھے اپنے دودھ کی دھاریں بخشیں۔ تو نے میری موت کو آسان کر دیا ہے۔ اسی جیون میں تو اپنے جینے کا حق ادا کر گیا۔ بیٹا! اپنے دل پر کبھی یہ بوجھ نہ رکھنا کہ تو نے بڑھاپے میں ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔ تو گورو کا لال ہے۔ تجھ پر پہلا حق پنتھ خالصہ کا ہے۔ مہاراج تیرا انگ سنگ سہائی ہوئے---- تجھے کبھی تتی ہوا نہ لگے.....!"

ابھی اس کی دعائیں نامکمل ہی تھیں جب اچانک باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔

امریک سنگھ نے ایک ہی ایکشن میں کلاشنکوف کو فائرنگ پوزیشن میں کرتے ہوئے سامنے والی سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگائی اور بھاگتا ہوا کوٹھے پر چڑھ گیا۔

"امریک سنگھ تم چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہو۔ بچ کر نہیں جا سکتے۔ اگر گاؤں کی سلامتی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر مکان سے باہر نکل آؤ۔"

اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی جیپ پر لگا ا۔مبلی فائر چلایا۔ امریک سنگھ نے اس اثنا میں شام کے ملگجے اندھیرے میں باہر کی صورت حال کا اوھورا سا جائزہ لے کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔

کوٹھے کی چھت سے جھک کر اس نے زوردار آواز میں اپنے بوڑھے والدین کو فتح بلائی۔

واہے گورو جی کا خالصہ---- واہے گورو جی کی فتح!

اس کے باپ کی آواز بیٹے سے بھی زیادہ گونجدار تھی جس نے فوراً" ہی مکان کے دروازہ کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی اور اب دروازے کے سامنے اپنی بساط کے مطابق رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔ اس نے بھینس کو چارہ ڈالنے والی کھرلی دروازے کے آگے رکھ کر اس کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اپنی دانست میں کنکریٹ کا مورچہ تعمیر کر لیا تھا۔

"امریک سنگھ ہم آخری وارننگ دے رہے ہیں' باہر آ جاؤ----!" سپیکر پھر چلایا۔

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی جب اچانک فضا میں تین چار چیخیں فائرنگ کی آواز کے ساتھ ابھریں اور ڈوب گئیں۔ یہ ان لوگوں کی چیخیں تھیں جو مکان کے شمال والی سمت سے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ امریک سنگھ کی رینج میں آئے' اس کی گن کے ایک ہی برسٹ نے تینوں کو چاٹ لیا۔

اس اثناء میں میجر ٹنڈن کی ہدایت پر سی آر پی نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ جیسے

ہی مزاحمت شروع ہوئی' ان کی رائفلوں نے امریک سنگھ کے مکان پر انگارے برسانے شروع کر دیئے۔

امریک سنگھ نے آخری منظر یہی دیکھا کہ اس کے والدین نے دیواروں کے ساتھ پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیوار پھلانگ کر مکان کی مخالف سمت میں کود گیا۔ اس کے زمین پر گرتے ہی گولیاں بارش کے قطروں کی طرح اس کے گرد ٹپکنے لگیں۔

امریک سنگھ نے سی آر پی کے درجنوں جوانوں کو بھاگتے ہوئے اپنی سمت آتے دیکھا تھا۔ وہ لوگ شاید اچانک دھاوا بول کر اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔

اچانک ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چٹان کی طرح تن کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"خالصتان زندہ باد---- خالصتان زندہ باد---- خالصتان زندہ باد! بولے سونہال ست سری اکال!"

اس نے اپنی گن سیدھی کی اور اپنی سمت بڑھنے والوں پر موت کا دھانہ کھول دیا۔ اس کی گولیوں نے بمشکل تین چار جوانوں کو ہی چاٹا تھا جب اچانک اسے اپنے سینے' پیٹ اور ٹانگوں میں انگارے گھستے محسوس ہوئے۔ ورجنوں گولیاں اس کے جسم سے آر پار ہو رہی تھیں۔

اپنی وم توڑتی توانائیوں کو جمع کر کے اس نے بمشکل اپنی کمر سے لٹکتے چھوٹے سے تھیلے سے ہینڈ گرنیڈ نکالا اور اس کی پن اپنے دانتوں سے نکال کر گرتے گرتے سامنے کی طرف پھینک دیا۔

مرتا مرتا امریک سنگ سی آر پی کے دو اور جوانوں کو جہنم رسید کر گیا۔ وہ کمر کے بل زمین پر گرا تھا اور تلملاتے ہوئے زخم خوردہ کتوں کی طرح دشمن اس کے مردہ جسم پر گولیاں برسا رہا تھا۔

گاؤں کے گوردوارے سے بانی کا اچارن ہو رہا تھا۔ گیانی شمشیر سنگھ کی گرجدار آواز سارے گاؤں میں گونج رہی تھی۔

کبیرا جب ہم آئے جگت میں' جگ ہنسا ہم روئے
ایسی کرنی کر چلے---- ہم ہنسیں جگ روئے

میجر ٹنڈن بے بسی اور قہر کے ملے جلے انداز میں امریک سنگھ کی لاش کو گھور رہا تھا۔ اس نے نفرت سے امریک سنگھ کی لاش کو ٹھوکر ماری اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی سی آر پی کے لوگوں نے امریک سنگھ کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ وہ

لوگ امریک سنگھ کے گھر کی دیواروں پر دیوانہ وار گولیاں چلاتے اندر داخل ہو گئے اور چند منٹوں میں ہی انہوں نے امریک سنگھ کے ماں باپ کا حال بھی ان کے بیٹے جیسا کر دیا۔

اس گھر میں اب کوئی ذی نفس باقی نہیں بچا تھا----!

گھر کی تلاش لینے کے بہانے ان لوگوں نے گھر کی ہر قابل ذکر شے پر قبضہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے سہم کر گھروں کے دروازے بند کر لئے تھے۔ ایک گیانی شمشیر سنگھ تھا جو گوردوارے میں "ارداس" کروا رہا تھا۔ اس نے "سکھی مریادہ" کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ "ارداس" ختم کر کے وہ گوردوارے سے باہر آ گیا۔ گاؤں کے لوگ اب آہستہ آہستہ گوردوارے کے باہر جمع ہونے لگے تھے۔ انہوں نے گیانی شمشیر سنگھ کے ساتھ ہی اس سمت چلنا شروع کر دیا تھا جدھر امریک سنگھ کی لاش پڑی تھی۔

مرن منسا سوریاں حق ہے مرن ہووے پروان

اس نے لاش پر ایک نظر ڈال کر آہستہ سے گوربانی پڑھنی شروع کر دی---- پولیس کے جوانوں نے لاش کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ ساری رات وہ لوگ لاش کے گرد پہرا دیتے رہے۔

صبح ہونے پر جب اخبار نویس اور افسران بالا لاشوں کا معائنہ کر چکے تو لاشیں سرکاری ہسپتال میں پہنچا دی گئیں۔

ایک مرتبہ پھر گیانی شمشیر سنگھ لاشیں حاصل کرنے کے لئے ارباب اختیار کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔ تیسرے دن انہیں لاشیں مل گئیں اور انہوں نے لاشوں کا "انتم سنسکار" پولیس کے پہرے میں کر دیا۔

پنتھک کمیٹی کی طرف سے ملک اور بیرون ملک مختلف گوردواروں میں "شہیدی سماگم" منایا گیا اور دنیا بھر میں "اکھنڈ صاحب کا بھوگ" ڈالا گیا۔

○○○

نائیلہ آج بھی معمول کے مطابق اسلامک سینٹر سے قرآن پاک کا درس لے کر اپنے گھر لوٹی تھی۔ اگلے "ویک اینڈ" پر انہوں نے رشتہ ازدواج میں باقاعدہ منسلک ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

خورشید اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔

شام ڈھلنے لگی تھی جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے حسب معمول اپنا کوٹ کوریڈور میں رکھے ہینگر پر لٹکایا اور سٹنگ روم کی طرف چل دی۔

دروازہ کھول کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی' اس کی آنکھیں سامنے کا منظر دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

مسز بخشی کی لاش سامنے پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی پر خون کا سیاہ دھبہ موجود تھا اور سر سے بہنے والا خون کارپٹ پر جم چکا تھا----!

چیختی چلاتی نائیلہ نے فون اٹھا کر پولیس کا نمبر ملانا چاہا تو اسے احساس ہوا کہ فون میں تو جان ہی باقی نہیں رہی۔

"یہ کام نہیں آئے گا مس بخشی!"

اپنی پشت سے بلند ہونے والی آواز پر اس نے اچانک ہی گردن گھمائی اور سہم کر رہ گئی۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام اس کی طرف پستول تانے کھڑا تھا۔ پستول کے منہ پر سائیلنسر نصب تھا۔

"کون ہو تم' دفع ہو جاؤ----!" اس نے چلانا چاہا لیکن بمشکل ہی اس کے منہ سے نکل پایا۔

نائیلہ نے بھاگ کر کمرے سے باہر نکلنا چاہا تو حملہ آور نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی لیکن ہمت کر کے اٹھی اور حملہ آور کا منہ نوچنے کے ارادے سے آگے بڑھی۔ اس مرتبہ سیاہ فام نے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا اور وہ تیورا کر گر پڑی۔

اس نے اٹھ کر کھڑے ہونا چاہا لیکن---- اسے اٹھنے کی مہلت نہ مل سکی۔ حملہ آور کی پستول سے ہلکی سی کلک کی آواز بلند ہوئی۔ گولی اس کے سر میں اتر گئی تھی----! ایک کے بعد دوسری گولی بھی اس کے سر میں لگی----!!

اس کے ہونٹ کپکپائے۔

دم توڑتی نائیلہ بخشی نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور اپنی جان جان آفرین کو سونپ دی۔

"را" نے ایک اور معرکہ سر لیا تھا----!!

لندن ساؤتھ ہال کے ہیولاک روڈ گوردوارے میں "ارداس" ہو رہی تھی۔ گیانی املوک سنگھ کی گھمبیر آواز میں جیسے ایک زمانے کا درد رچ بس گیا تھا۔

"ہے! سچے نرنکار---- نمانیاں دے مان---- ناتھاں دی اوٹ۔ غریب نواز سچے داتا---- ہم بے کس ہیں' بے بس ہیں---- پر تیرے حکم کی پالنا کریں گے۔ ہم بارک تو

سرنائے---- پربھ ڈوری ہاتھ میں تیرے۔ ہے! واگھورو سے بادشاہ ہے! کلغی دار! کیپٹن ستنام سنگھ تیرا نمناں بندہ خالصہ راج کی پراپتی کے لئے۔ پنتھ کی چڑھدی کلا کے لئے میدان جنگ کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ کلغی دھار انگ سنگ سہائی ہو کر مدد کرنا.....!"

ارداس کے خاتمے پر فلک شگاف "جے کارے" بلند ہوئے اور سب نے مل کر ستنام سنگھ کو "ووھائی" دی۔ وہ اپنے دوست کیپٹن امریک سنگھ کا مشن مکمل کرنے جا رہا تھا۔

اب اس کا نمبر آ گیا تھا----!

ایک مرتبہ پھر پنجاب کے کارزار میں جتھیدار گورسیوک سنگھ کی کمان میں حریت پسند نئی صف بندیوں میں مصروف تھے۔ سات سمندر پار سے ایک مرتبہ پھر بھارتی فوج کا سابقہ کیپٹن ستنام سنگھ بھارتی فوج سے لوہا لینے بھیس بدل کر پنجاب کے میدان کارزار کا رخ کر رہا تھا۔

ooo

چند روز بعد----

سری نگر کے ہوائی اڈے پر انڈین ایئر لائن کے بوئنگ جہاز نے لینڈ کیا اور دہلی سے آنے والے مسافر ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ ان میں خورشید بھی تھا۔

اس مرتبہ اس نے کسی اور نام اور روپ کے ساتھ سفر کیا تھا۔ سری نگر کی فضاؤں میں سانس لیتے ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ایک روز اسی ایئر پورٹ سے وہ نائیلہ کی معیت میں باہر نکلا تھا----!

لیکن آج بھی وہ اکیلا نہیں تھا۔

نائیلہ کی دعائیں' یادیں اور اپنے مقصد سے سچی لگن اس کے ساتھ تھی۔ اس کے ہمراہ تھے وہ ہزاروں جانباز' جو نامساعدہ حالات میں نہتے اور کمزور ہونے کے باوجود دنیا کی جابر ترین حکومت کے خلاف ڈٹ گئے تھے۔ ان کے ساتھ تھیں ان لاکھوں ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی دعائیں جن کی آنکھیں پاکستانی سرحدوں کی طرف دیکھتے دیکھتے پتھرانے لگی تھیں----!

ان کے دعا کو پھیلے ہوئے ہاتھ خورشید کو اپنے چاروں طرف سایہ فگن دکھائی دے رہے تھے۔

اے ارض مقدس!

خدائے وحدہ لا شریک کی قسم!

جب تک ہماری رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے ہم تیری آزادی کے لئے تیری

مانگ کے سیندور کو اپنے خون سے سجاتے رہیں گے۔

خداوندا! ہماری مدد کر۔ جس طرح تو نے میدان بدر میں اپنے بندوں کی مدد کی تھی۔

الہ العالمین! ہماری خطاؤں' لغزشوں کو درگزر فرما دے۔

مولا کریم! غلامی کی اس طویل رات کا سویرا کر دے۔

یا اللہ! ہمیں آزادی کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔ ذلت کی اس زندگی کی بجائے عزت کی موت کو ہمارا نصیبا بنا دے۔

اس کے دل سے دعا نکل رہی تھی----!

"بٹ مالو" کی طرف سفر کرتے ہوئے سڑک کے دو رویہ لگے درختوں کی سرسراہٹ میں دعائیہ الفاظ اپنا سفر کرتے وادی میں دور تک پھیلتے چلے جا رہے تھے۔

آزادی کی شاہراہ پر موت کا کفن سروں سے باندھے کشمیر کے بیٹے اور بیٹیاں اپنے پہاڑوں جیسے مضبوط عزائم کے ساتھ سینہ سپر تھیں۔

آزادی یا موت!

یہی تھا ان کا نعرہ!

یہی تھا ان کا عزم!

سری نگر کی وادیاں شہید بچوں کی ماؤں کے گیت الاپ رہی تھیں۔

یہ مائیں اپنا ایک گھبرو شہید کروا کر دوسرے کے جلدی جوان ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

کشمیر کی ہر ماں نے وادی کی مانگ کو اپنے لخت جگر کے خون سے سنوارنے کا عہد کر لیا تھا۔

وہ اپنے جگر گوشوں کو بنا سنوار کر اس دعا کے ساتھ میدان جہاد کی طرف روانہ کر رہی تھیں کہ:

جب وہ لوٹیں تو ان کے ہمراہ آزادی ہو یا ایک پروقار موت!

ooo

بٹ مالو کے ایک روایتی مکان کے سامنے وہ ٹیکسی سے اترا تو بوڑھا چاچا کشمیری بانہیں پھیلائے اس کا منتظر تھا----!

"سفر بخیر گزرا بیٹا----؟" بوڑھے کشمیری کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر نظر پڑتے

ہی امید کی نئی جوت جل اٹھی تھی!"

"چاچا مہمان خیریت سے پہنچ گئے؟"

اسے اپنے بجائے کسی اور کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

"ہاں! ہاں! آؤ وہ کل شام سے تمہارا منتظر ہے۔"

خورشید نے اپنا اٹیچی کیس سنبھالا اور بوڑھے کشمیری کے تعاقب میں مکان کی دہلیز پھلانگ گیا۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا' وہاں پہلے سے موجود کیپٹن ستنام سنگھ نے بیقرار ہو کر اسے گلے لگا لیا۔

"ویر جی----!" ستنام کے منہ سے بمشکل نکل پایا۔

"بھاؤ جی! خیال رکھنا اس مرتبہ میں بازی نہیں لے جانے دوں گا۔ دیکھ لینا اس مرتبہ....."

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' ستنام سنگھ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خورشید! میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں امریک سنگھ سے تم بہت محبت کرتے تھے---- یہ مظلومیت اور حریت کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے---- ہم سات سمندر پار سے یہاں جینے نہیں آئے' ہم نے تو اس زمین کو عرصہ پہلے تیاگ دیا تھا۔

لیکن----!

ہم بھاگے نہیں تھے----!

ہم بھاگنے والے نہیں----!

ہمارا واسطہ جنوبی ایشیا کے جس سامراج سے ہے وہ اتنی جلدی ہمیں آزادی نہیں دے گا۔ اس براہمنی عفریت نے ہماری رگوں سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑا ہے---- چالیس سال سے ہم پر غلامی کی لعنت مسلط تھی۔

لیکن آج یہاں---- اس وادی لہو رنگ میں آ کر مجھے احساس ہوا کہ اب براہمن سامراج کو اپنی بساط لپیٹنی ہو گی۔

کیونکہ:

اب بھارت میں رہنے والی ہر اقلیت نے آزادی یا موت کا نعرہ بلند کر دیا ہے----!

اب ہم آزاد ہو کر ہی دم لیں گے۔

آزادی کے اس جہاد میں امریک سنگھ کی' میری یا تمہاری جان چلی جائے' اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی۔"

خاموش ہو کر اس نے خورشید کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔

بٹ مالو کے باہر دخترانِ کشمیر کا جلوس گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

"ہم سب مانگیں آزادی!"

کمرے میں موجود مجاہدوں پر سکوت طاری تھا جب اچانک ہی بوڑھے چاچا کشمیری کی پرسوز آواز بلند ہوئی۔

میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن

۱۴ اگست ۹۰ء

۸۴- راوی روڈ لاہور۔